چاچا گام

طنز و مزاح کے شاہکار

عزیز ذوالفقار

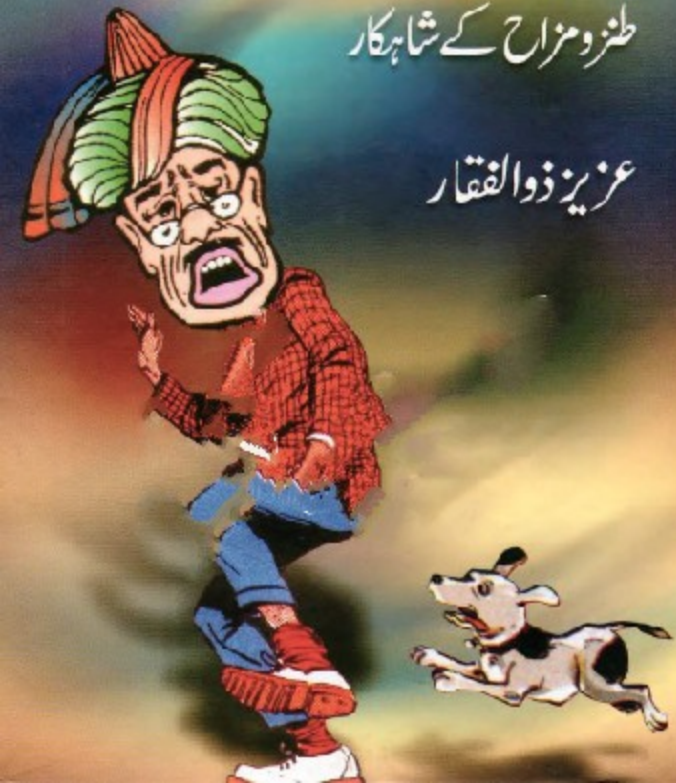

چاچا گام

(طنز و مزاح)

عزیز ذوالفقار

نگارشات پبلشرز

حبیب مارکیٹ، 38-مین اردو بازار لاہور | 24- مزنگ روڈ، لاہور

فون 7240903 | موبائل 042-5014066 | فون 7322892 فیکس 042-7354205

e-mail:nigarshat@yahoo.com

www.nigarshatpublishers.com

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: چاچا گام
مصنف: عزیز ذوالفقار
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز
24- مزنگ روڈ' لاہور
PH:0092-42-7322892 FAX:7354205
فرسٹ فلور' حبیب ایجوکیشنل سنٹر' 38۔ مین اردو بازار لاہور
PH:0092-42-5014066 FAX:7354205
مطبع: المطبعۃ العربیہ' لاہور
سال اشاعت: 2007ء
قیمت =/200 روپے

انتساب

ان زندہ دلوں کے نام

جو

مغموم ہوں تو بھی مسکراتے ہیں

فہرست

	تعارف	7
1	شرط	9
2	سڑک کی رانی	26
3	پی۔ کے (P.K)	35
4	گھر آیا مہمان	51
5	جوہری: پتھروں کا سوداگر	59
6	چاچا گام	82
7	شیری جیمز	95
8	سفید ہاتھی	115
9	میرا یار بنا دولہا	124
10	ادا وحی الدین شو	132
11	ٹام اینڈ منا	149
12	اور ریل چلتی رہی	162
13	ماری رانگ نمبر	173
14	۰۵ نمی بائی نائٹ	185
15	خلیفہ جی	193

16- نو نقد نہ تیرہ ادھار 201
17- انٹرویو ایک بھکاری کا 210
18- جھیل سیف الملوک 219
19- پاپی پیٹ کی خاطر 247
20- لنگوٹیا 259
21- الو باٹا 280

تعارف

طنز و مزاح ادب کی ایسی صنف ہے جو بظاہر آسان لگتی ہے جیسے ہر کوئی طبع آزمائی کر سکتا ہو---- یہ وہم ہے- طنز و مزاح کی دشواریاں اتنی شدید اور تقاضے اتنے صبر آزما ہیں جو کسی اور صنف کے نہیں- ادب کی کسی بھی صنف کو لے لیں' مشاہدے کے بغیر کچھ بھی نہیں لکھا جا سکتا- جہاں تک افسانے کا تعلق ہے' لکھنے والے مشاہدے کے بغیر بھی گزارہ کر لیتے ہیں- اس پس منظر میں بھی افسانہ لکھ ڈالتے ہیں جو لکھنے والے نے کبھی دیکھا نہ سنا ہو' لیکن طنز و مزاح کی بنیاد مشاہدہ ہے اور باریک بینی- یہ نہیں تو مزاح نویسی بھی نہیں- اگر ہے تو وہ مسخرہ پن اور گپ بازی ہے-

علم کے سمندر میں غوطہ لگا کر چند موتی نکال لانا بھی مشکل نہیں- کتابیں سہارا دیتی اور ڈوبنے سے بچا لیتی ہیں- طنز و مزاح کے موتی نکالنے کے لئے اپنے معاشرے کے کالے پانی میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے جو انسانی تصور سے زیادہ گہرا اور انسانی فطرت سے زیادہ پر فریب اور پر خطر ہے' اور اس میں تعفن اتنا ہے کہ اہل علم و ادب اس سے ذرا دور ہی رہتے ہیں- اس کے لئے ہمت و استقلال کی' بنی نوع انسان کی محبت کی اور ادب سے گہرے لگاؤ کی ضرورت ہے-

محترم عزیز ذوالفقار نے طبع آزمائی کے لئے معاشرے کے کالے پانی کو منتخب کیا ہے اور وہ موتی نکال لائے ہیں جن سے جھیل سیف الملوک کا موتیوں جیسا شفاف پانی بھی محروم ہے- ان میں سے چند ایک موتی آپ کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں-

ان مضامین میں آپ کو یہ خوبی نظر آئے گی کہ کسی بھی کہانی کا کوئی بھی کردار گھڑا یا تراشا نہیں گیا نہ گھسیٹ کر لایا گیا ہے- ہر کردار خود آیا ہے اور وہ اپنی کہانی خود سنا رہا ہے- وہ جس ماحول کا پروردہ ہے وہ خود آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے- آپ جس کردار کو بھی دیکھیں گے بے ساختہ کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو ہمارے محلے کا فلاں شخص ہے' میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں---- کیا آپ کے محلے میں کوئی چاچا گامن نہیں؟---- دوسرے محلے میں ہو

گا- ہو گا ضرور!

اور بعض کردار ایسے بھی سامنے لائے گئے ہیں جو آپ کے محلے دار نہیں' پڑوسی بھی نہیں' وہ آپ خود ہیں- لیکن محترم عزیز ذوالفقار نے آپ پر طنز نہیں کی' آپ کو بدنام نہیں کیا' آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی- آپ جب اپنا عکس دیکھیں گے تو آپ نے بے ساختہ قہقہہ نہ لگایا تو آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور آ جائے گی-

اگر آپ کے گھر بدقسمتی سے ٹیلیفون لگا ہوا ہے تو "ساری' رانگ نمبر" آپ ہی کے گھر کی کہانی ہے---- "سڑک کی رانی" پر آپ نے سو بار سفر کیا ہو گا اور آپ کا یار دولہا تو ضرور بنا ہو گا- آپ کے گھر مہمان تو آتے ہی رہتے ہیں- اگر آپ "میرا یار بنا دولہا" والے یار کے' "گھر آیا مہمان" والے مہمان کے اور "نو نقد نہ تیرہ ادھار" والے ادھار خور دوست کے وجود کے منکر ہیں یا ان سے ناآشنا ہیں تو آپ پاکستانی نہیں آپ کسی ایسے خطہ ارض میں رہتے ہیں جہاں صرف برف پڑتی ہے-

آج کے دور میں جب جسم علیل' ذہن پریشان اور روح پژمردہ ہو گئی ہے' اور معاشرت' معیشت اور سیاست پر افسردگی طاری ہے' انسان مسکراہٹوں سے محروم ہو گئے ہیں- اس محرومی نے حالات کی تلخیوں میں اضافہ کر دیا ہے- محترم عزیز ذوالفقار نے ان مضامین میں آپ کو مسکراہٹیں لوٹا دی ہیں- یہی طنز و مزاح کی افادیت اور اہمیت ہے---- روتوں کو ہنسا دینا!

ہم ہر مضمون کا الگ الگ تجزیہ پیش کر کے آپ کے اور محترم عزیز ذوالفقار کے درمیان آنے سے گریز کریں گے- قاری بہترین منصف ہوتا ہے-

عنایت اللہ

مدیر "حکایت-" لاہور

شرط

پولیس لائنز گوجرانوالہ کا حوالدار جمال دین بڑا بدنام اور رسوا پولیس مین خیال کیا جاتا تھا وہ اپنے ساتھیوں اور ہم پیشہ ملازمین میں بڑی حقارت سے دیکھا جاتا تھا- پولیس لائن کا ہر باسی' افسر ہو یا ماتحت اس سے دکھی تھا- اور اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا- اس کے ساتھی ملازمین اور افسران اسے آتے دیکھ کر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے- کیونکہ ہر شخص جمال دین حوالدار سے عاجز آ چکا تھا- اور ہمہ وقت انہیں یہ خدشہ اور خوف دامن گیر ہوتا کہ وہ ان سے کہیں انجانے میں کوئی شرط نہ لگا لے- جمال دین حوالدار ہر ملنے جلنے اور ساتھی ملازموں سے شرطیں لگانے کا ماہر تھا- وہ ہنستے مسکراتے خیر خیریت معلوم کرتے وقت کوئی نہ کوئی ایسی اچنبھے اور حیرانگی کی بات کر جاتا- جس سے سامعین حضرات کو اختلاف ہوتا- پھر ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران حریف کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ جمال دین حوالدار سے شرط لگا چکا ہے- پھر یہ بات یقینی ہوئی کہ جیت ہمیشہ جمال دین کی ہی ہوتی تھی- اور مخالف اپنی گرانقدر رقم یا پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھتا- جمال دین اس فن میں بڑا ماہر اور طاق مانا جاتا تھا-

اب لوگ جمال دین حوالدار سے ملنے سے اکثر کتراتے تھے اور جو لوگ ملتے بھی تھے- وہ بھی اس سے بات چیت کرتے ہوئے بڑا محتاط رویہ اختیار کرتے تھے- افسران کے پاس ڈاک دینے یا کسی اور مقصد کے لئے اگر وہ جاتا- تو وہاں بھی بڑی اطاعت گزاری اور فرمانبرداری کے مظاہرہ کے دوران وہ کوئی نہ کوئی بڑی انوکھی اور بعید از قیاس بات کہہ دیتا- جس پر افسران اس سے اتفاق نہ کرتے- تو جمال دین معمولی بحث و تکرار کے درمیان جب اپنے مئوقف' رائے یا ہٹ پر قائم رہتا- تو نتیجتاً" ان کے مابین شرط لگ جاتی- اور وہ افسر ہار جاتا- مگر جمال دین حوالدار کے روبرو وہ شرمسار ہوتا مگر پیٹھ پیچھے اسے برا بھلا کہنا ان کا معمول بن چکا تھا- انہی حرکتوں کے طفیل جمال دین حوالدار کے وہ سبھی دشمن بن چکے تھے- مگر جمال دین حوالدار کو ان تمام پولیس کے اہل کاروں اور افسران کی مخالفت اور دشمنی کا

قطعاً" کوئی افسوس نہ تھا- وہ اپنے آپ کو ہمیشہ حق بجانب اور بے گناہ خیال کرتا تھا- جمال دین شرط لگاتے وقت کسی کو ہرگز مجبور نہ کرتا تھا-

جمال دین حوالدار کا تعلق راول خاندان سے تھا- ظاہر ہے کہ اس کے خاندان کا آبائی پیشہ "علم نجوم" یعنی جوتش تھا- وہ لوگوں کے اندرونی اور پوشیدہ رازوں سے باخبر ہونے کی وجہ سے اکثر اپنے ساتھی اہل کاروں اور پولیس کے افسران سے اپنے علم اور دانش کے باعث ان کی راز دارانہ باتوں کا انکشاف کرتا رہتا تھا- جسے وہ لوگ جھٹلانے اور چھپانے کی کوشش میں انکاری ہو جاتے تھے- مگر جب جمال دین اپنی بتائی ہوئی پیش گوئی کی صداقت اور حقیقت پر مصر ہوتا- تو پھر لامحالہ انہیں شرط لگانی پڑ جاتی- لہٰذا وہ اپنی ضد اور ناجائز ہٹ پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے شرط ہار جاتے- اور وہ اپنی خفت اور شرمندگی چھپانے کی غرض سے جمال دین حوالدار کو اپنا مجرم اور قصور وار گردانتے-

ہیڈ کانسٹیبل غلام فرید سے ایک سرسری ملاقات کے دوران جمال دین حوالدار نے اسے بتایا کہ اس کی قمیض کی سامنے والی جیب میں سینما کے دو ٹکٹ پڑے ہیں- جس پر غلام فرید نے جواب دیا کہ وہ سینما دیکھتا ہی نہیں- تو ٹکٹ کہاں سے آئیں گے- مگر جمال دین حوالدار کو اپنے انکشاف پر اتنا یقین تھا کہ اس نے کہہ دیا کہ اگر سینما کے ٹکٹ اس کی جیب سے برآمد ہوئے تو؟ اس نے کہا کہ غلام فرید- اگر سینما کی ٹکٹیں نہ نکلیں- تو؟

جمال دین حوالدار : اگر دو ٹکٹیں برآمد نہ ہوئیں- تو جو کچھ میری جیبوں میں ہے- وہ تم لے لینا-

غلام فرید : اگر ٹکٹیں نکل آئیں تو جو کچھ میرے پاس ہے- دے دوں گا-

چنانچہ تلاشی لینے پر غلام فرید کی جیب سے دو سینما کی ٹکٹیں موصول ہو گئیں- جس پر غلام فرید کے پاس پچاس روپے ستر پیسے نکلے- وہ جمال دین حوالدار لے گیا-

غلام فرید سخت حیرت میں اپنے کوارٹر میں گیا- اور اس نے اپنی بیوی سے یہ واقعہ بیان کیا- تو اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ سینما کی دو ٹکٹیں اس کی جیب میں اس نے رکھی تھیں- کیونکہ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ ان کا لڑکا چوری چھپے فلمیں دیکھنے لگا ہے- مگر وہ غلام فرید کو بتانا بھول گئی تھی- یہ سن کر وہ ماتھا پکڑ کر بیٹھ گیا- اور حیرت سے پوچھنے لگا کہ وہ تو ٹھیک ہے- لیکن جمال دین حوالدار کو کیسے پتہ چلا کہ تم نے وہ ٹکٹیں میری جیب میں رکھی تھیں- بیوی نے جواب دیا- مجھے کیا معلوم-

اس طرح فقیر محمد ملک اے ایس آئی سے جمال دین حوالدار کی مڈ بھیڑ ہو گئی- اے ایس آئی نے جمال دین سے طنزاً" پوچھا-

فقیر محمد اے ایس آئی- کیا حال ہے تمہاری ٹھگ بازی کا- شرطیں لگا کر اور کتنے لوگوں کو لوٹا ہے؟

جمال دین : ملک جی- آپ مذاق کرتے ہیں- میں تو علم نجوم جانتا ہوں- اور حساب لگا کر ہی کوئی بات کرتا ہوں- آپ اگر نہ مانیں تو میں کیا کر سکتا ہوں-

فقیر محمد ملک : تم نے میرے متعلق کوئی پیشن گوئی نہیں کی- کیا میرے ساتھ شرط نہیں لگاؤ گے؟

جمال دین : ملک جی- آپ مجھے غلط سمجھتے ہیں- میں شرطیں نہیں لگاتا- میں تو اپنے علم پر ہی بھروسہ اور یقین رکھتا ہوں- اب میں اگر آپ کے بارے میں کوئی اہم پیشن گوئی کروں- تو آپ اس وقت میرا مذاق اڑائیں گے- لیکن جب میری بات صحیح ثابت ہوئی تو آپ کو شاید تکلیف ہو- اس لئے میں خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے-

فقیر محمد ملک : کیا تم میرے متعلق کوئی اہم انکشاف کرنا چاہتے ہو-

جمال دین : ہاں ایک ایسی بات جس کا یقین کرنا تو درکنار آپ میری تضحیک کرنے سے بھی باز نہ آئیں گے-

فقیر محمد ملک : کوئی بات نہیں- تم بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو- میں نہ تو برا مانوں گا- اور نہ ہی تمہارا مذاق اڑاؤں گا-

جمال دین : لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں- اگر وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی تو؟

فقیر محمد ملک : اور اگر غلط ثابت ہوئی تو؟

جمال دین : تو میں دو سو روپیہ جرمانہ آپ کو دوں گا-

فقیر محمد ملک : تو ٹھیک ہے- اگر تمہاری پیشن گوئی درست نکلی تو میں دو سو روپیہ تمہیں دوں گا- اب بتاؤ- کیا ہے تمہاری انوکھی بات-

جمال دین : کل تم اس عہدے پر نہیں رہو گے- تم ایک فوجداری مقدمے میں ملوث پائے جاؤ گے- اور تمہیں معطل کر دیا جائے گا- پھر دو ماہ بعد تم اس الزام سے بری ہو کر دوبارہ ڈیوٹی پر آ جاؤ گے-

فقیر محمد ملک : یہ کیسے ہو سکتا ہے- میں نے کوئی ایسا ویسا کام ہی نہیں کیا تو معطل کیوں

ہوں گا۔

چنانچہ اگلے روز ہی ایس ایس پی نے اسے معطلی کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ کیونکہ ہائی کورٹ نے فقیر محمد ملک کو ایک فوجداری مقدمے میں ملوث پاتے ہوئے Suspend کرنے کا حکم بھیجا تھا۔ اس طرح جمال دین حوالدار کی پیش گوئی کے مطابق دو ماہ بعد اس کو گہری چھان بین کے بعد اس الزام سے بری کر دیا گیا۔ اور فقیر محمد ملک نے بحال ہونے کے بعد اپنے وعدے کے مطابق شرط کی رقم دو سو روپے جمال دین کو ادا کر دی۔

سپاہی کرم الٰہی ابھی ابھی اپنی تنخواہ لے کر آیا تھا کہ اس کی ملاقات جمال دین سے ہو گئی۔ جمال دین نے اسے بتایا کہ اس کی جیب میں تنخواہ کے علاوہ ایک ہزار روپے کا چیک پڑا دکھائی دے رہا ہے۔ سپاہی کرم الٰہی نے اس کی تردید کر دی اور کہا کہ اس کے پاس چیک کہاں سے آئے گا۔

جمال دین اگر تمہاری جیب سے چیک نکل آیا تو پھر؟

سپاہی کرم الٰہی : اور اگر چیک نہ ملا تو؟

جمال دین : تو میری جیبوں میں جو کچھ ہے۔ وہ تمہارا ہے۔

سپاہی کرم الٰہی : ٹھیک ہے۔ اگر چیک میری جیب سے برآمد ہوا۔ تو میری ساری تنخواہ تم لے لینا۔

چنانچہ تلاشی لینے پر مذکورہ چیک نہ مل سکا۔ اور جمال دین شرط ہار گیا' اس طرح جمال دین کا کل اثاثہ مبلغ ساڑھے انیس روپے سپاہی کرم الٰہی کو مل گئے۔ جمال دین حوالدار کا ہارنا اس کے لئے ناگوار خاطر تھا۔ یا پھر یہ اس کی کوئی چال تھی۔ بہرحال اس کا خاصا چرچا رہا اور ساری پولیس لائن میں یہ خبر پھیل گئی کہ جمال دین کے جوتشی اور علم نجوم کی حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ اور اس کے مخالفین کو یہ ایک ایسا موقع ہاتھ آ گیا۔ جس کو وہ جمال دین حوالدار کے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ دوسری جانب جمال دین کھسیانہ ہو کر اپنے خلاف ہونے والا یہ پروپیگنڈہ ہوتے دیکھتا رہا۔ اور خاموش تماشائی کی طرح برداشت بھی کرتا رہا۔ اس مخالفانہ پروپیگنڈہ کا کم از کم یہ فائدہ اسے ضرور ہوا کہ اب پولیس لائن کے باسی اس سے خوف کھانا چھوڑ گئے تھے۔

پھر ایک دن محرر ہیڈ کانسٹیبل منشی خاں سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس نے جمال دین سے طنزاً" دریافت کیا۔

منشی خاں : سناؤ بھائی جمال دین۔ کیا حال ہے تمہاری جوتشی اور علم نجوم کا۔ کیا اب بھی شرطیں لگاتے ہو۔ یا لوگوں کو بیوقوف بنانا چھوڑ گئے ہو؟

جمال دین : کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ میں لوگوں کو الو بناتا ہوں۔ جانتا وانتا کچھ نہیں۔

منشی خاں : معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاں اگر تم کچھ جانتے ہو۔ تو بتاؤ کہ میری جیبوں میں کتنے پیسے ہیں۔

جمال دین : تمہاری قمیض کی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تمہاری شلوار کے نیفے میں کتنی رقم تم نے چھپا رکھی ہے۔

منشی خاں : یہ سن کر قدرے پریشان ہو گیا۔ اور جمال دین کے چہرے کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگا۔

جمال دین : صرف یہی نہیں۔ تمہاری چارپائی پر پڑے ہوئے سرہانے کے غلاف اور تمہارے کمرے کی پرچھتی پر پڑی ہوئی گاگر کے اندر پڑے ہوئے روپوں کا بھی بتا سکتا ہوں۔ بولو کیا بتاؤں۔

منشی خاں : تم تو میرے بھی باپ ہو۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا اندازہ غلط لگایا تھا۔

جمال دین : تمہارے سرہانے پڑے ہوئے تکیے کے نیچے والے خط کا مضمون بھی بتا سکتا ہوں۔ سننا پسند کرو گے۔

منشی خاں : ہاتھ جوڑ کر راز افشا ہونے سے قبل ہی اپنی شکست قبول کر لیتا ہے اور دس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر جمال دین کو دینا چاہتا ہے۔ لیکن جمال دین اتنا کچھ بتانے کا معاوضہ پچاس روپے سے کم لینے پر کسی صورت راضی نہیں ہوتا۔ آخرکار وہ جمال دین کے پاؤں پڑ جاتا ہے۔ اور تیس روپے دے کر اپنی جان چھڑا لیتا ہے۔

ایک دن جمال دین کو سب انسپکٹر قدرت اللہ نے اپنے دفتر میں بلا کر سرزنش کے انداز میں کہا کہ اسے پتہ چلا ہے کہ وہ پولیس لائن میں جگہ جگہ مختلف بہانے بنا کر اپنے ساتھیوں سے شرطیں لگا کر انہیں لوٹ رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے بہت ساری شکایات ملیں ہیں۔ اور اگر جمال دین حوالدار ایسی نازیبا حرکات سے باز نہ آیا تو وہ اس کا بڑا برا حشر کر دے گا۔

جمال دین : سر جی۔ آپ جیسے جہاندیدہ اور سمجھدار افسر سے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ آپ اس ناچیز کی وضاحت کے بغیر اپنا کوئی فیصلہ سنا دیں گے۔ اس نے بتایا کہ وہ علم نجوم پر

مکمل عبور اور دسترس رکھتا ہے۔ اس لئے جب وہ اپنے علم کے بل بوتے پر کوئی انکشاف کسی کے بارے میں کرتا ہے۔ تو وہ لوگ اپنی خفت یا راز داری کے افشا کے ڈر سے اس کے ساتھ تکرار کے بعد شرط لگا لیتے ہیں۔ اب چونکہ میں سچا ہوتا ہوں۔ اور میری پیش گوئی درست اور ٹھیک ہوتی ہے۔ اس لئے وہ شرط ہار جاتے ہیں۔

سب انسپکٹر قدرت اللہ : یہ سب بکواس ہے۔ میں اسے نہیں مانتا۔ غائب کا علم کوئی نہیں جانتا۔ تم کہاں کے پہنچے ہوئے بزرگ اور ولی اللہ ہو۔ جو ایسی راز دارانہ باتیں جانتے ہو۔

جمال دین : میں نہ تو کوئی بزرگ یا ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ ہی غائب کا علم جانتا ہوں۔ مگر میں اپنے جوتش کے علم پر آپ کے بارے میں بھی کچھ ایسی باتیں جانتا ہوں۔ جس کے متعلق اگر آپ کو بتاؤں۔ تو شاید پہلے آپ بھی اس سے انکاری ہو جائیں۔ مگر بعد میں آپ اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

قدرت اللہ : کیا بکتے ہو۔ تم میرے متعلق کیا جانتے ہو؟

جمال دین : بتا دوں۔ یہ حقیقت سن کر شاید آپ کو بڑی تکلیف ہو۔ لیکن میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر یہ سچ ہوا۔ تو آپ طیش میں آنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ تو آپ کو میری صداقت اور علم پر یقین ہو جائے گا۔

قدرت اللہ : تم کونسا میرا راز افشا کرنا چاہتے ہو۔ اور میری کس کمزوری سے واقف ہو۔

جمال دین حوالدار : کیا میں بتا دوں کہ آپ کی بیوی نے آج صبح آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

قدرت اللہ نے اپنے کان کھڑے کر لئے اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور غصے سے پوچھنے لگا۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟

جمال دین حوالدار : اگر میں وہ بات بھی بتا دوں کہ جس کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ تو آپ کیا کہیں گے۔

قدرت اللہ : تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ مگر میں تمہیں اس قابل ہی نہ چھوڑوں گا کہ تم ایسا کر سکو۔

جمال دین حوالدار : دیکھیں سر جی۔ اگر میں ان گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب یا ڈرنے والا ہوتا تو شاید اس جگہ ملازمت نہ کرتا۔ آپ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ میں سچ ڈنکے کی

چوٹ پر بولنے والا شخص ہوں۔ اگر میں یہی انکشاف باہر آپ کے ماتحت عملہ کے روبرو کر دوں۔ تو آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

قدرت اللہ : آہستہ بولو۔ بتاؤ تم کیا کچھ جانتے ہو۔

جمال دین حوالدار : اب آپ کے ناجائز اور ناروا رویہ کی وجہ سے ایک سو روپیہ فیس لوں گا۔ اگر منظور ہو تو ہاں کہہ دو۔ ورنہ خدا حافظ۔

قدرت اللہ : ٹھیک ہے بھائی۔ یہ لو سو روپیہ اب بتاؤ۔

جمال دین حوالدار : سو روپے کا نوٹ تھام کر اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ اور پھر بڑے یقین اور وثوق سے اسے بتاتا ہے۔ جو کچھ یوں تھا۔

"آپ کی بیوی نے آپ کو گھر کی ملازمہ کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور پھر سزا کے طور پر آپ کو گھر کے صحن میں مرغا بنا کر پانی کا گھڑا آپ کی کمر پر رکھ دیا تھا۔ اور خود ڈنڈا لے کر آپ کے پاس کھڑی ہو کر آپ کو گالیوں سے نوازتی رہی۔ ملازمہ کو ملازمت سے جواب دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ آپ گڑگڑا کر معافیاں مانگتے رہے۔ اس طرح پورے دس منٹ کے بعد تمہیں اس درگت سے نجات ملی تھی۔"

قدرت اللہ : دیکھو۔ جمال دین۔ گھر میں ایسی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ تمہاری مہربانی کہ یہ بات صیغہ راز ہی میں رہے تو بہتر ہو گا۔ میں نے اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی بات کی ہو۔ تو معاف کر دینا۔ مجھے دراصل عملے کے لوگوں نے تمہارے خلاف بھڑکایا تھا۔

ڈی ایس پی صدر راجہ جہانگیر خاں کا سالہ دبئی میں رہتا تھا وہ چند روز کے لئے گوجرانوالہ آیا۔ تو اسے کسی نے بتایا کہ پولیس لائنز گوجرانوالہ میں ایک ماہر جوتشی حوالدار جمال دین رہتا ہے۔ اسے اپنا ہاتھ دکھانے کا شوق پیدا ہوا۔ تو اس نے اپنے بہنوئی راجہ جہانگیر خاں D.S.P صدر سے حوالدار جمال دین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جمال دین حوالدار اب پولیس لائنز کی مشہور و معروف ہستی مانا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ شرطیں ہار کر اس سے نقصان اٹھا چکنے کی وجہ سے مخالف تھے اور بے شمار لوگ ایسے بھی تھے۔ جو اسے مرد مجاہد' دلیر اور نڈر سپاہی خیال کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ افسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ اور کئی افسر تو ایسے تھے۔ جن کی کمزوریوں ریشہ دوانیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا مکمل کچا چٹھا جمال دین کے پاس تھا۔ اس لئے وہ اسے سرعام دھتکارنے اور نظرانداز کرنے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔

اس لئے جب راجہ جہانگیر خاں کے سالے رب نواز نے جمال دین حوالدار سے ملنے کا ارادہ کیا۔ تو اس وقت وہ سوچنے لگا کہ اس سے اپنے سالے رب نواز کی ملاقات کروائے یا نہیں۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ جمال دین حوالدار اسے کسی معاملے میں الجھا کر اور کوئی چکر چلا کر اس سے شرط لگا لے گا۔ اور رب نواز بیچارہ سحر زدہ پنچھی کی طرح خود ہی دام صیاد میں پہنچ جائے گا۔ بہرحال راجہ جہانگیر خاں نے جمال دین حوالدار کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔ اور رب نواز کو تاکید کرنے لگا کہ جمال دین حوالدار سے بڑے محتاط انداز میں گفتگو کرنا۔ اور اگر وہ کسی بات پر شرط لگانا چاہے۔ تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دینا مگر شرط ہرگز نہ لگانا۔ تھوڑی دیر بعد جمال دین حوالدار وہاں پہنچ گیا۔ اور اندر دفتر میں پہنچ کر باادب سلیوٹ ماری۔ تو راجہ جہانگیر خاں نے اس سے رب نواز کا تعارف کروایا۔ اور اسے بتایا کہ یہ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جمال دین حوالدار اسے ساتھ لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے کمرے میں بیٹھ کر رب نواز جمال دین حوالدار سے کہنے لگا کہ میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اور مجھے تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

جمال دین حوالدار کہنے لگا کہ خاں صاحب۔ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں کہ آپ اس ناچیز کو ملنے کے لئے تشریف لائے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کو خبردار کیا گیا ہے کہ میرے ساتھ گفتگو کرتے وقت بڑا محتاط رویہ اختیار کرنا۔ اور یہ کہ میں آپ کو کسی نہ کسی چکر میں پھنسا کر شرط لگا لوں گا۔ لہٰذا آپ شرط ہرگز نہ لگائیں اور اگر کوئی جوتش کی بات کروں تو اس پر کبھی یقین نہ کرنا۔ لیکن محترم میں ایسا کچھ نہ کروں گا۔ لیکن اگر آپ اپنی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ جاننا چاہیں گے۔ تو پھر ہو سکتا ہے۔ پہلے آپ کو میری باتوں کا یقین ہی نہ آئے۔ اور پھر میرے تفصیل بتانے پر آپ کو احساس ہو کہ یہ راز کی باتیں اسے کیسے معلوم ہو گئیں۔ ایک بات یقینی ہے کہ میں علم نجوم سے اچھی طرح آگاہی رکھتا ہوں۔ اور جو کچھ بتاؤں گا۔ وہ صیغہ راز میں رکھنے کا پابند ہوں۔

رب نواز: تو آپ میرے بارے میں کیا کچھ جانتے ہیں؟

جمال دین حوالدار: آپ کو سچ سچ بتانا ہو گا کہ میری افشا کی گئی باتیں کہاں تک درست ہیں۔

رب نواز: اگر وہ انکشافات درست ہوئے۔ تو میں تسلیم کر لوں گا۔ لیکن اگر غلط ہوئے تو؟

جمال دین حوالدار: اس کے لئے میں ہر قسم کا ہرجانہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔

رب نواز: مجھے پہلے یہ تو پتہ چلے کہ آپ میرے متعلق کیا جانتے ہیں۔

جمال دین: آپ کی جیب میں آپ کی بیوی کا بھیجا ہوا خط ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اس کے بارے ہی میں کوئی راز دارانہ انکشاف کروں گا۔ مثلاً یہ کہ آپ کی بیوی نرس ہے۔ اور آجکل فیصل آباد جیل کے ہسپتال میں ڈیوٹی دے رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جیل میں کیسے پہنچی تھی۔ اب آپ بتائیں کہ کیا یہ درست ہے۔

یہ سن کر رب نواز کو پسینہ آ گیا۔ اور سخت گھبراہٹ میں رومال سے وہ اپنے ماتھے اور چہرے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

اس دوران جمال دین کہنے لگا کہ اگر یہ غلط ہے۔ تو پھر میں معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ ایک سو روپے بطور ہرجانہ بھی ادا کروں گا۔

رب نواز: یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ اگر جیل جانے کا سبب بتا دیں۔ تو میرے پاس اس وقت نوے روپے جیب میں ہیں۔ ان میں سے میں اسی روپے آپ کو دے دوں گا۔

جمال دین حوالدار: آپ کی بیوی نے ایک عورت کا غیر قانونی طور پر آبارشن کر دیا تھا۔ جس جرم کی پاداش میں اسے ایک سال تک کی قید سخت بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ اب وہ یہ سزا فیصل آباد جیل میں کاٹ رہی ہے۔ آپ نے سفارش کروا کر اسے جیل کے ہسپتال میں ڈیوٹی لگوا دی ہے۔ اس وقت اس کا ارسال کردہ خط آپ کی جیب میں موجود ہے۔ کیا یہ میرا انکشاف درست ہے یا نہیں۔

رب نواز: یہ آپ کا انکشاف سو فیصد صحیح ہے۔ میں آپ کے علم جوتش کی تعریف کرتا ہوں۔ اور یہ لیں اسی روپے آپ کی فیس یا پھر شرط ہارنے کا جرمانہ۔

جمال دین حوالدار: آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں آپ سے یہ رقم وصول نہیں کروں گا۔ یہ میرے اصول اور دستور کے منافی ہے۔ یہ واپس لے لیں۔ اور مجھے ایک سند اپنے بہنوئی راجہ جہانگیر خاں ڈی ایس پی سے جاری کروا دیں کہ میرا علم نجوم کس حد تک پختہ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔

رب نواز: آپ کا بھی بہت شکریہ۔

رب نواز جب جمال دین حوالدار سے مل کر واپس راجہ جہانگیر خاں کے پاس آیا۔ تو بڑا خوش و مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے بہنوئی کے سامنے رب نواز کو ایک عظیم

نجومی اور ایک ماہر جوتشی قرار دیتے ہوئے اس کے فن اور کردار کی بڑی تعریف کی- یہ باتیں راجہ جہانگیر خاں کے لئے بڑی حیرت انگیز اور تعجب خیز تھیں- جب رب نواز نے بتایا کہ اس کی بتائی ہوئی ہر بات سو فیصد درست تھی' اور نیز یہ کہ اس نے کوئی شرط بھی اس کے ساتھ نہیں لگائی- بلکہ انعام میں دی جانے والی رقم بھی یہ کہہ کر واپس کر دی کہ وہ مہمانوں سے کوئی اجرت یا رقم وصول نہیں کرتا- تو راجہ جہانگیر خاں انگشت بدنداں رہ گیا- اور کہنے لگا کہ بڑی حیرانگی کی بات ہے کہ جمال دین حوالدار نے اپنے بارے میں کی جانے والی تمام قیاس آرائیوں کو یکسر مسترد کر دیا ہے- پھر جب رب نواز نے اسے میرٹ سند دینے کو کہا- تو راجہ جہانگیر خاں ڈی- ایس- پی نے وقت ضائع کئے بغیر وہ میرٹ سند اپنی طرف سے جاری کر دی- جمال دین حوالدار کی یہ اخلاقی فتح تھی- اب وہ ڈی ایس پی راجہ جہانگیر خاں کی جاری کردہ میرٹ سند اپنے مخالفین کے معاندانہ رویہ اور پروپیگنڈہ کے خلاف پیش کر سکتا تھا-

گوجرانوالہ میں ان دنوں اسکندر زمان کھوسہ ایس ایس پی متعین تھے- وہ زبردست ایڈمنسٹریٹر' سخت گیر افسر اور نظم و ضبط کے پابند ایس ایس پی تھے- وہ بڑے دیانتدار' جہاندیدہ اور فرض شناس پولیس افسر تھے- ماتحت عملہ ان کے سامنے پیش ہونے سے گھبراتا تھا- جب وہ دفتر میں بیٹھے ہوتے تو انسپکٹر کے اسٹیٹس کے افسران کی بھی کیا مجال کہ وہ ان کے سامنے سے گزر جائے- ان کا رعب اور دبدبہ اس قدر تھا کہ ساری پولیس فورس ان کی غیر موجودگی میں بھی بڑی مستعد اور چاک و چوبند دکھائی دیتی تھی- آج ان کے دفتر کے باہر جمال دین حوالدار کے مخالفین اور شرطیں ہارنے والے جمع ہوئے تھے تاکہ ایس ایس پی کو جمال دین کی کارستانیوں' نو سر بازیوں' اور کارگزاریوں سے آگاہ کریں- ان کا مطالبہ جمال دین حوالدار کو اس کی قبیح اور نازیبا حرکتوں کی نہ صرف سرزنش مطلوب تھی- بلکہ وہ اس کا اس جگہ سے تبادلہ بھی کروانا چاہتے تھے- دوسری طرف وہ ڈرتے بھی تھے کہ ایس ایس پی الٹا انہیں مورد الزام نہ ٹھہرائیں- اور کہیں کہ تم لوگوں نے شرطیں کیوں لگائی تھیں- اگر اکیلے دکیلے کا معاملہ ہوتا تو شاید وہ جرات بھی نہ کرتے- مگر وہاں تو ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا- انہیں اب اتنا حوصلہ ضرور تھا کہ اجتماعی طور پر کوئی پریشانی یا تکلیف کا اظہار کر کے وہ کسی نادیدہ یا انجانی بازگشت یا گرفت سے بچ جائیں گے' بہرحال ایک بات یقینی تھی کہ اب وہ جمال دین حوالدار سے ہر صورت چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے- اس وقت ایس ایس پی کے

دفتر کے باہر کھڑے ہوئے ملاقات کے منتظر لوگوں میں دو انسپکٹر' تین سب انسپکٹر' پانچ A.S.I اور تقریباً بیس کے قریب ماتحت عملے کے ملازمین شامل تھے- بقول شاعر-

"کوئی دیوانہ ہوتا ہے کوئی فرزانہ ہوتا ہے
بیان ہر اک سے تیرے ظلم کا افسانہ ہوتا ہے"

پندرہ منٹ کے بعد ایس ایس پی اسکندر زمان کھوسہ نے ان لوگوں کو دفتر کے اندر بلایا- اتنے ہجوم کو دیکھ کر پہلے تو وہ حیرانگی سے ٹھٹھکے- پھر ان سے آنے کا سبب دریافت کیا- تو اس وفد کی طرف سے انسپکٹر غلام حیدر مرزا نے مختصراً" عرض کیا-

غلام حیدر مرزا : حضور بندہ نواز ہماری گوجرانوالہ پولیس لائنز میں ایک شخص جس کا نام جمال دین حوالدار ہے- اس کے بارے میں یہ لوگ شکایات کا پلندا لے کر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہیں-

ان تمام حاضرین کو یہ شکایت ہے کہ جمال دین حوالدار مذکور جو اپنے آپ کو جوتشی اور علم نجوم کا ماہر بیان کرتا ہے- ان سادہ لوح اور غریب ملازمین کو الٹی سیدھی پیش گوئیاں کر کے انہیں اس طرح اپنے دام فریب میں الجھا اور پھنسا کر شرطیں لگوا لیتا ہے کہ وہ بیچارے اس کے مکارانہ اور عیارانہ چکروں میں آ کر شرطیں ہار جاتے ہیں- اور جمال دین حوالدار اپنی انہی نو سرباز چالوں اور نفرت آمیز سرگرمیوں سے ان کی جیبوں سے رقمیں نکلوا کر اپنے جیبیں بھرتا رہتا ہے- اور یہ سلسلہ پچھلے چھ ماہ سے جاری ہے- اب یہ لوگ سخت عاجز آ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں- اور ملتجی ہیں کہ حوالدار جمال دین کو اس جگہ سے تبدیل کر کے ان لوگوں کو اس کے ان گھناؤنے لوٹ مار کرنے والے ہتھکنڈوں سے نجات دلائی جائے-

ایس ایس پی : لیکن آپ لوگ اس سے شرطیں لگاتے کیوں ہیں-

انسپکٹر ادریس : عالیجاہ- وہ باتیں بنانے اور پیش گوئیاں کرنے میں بڑا ماہر ہے- وہ ایسی حیران کن اور ناقابل یقین مفروضوں میں الجھا کر مقابل فریق کو شرط لگانے پر مجبور کر دیتا ہے- اور سامنے والا شخص نہ نہ کرتے ہوئے بھی شرط لگا لیتا ہے- اور پھر ہار اس کا مقدر بن جاتی ہے-

انسپکٹر اللہ یار : سر وہ ایسی عجیب و غریب اور اندرون خانہ کے پوشیدہ رازوں کو بے

نقاب کرتا ہے۔ جو صرف میاں بیوی ہی جانتے ہیں۔ جس پر ہم لوگ شرم اور ندامت سے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایس ایس پی : کیا وہ باتیں درست ہوتی ہیں؟

انسپکٹر اللہ یار : جی ہاں۔ اس کے انکشافات بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایسے پوشیدہ اور گم گشتہ رازوں سے آگہی کیسے حاصل کر لیتا ہے۔

ایس ایس پی : اگر تم لوگ یہ مانتے ہو کہ اس کی باتیں درست ہوتی ہیں تو پھر تم تسلیم کرنے کی بجائے شرطیں کیوں لگا لیتے ہو۔

انسپکٹر اللہ یار : سر وہ اس طرح گھما پھرا کر ایسے انوکھے انداز سے بات کرتا ہے کہ احساس بھی نہیں ہوتا اور شرط لگ جاتی ہے۔

انسپکٹر قدرت اللہ : یہ سچ ہے سر۔ مجھ سے بھی ایسی ہی اندرون خانہ سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے سو روپے جیت کر لے گیا تھا۔

ایس ایس پی : لعنت ہے تمہارے افسر ہونے پر۔ تمہارے اس ادنیٰ ماتحت کی یہ جرات کہ وہ اپنے افسروں سے بھی اتنی بے تکلفی سے شرطیں لگا لیتا ہے۔ اور تم لوگ بزدلوں اور بے غیرتوں کی طرح اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر لٹ جاتے ہو۔ تمہیں شرم آنا چاہئے۔

ہیڈ کانسٹیبل نور حسین : حضور میری تو وہ پورے مہینے کی تنخواہ ہی لے اڑا تھا۔ اس نے مجھے ایسا چکمہ دیا اور بیوقوف بنایا کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا اور وہ میری جیب سے ساری رقم نکال کر لے گیا۔

سپاہی غلام محمد : (ہاتھ جوڑ کر) عالیجاہ میں نے نئے جوتے خرید کر اسی دن پہنے تھے کہ وہ بد بخت وہاں آ گیا پہلے میرے جوتے اتروا کر خود پہنے اور جوتوں کی بڑی تعریف کی' پھر مجھے چکر دے کر شرط لگا لی اور شرط میں نئے جوتے جیت کر نو دو گیارہ ہو گیا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

اے ایس آئی برکت اللہ۔ سر میری بیوی نے اپنے کان کی ایک سونے کی بالی سنار سے ٹانکہ لگوانے کے لئے مجھے دی تھی۔ وہ میری جیب میں تھی۔ اتنے میں مجھے جمال دین حوالدار مل گیا اس کے ہاتھ میں تاش کا ایک پیکٹ تھا اس نے تاش کی گٹھی پیکٹ سے نکال کر مجھے پکڑا دی اور کہنے لگا کہ اسے اچھی طرح سے پھینٹو۔ جب میں نے تاش ٹھیک طرح سے پھینٹ دی تو اس نے مجھے ایک پتہ نکال کر اور اس کا نمبر نوٹ کر کے اپنے پاس

رکھنے کو کہا۔ پھر بقایا تاش واپس لے کر مجھے کہنے لگا کہ اگر وہ مجھے یہ بتا دے کہ میرے ہاتھ میں کونسا پتہ ہے تو اسے کیا دو گے؟ میں نے کہا کہ اگر نہ بتا سکو یا غلط بتاؤ تو اس نے جواب دیا جو کچھ اس کی جیب میں ہے تمہارا ہو گا۔ جس کے جواب میں میں نے کہا کہ جو کچھ میری جیب میں ہے تمہارا ہے۔ اتفاق کی بات کہ مجھے اس نے اپنی باتوں میں ایسا الجھایا کہ مجھے یہ یاد ہی نہ رہا کہ میری جیب میں بیوی کے کان کی سونے کی بالی پڑی ہے۔ اس نے تاش کے پتے کا نمبر صحیح بتا دیا۔ اور میری جیب سے سونے کی بالی اس نے اڑا لی۔ میں نے اس کی بڑی منتیں اور خوشامدیں کیں کہ یہ بیوی نے مرمت کے لئے آج صبح ہی دی تھی اور مرمت کروا کر میں نے اسے واپس کرنا ہے۔ مگر وہ "مال مفت دل بے رحم" والی بات تھی۔

ایس ایس پی : اسکندر زمان کھوسہ یہ ساری باتیں سن کر کہنے لگے کہ میں جمال دین حوالدار کو بلا کر آپ سب لوگوں کی شرطوں میں جیتی ہوئی رقوم واپس دلا دیتا ہوں۔ مگر آپ کو میرے ساتھ ایک پکا وعدہ کرنا ہو گا کہ آپ آئندہ جمال دین حوالدار یا کسی اور سے کبھی زندگی میں شرط نہیں لگاؤ گے۔ اس پر وہ سب کورس میں بولے۔

"ہماری توبہ سرکار عالی۔ آج کے بعد ہم کبھی کسی سے شرط نہیں لگائیں گے۔"

پھر ایس ایس پی اسکندر زمان نے ٹیلیفون پر اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت کہ وہ پولیس لائن سے حوالدار جمال دین کو بلا کر میرے روبرو پیش کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ لنچ کے لئے گھر جا رہے ہیں۔ اور دو بجے تک واپس آ جائیں گے۔ اس وقت انسپکٹرز اللہ یار اور قدرت اللہ نے مودبانہ گزارش کی کہ حضور آپ جمال دین حوالدار سے کہیں کوئی شرط نہ لگا لینا کیونکہ وہ ایسی باتیں کرتا ہے جس سے حزب مخالف کو شرط لگانی پڑ جاتی ہے۔

ایس ایس پی : کیا تم لوگوں نے مجھے اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے۔ اگر اس نے میرے ساتھ شرط ورط لگانے کی کوشش کی۔ تو میں اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔

یہ الفاظ کہہ کر ایس ایس پی اٹھ کر لنچ کرنے گھر چلے گئے۔ اور باقی لوگوں کو 2 بجے دفتر سے باہر رہنے کی تاکید کر گئے۔

اسکندر زمان کھوسہ دو بجے جب اپنے دفتر آئے۔ تو حوالدار جمال دین بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اور شکایت کنندگان بھی موجود تھے۔ ایس ایس پی کے آنے سے قبل وہ لوگ جمال دین حوالدار کو ڈرا دھمکا رہے تھے مگر وہ بڑی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا اسے مطلق فکر نہ تھی کہ ان لوگوں کی اجتماعی شکایت پر ایس ایس پی اس کے خلاف کیا ایکشن لیں گے۔ چند منٹوں کے

بعد ایس ایس پی نے حوالدار جمال دین کو اندر بلا لیا۔ اس نے اندر جا کر مودبانہ سلیوٹ کیا۔ تو اسکندر زمان کھوسہ انتہائی غصے اور طیش میں کہنے لگے۔

اسکندر زمان کھوسہ : یہ شرط لگانے والا چکر چلا کر تم کب سے ان معصوم اور سادہ لوح ساتھیوں کو لوٹ رہے تھے۔

جمال دین : عالی جاہ۔ میں نے نہ تو کوئی چکر چلا رکھا ہے۔ اور نہ ہی کسی کو فریب دے کر لوٹنے کی کوشش کی ہے۔

ایس ایس پی : کیا یہ لوگ جھوٹ بکتے ہیں۔ جو تمہارے خلاف بڑی منظم شکایت لے کر آئے ہیں۔

جمال دین : سرکار عالی۔ میرا تعلق راول قوم سے ہے۔ جس کا پیشہ جوتش یعنی علم نجوم ہے۔ میرا دادا بھی نجومی تھا اور باپ بھی۔ مجھے یہ علم خاندانی ورثہ میں ملا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا ساتھی مجھ سے ملتا ہے۔ تو میں اپنے اس علم کی روشنی میں اس کی بیشتر باتوں' واقعات اور بیتی ہوئی زندگی کے حالات کا انکشاف کرتا ہوں تو وہ لوگ میری ان باتوں یا پیش گوئیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بجائے میرے ساتھ الجھنے لگتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے علم پر چونکہ پورا یقین اور بھروسہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں اپنی بات یا انکشاف پر ڈٹا رہتا ہوں۔ جس پر وہ لوگ مجھے جھوٹا یا غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے شرط لگا لیتے ہیں۔ اور ہار جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے حضور انور کہ میں علم نجوم اور جوتش کے ذریعہ جو بات یا انکشاف حاصل کرتا ہوں۔ اس کے بتانے یا افشا کرنے کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتا۔ اس بارے میں کبھی کوئی شخص شکایت یا گلہ نہیں کر سکتا۔ آپ یقین کریں سرکار عالی یہ لوگ مجھے اور میری پیش گوئیوں کو جھوٹا اور لغو سمجھ کر پہلے انکار کرتے ہیں' پھر لالچ میں آ کر مجھ سے شرط لگا لیتے ہیں۔ آپ اگر غور فرمائیں۔ تو میں کبھی نہیں ہارتا۔ کیونکہ میں کبھی غلط بات نہیں کہتا۔

ایس ایس پی : میں تمہارے کسی بہانے یا ٹسوے سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ تم زبردست فریبی اور مکار شخص ہو۔ تم لوگوں کو الو بنانے اور چکر چلا کر لوٹنے کے ماہر لگتے ہو۔ میں تمہارا دماغ ٹھیک کر کے ہی دم لوں گا۔ اور تمہیں ساری لوٹی ہوئی رقوم واپس کرنی ہوں گی۔ ورنہ جیل تمہارا مقدر ہے۔ جہاں تم ساری شیخیاں بھول جاؤ گے۔

جمال دین : حضور عالی۔ آپ جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کروں گا۔ لیکن سرکار مجھے

اجازت دیں۔ تو ایک عرض کروں۔

ایس ایس پی : کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

جمال دین : حضور والا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں گزارش کروں گا کہ میرا علم کہتا ہے کہ آپ کے دائیں کندھے پر موٹے تل کے پاس ایک زخم کا نشان ہے۔

ایس ایس پی : تم بکواس کرتے ہو۔ میرے کندھے پر نہ تو کسی تل کا نشان ہے اور نہ ہی زخم کا۔

جمال دین : اگر نشان ہوا۔ تو پھر۔

ایس ایس پی : میں کوئی شرط نہیں لگاؤں گا۔ کیا مجھے بھی بیوقوف بنانے کا ارادہ ہے۔

جمال دین : آپ بھی مجھے غلط سمجھے سرکار۔ میری یہ جرات کہاں کہ میں آپ سے شرط لگانا چاہوں۔ میں تو اپنے علم کے بل بوتے پر یہ انکشاف کر رہا تھا۔

ایس ایس پی : مگر یہ سراسر جھوٹ اور غلط ہے۔ جب وہاں کوئی نشان ہی نہیں تو پیش کوئی کیسی۔

جمال دین : کیا میں آپ کا کندھا دیکھ کر تسلی کر سکتا ہوں کہ نشان وہاں ہے یا نہیں۔

ایس ایس پی : دیکھو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں شرطوں پر جیتی ہوئی تمام رقم لوٹانی ہو گی۔ اور جس جس کو تم نے ورغلایا یا ٹھگا ہے۔ اس کی امانت اسے واپس کرنی ہو گی۔ یہ میرا حکم ہے۔

جمال دین : حضور آپ کا حکم سر آنکھوں پر یہ رقم آج ہی واپس کر دی جائے گی۔

ایس ایس پی : اب تک کتنی رقم یا اشیاء کی مالیت بتاؤ۔ جو تم نے ان غریبوں اور سادہ لوح ساتھیوں سے لے چکے ہو۔

جمال۔ یہی کوئی پچیس سو روپیہ ہو گی۔

جمال دین : عالی مقام۔ کیا میں اپنی ذاتی تسلی کے لئے آپ کا کندھا دیکھ سکتا ہوں۔

ایس ایس پی : بیشک۔ چنانچہ ایس ایس پی اسکندر زمان اپنی وردی کی قمیض اور بنیان اتار کر اپنا کندھا دکھاتے ہیں۔ تو وہاں تل یا زخم کا کوئی نشان نہیں ملتا اور جمال دین حوالدار اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ اس وقت ایس ایس پی کی بلند آواز سنائی دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم نے آج کے بعد کسی شخص یا ساتھی سے شرط لگائی۔ تو میں تمہیں جیل بھیج دوں گا۔

جمال دین : نہیں حضور اب ایسا نہیں ہو گا۔ اچھا اب اجازت ہے۔

پھر گھنٹی بجا کر شکایت کنندگان کو اندر بلا کر انہیں یہ خوشخبری سنا دی کہ۔

ایس ایس پی : لو بھئی میں نے جمال دین حوالدار کے تمام کس بل نکال دیئے ہیں اور اس کا دماغ پوری طرح درست کر دیا ہے۔ اب وہ آپ کے جیتے ہوئے روپے بھی واپس کر دے گا۔ اور زندگی میں پھر کبھی شرط نہیں لگائے گا۔ وہ بڑا مکار اور عیار شخص ہے۔ مجھ سے بھی شرط لگانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اسے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں کسی حالت میں شرط نہیں لگاؤں گا۔

انسپکٹر غلام حیدر مرزا : کیا حضور انور کے بارے میں اس نے کوئی پیش گوئی کی تھی۔

اسکندر زمان کھوسہ : ہاں مجھے کہتا تھا کہ آپ کے دائیں کندھے پر تل کے پاس ایک زخم کا نشان ہے۔ میں نے کہا کہ تم بکواس کرتے ہو۔ ایسا کوئی نشان میرے کندھے پر نہیں ہے۔ وہ اس دعویٰ پر مصر تھا اور کہنے لگا کہ اگر یہ نشان ہوا۔ تو میں نے ترت جواب دیا کہ میں شرط نہیں لگاؤں گا۔ اس پر وہ کہنے لگا۔ حضور میری کیا مجال کہ میں شرط کے متعلق بات بھی کروں۔ میں تو صرف یقین کرنا چاہتا ہوں کہ میری بتائی ہوئی بات کہاں تک درست ہے۔ اس کے لئے مجھے وردی اتار کر اپنا کندھا دکھا دیں۔ چنانچہ اس نے میرا کندھا دیکھا۔ تو وہاں کوئی نشان نہ تھا۔ اس لئے اس کا دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ اور اس کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔

انسپکٹر قدرت اللہ : کیا آپ نے وردی اتار کر کندھا دکھایا تھا۔

ایس ایس پی : ہاں۔

یہ سن کر ان شکایت کنندگان کو چکر آ گئے۔ اس وقت انسپکٹر اللہ یار نے انکشاف کیا کہ یہ سارے لوگ مارے گئے۔ کیونکہ جمال دین دفتر کے باہر انہیں یہ کہہ کر آیا تھا کہ ایس ایس پی کو وہ کیا سمجھتا ہے۔ اگر اس نے ان کی وردی نہ اتروا دی تو اس کا نام جمال دین نہیں۔ اس پر یہ شرط لگی تھی کہ اگر اس نے آپ کی وردی اتروا لی۔ تو یہ لوگ اس کو جیتی ہوئی رقم سے دوگنا روپے ادا کریں گے۔

ایس ایس پی : لعنت ہو تم لوگوں پر۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی تم نے اس سے شرط لگا لی۔

انسپکٹر غلام حیدر مرزا : سر آپ جیسے سخت گیر اور رعب و دبدبہ والے افسر سے یہ ہرگز

توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ آپ کی وردی دفتر میں اتار کر دکھا دے گا۔ اس یقین کے ساتھ ہم سب نے جمال دین حوالدار سے شرط لگا لی تھی۔ اور ہم لوگ اب لٹ گئے اور برباد ہو گئے۔

ایس ایس پی : دفع ہو جاؤ تم سب لوگ۔ خبردار آج کے بعد مجھے اپنے منحوس شکلیں نہ دکھانا۔

○

سڑک کی رانی

وہ "سڑک کی رانی" کے نام ہی سے مشہور تھی۔ میں نے اگرچہ اس کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اکثر دوستوں کی زبانی اس کی دلکش آواز' دلنواز اور متوالی چال اور پرکیف حسن و جمال کے قصیدے سن چکا تھا۔ میرا عزیز دوست مجید گنجا جو لاہور کے محلہ بلال گنج سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ گوجرانوالہ میں اپنے نام پر محلہ مجید گنج آباد کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ "سڑک کی رانی" کا عاشق صادق تھا۔ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا اس کا معمول تھا۔ مجید گنجے کی وارفتگی نے مجھے "سڑک کی رانی" کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار کر رکھا تھا۔ کئی مرتبہ اس نیت سے سڑکوں پر مارا مارا پھرا مگر میری بدنصیبی کہ مجھے شرف باریابی نصیب نہ ہوا۔

ایک دن قسمت نے اچانک یاوری کی اور نہ صرف میری دیرینہ حسرت دید پوری ہو گئی بلکہ مجھے "سڑک کی رانی" کی رفاقت میں مسلسل چھ گھنٹے گزارنے کا موقع مل گیا۔ یہ محض اتفاق تھا مگر بڑا ہی عجیب اتفاق۔۔۔۔ غالباً جون کا مہینہ تھا۔ میں اپنی دوکان پر بیٹھا تھا کہ سرگودہا سے ایک تار موصول ہوا۔ تار بھیجنے والا میری والدہ کی پھوپھی زاد بہن کا داماد تھا۔ اس نے اپنے ستر سالہ والد کی ناگہانی موت کی اطلاع دی تھی۔ میں تار ساتھ لے کر گھر والدہ کے پاس چلا گیا اور انہیں یہ منحوس خبر سنائی۔ والدہ فالج کے شدید حملے کے باعث چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ چونکہ رشتہ داری کا معاملہ ہے' اس لئے تم سرگودہا روانہ ہو جاؤ۔ جنازے میں تمہاری شمولیت ضروری ہے۔ تم وہاں نہ گئے تو تمہاری خالہ ناراض ہوں گی۔

تنگ اور خستہ حالت سڑک اور پھر سخت گرم موسم کے پیش نظر میں بس کا اتنا طویل سفر کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ مگر والدہ محترمہ کا حکم ٹالنا بھی میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ بہ امر مجبوری میں مختصر سا سامان لے کر چل پڑا۔ جب میں بس سٹینڈ پر پہنچا تو کلینر آوازیں دے رہا تھا۔ "چلو حافظ آباد' پنڈی بھٹیاں' چنیوٹ' سرگودہا۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔ سڑک

کی رانی تیار کھڑی ہے۔" یہ سنہری الفاظ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو واقعی "سڑک کی رانی" اپنی جملہ رعنائیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ اپنے عشاق کی پذیرائی کے لئے محو انتظار تھی۔ جی ہاں اسی "سڑک کی رانی" کو دیکھنے کے لئے میں بے تاب تھا۔ اس کو ایک بھرپور نظر دیکھنے کے ساتھ ہی میرا اشتیاق ختم ہو گیا' اور میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر مجید گنجا کہیں قریب ہوتا تو میں اسے اس بے ہودہ مذاق کی ایسی سزا دیتا کہ وہ تمام عمر یاد رکھتا۔

وہ ایک پرانے ماڈل کی بیڈ فورڈ تھی۔ اسے پہلی نظر دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بوڑھی میم نے اپنے چہرے کی جھریوں کو چھپانے کے لئے بڑے بھونڈے طریقے سے پاؤڈر اور غازہ کی تہیں جما رکھی ہوں اور ہونٹوں پر انتہائی شوخ رنگ کی لپ سٹک لگا کر اپنی گم شدہ جوانی کی یاد تازہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہو۔ وہ بلا شبہ کسی اناڑی رنگساز کی بدذوقی کا لاجواب شاہکار تھی۔ اس کی ایک آنکھ پر کپڑے کی بندھی ہوئی پٹی نے اس کی خوبصورتی کو گہنا دیا تھا۔ مجھے مجبوراً اس پر سفر کرنا پڑا۔ کیونکہ دوسری کوئی بس اس وقت سرگودہا کے لئے تیار نہ تھی۔

میں ٹکٹ لے کر بس میں داخل ہوا اور خاموشی سے ڈرائیور کے عقب والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے علاوہ صرف سات سواریاں اور بیٹھی تھیں۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلے میری نظر سامنے والے شیشے پر گئی۔ وہاں دائیں طرف لکھا ہوا شعر پڑھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

دلا غافل نہ ہو یک دم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے
باغیچے چھوڑ کر خالی زمین اندر سمانا ہے

بائیں طرف جس شعر پر نظر پڑی وہ اس سے زیادہ پریشان کن تھا۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

"سڑک کی رانی" کے اندر دونوں اطراف یہ عبارات دکھائی دیں۔
"نادان مت بھول۔ تیری زندگی کا یہ آخری سفر ہی نہ ہو۔"
"کوئی بھلائی کا کام کر لے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

پچھلی نشست پر یہ درج تھا۔ "موت اٹل ہے۔ کوئی نہیں جانتا کب آ جائے۔"

اس کے اوپر جلی حروف میں یہ درج تھا۔ "اپنا سر' ہاتھ اور پاؤں کھڑکی سے باہر نہ نکالیں۔ حادثہ کی صورت میں کمپنی نقصان کی ذمہ دار نہ ہو گی۔"

شدید گرمی اور اس قسم کی خوفناک اور زندگی سے مایوس کر دینے والی تحریریں پڑھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ قریباً نو بجے میں "سڑک کی رانی" کو چھوڑ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا ڈرائیور داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی انجن سٹارٹ کیا اور بس چلا دی۔ وہ آہستہ آہستہ بس چلاتا رہا اور جگہ جگہ کھڑے ہو ہو کر سواریاں بٹھا رہا تھا۔ شہر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پون گھنٹہ لگا دیا اور قریباً پچاس مرتبہ بس روکی۔ بہرحال بس سواریوں سے بھر گئی۔ آخری سواری جو بس میں داخل ہوئی وہ ایک دراز ریش مولوی صاحب تھے۔ انہیں اور کہیں جگہ نہ ملی تو وہ ڈرائیور کی نشست کے ساتھ اوزاروں کے بکس پر براجمان ہو گئے اور جیب سے تسبیح نکال کر اس کا ورد کرنے لگے۔ شہر کی حدود گزرنے کے بعد مونچھوں والے ڈرائیور نے بس کی رفتار تیز کر دی اور ساتھ ہی مسعود رانا اور آئرن پروین کا یہ مشہور ریکارڈ بلند آواز میں لگا دیا۔

نے موتے دیر نہ لاویں۔

ہن وی نہ آیوں فیر کیہڑے ویلے آویں گی۔

(اے موت تم دیر نہ لگانا' اب بھی نہ آئی تو پھر کب آؤ گی)

بس چونکہ خاصی پرانی تھی۔ اس کے تمام کل پرزے ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ انجن' باڈی اور سیٹوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز بے ہنگم شور پیدا کر رہی تھی اور اندر بیٹھے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خوفناک زلزلہ تباہی مچا رہا ہو۔ تمام سواریاں خوف سے سہمی ہوئی تھیں۔ مجھے بھی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ادھر موت کو بلانے والا فلمی گانا جلتی پر تیل ڈال رہا تھا۔ بڑا ہی دلدوز منظر تھا۔

مونچھوں والے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے مولوی صاحب گاڑی کی رفتار کے مطابق تسبیح کے دانے گنتے جا رہے تھے۔ ڈرائیور نے مولوی صاحب کی عبادت کا رنگ دیکھا تو کلینر کو آواز دی۔۔۔۔ "شیدے!"

کلینر آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا اور پوچھا۔۔۔۔ "کی حکم اے استاد جی۔"

"اینہا مولبی ہوراں نوں پچھے اپنے کول لے جا۔ اینھے بڑے اوکھے نیں۔"

مولوی صاحب ندامت کے مارے اٹھ کر پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ ڈرائیور ایک ہاتھ سے سٹیرنگ تھامے گاڑی چلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مسلسل اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ ہم لوگ ڈر رہے تھے۔ ایک تو سڑک بڑی تنگ اور خستہ حالت میں تھی۔ دوسرے ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے گاڑی بار بار سڑک سے نیچے اتارنا پڑتی تھی۔ جس سے بس بے قابو ہو جاتی تھی مگر ڈرائیور کو سواریوں کی زندگی سے زیادہ اپنی مونچھوں کا خیال تھا۔ دو مرتبہ بس ذرا مشکل سے قابو میں آئی' مگر کیا مجال کہ ڈرائیور نے اپنا ہاتھ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی مونچھوں سے ہٹایا ہو۔

میں نے جب مونچھوں سے ڈرائیور کی رغبت اور لگاؤ کا یہ والہانہ انداز دیکھا تو اپنی بے لوث خدمات پیش کر دیں۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔۔۔۔ "آپ بیشک دونوں ہاتھوں سے سٹیرنگ تھام کر گاڑی چلائیں۔ میں آپ کی مونچھوں کو بل دیتا جاتا ہوں۔" میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو ڈرائیور نے غصے سے جھٹک دیا۔ اور شیدے کو بلا کر مجھے بھی مولوی صاحب کے پاس آخری سیٹ پر بٹھانے کا حکم صادر کر دیا۔ ناچار اگلی سیٹ سے اٹھ کر میں جب پیچھے جانے لگا تو تین چار سواریوں سے جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ گزرنے کا راستہ سواریوں کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے چلتی گاڑی میں پاؤں رکھتے وقت خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے پہلا قدم رکھنا چاہا تو ایک سواری نے میری ٹانگ پکڑ لی اور "میرے چوزے۔ میرے چوزے" کا شور مچا دیا۔ میں نے ٹانگ آگے بڑھائی تو ایک دیہاتی عورت نے چلانا شروع کر دیا۔ "میری ہانڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

میں نے بڑی مشکل سے ٹانگ آگے بڑھا کر پاؤں رکھا تو ایک سواری نے میری کمر پر مکہ جڑ دیا اور الزام لگایا کہ میں نے اس کے جھاڑو توڑ دیئے ہیں۔ میں نے اپنا پچھلا قدم آگے بڑھانا چاہا تو ہانڈیوں والی عورت کے کندھے سے ٹکرا گیا۔ اس عورت نے طوفان اٹھا دیا اور گالیاں بکنے لگی۔ میں مصلحتاً خاموش رہا۔ اتنے میں ڈرائیور نے کسی تانگے' ریڑھے یا بیل گاڑی سے آگے نکلنے کی کوشش میں گاڑی سڑک سے نیچے اتاری تو ایک زور کا دھچکا لگا اور میں قلا بازی کھا کر گرا۔ میرا سر ایک نوجوان عورت کی گود میں تھا۔ میری دائیں ٹانگ ایک معمر دیہاتی کی پگڑی اتار چکی تھی اور بائیں ٹانگ ایک گھی کے برتن میں جا پڑی تھی۔ کلینر اور دیگر سواریوں نے مل کر مجھے اٹھایا۔ اتنے میں مجھے "اندھا' مشٹنڈا' بے شرم" اور اسی قسم کے کئی القابات سے نوازا جا چکا تھا۔ اس طرح میں بڑی مشکل سے مولوی صاحب کے پہلو

میں جا کر بیٹھا۔

پچھلی سیٹ پر مجھے ایک بہت موٹے آدمی اور مولوی صاحب کے درمیان بٹھایا گیا۔ موٹے آدمی سے مجھے ہاتھی جیسی بساند آ رہی تھی۔ وہ لیمپ کے سگریٹ پی رہا تھا اور کش لگانے کے بعد سارا دھواں میرے منہ پر پھینک دیتا تھا۔ میں نے اسے شریفانہ طور پر سمجھایا کہ دھواں دوسری جانب پھینکے۔ وہ بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ "کہیں اور جا بیٹھو۔" میں تو پہلے ہی بیشتر سواریوں کا عتاب دیکھ چکا تھا۔ اس لئے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ مجھے بعد میں مولوی صاحب سے پتہ چلا کہ اس ہاتھی نما انسان سے وہ بھی عاجز آئے ہوئے تھے اور میری آمد ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی تھی۔

میری سیٹ جس پر میں آ کر بیٹھا تھا' بار بار اچھلتی تھی اور میرا سارا جسم کود کود کر درد کرنے لگا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ سفر تو مجھے کرنا ہی تھا۔ بس کی حالت زار اور تیز رفتاری کی وجہ سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اتنے میں "سڑک کی رانی" قلعہ دیدار سنگھ پہنچی۔ دو سواریاں اتریں۔ ایک بوڑھی عورت جو بس میں بیٹھی تھی۔ کلینر سے کہنے لگی۔ "بچہ! یہ حافظ آباد اے۔" کلینر نے جواب دیا۔ "نئیں ماں اے قلعہ اے۔"

بوڑھی سواری نے کلینر سے کہا۔ "پتر جدوں حافظ آباد آئے مینوں دس دینا"۔۔۔۔ کلینر نے وعدہ کر لیا اور بڑھیا مطمئن ہو گئی۔ بس چلنے لگی تو سولہ مسافر اور سوار ہو گئے۔ بس میں پہلے ہی کوئی جگہ نہ تھی۔ ان سولہ مسافروں کے آنے سے بلیک ہول کی یاد تازہ ہو گئی۔ ہمارے لئے ہاتھ یا پاؤں کو حرکت دینا ممکن نہ تھا۔ ہم بری طرح جکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ گرمی اور گھٹن نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بس چلی تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے اپنی پسند کا دوسرا ریکارڈ بھی لگا دیا۔

کی بھروسہ دم دا یہ دنیا فانی

مولوی صاحب کے علاوہ میرے قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی مونچھوں والے تھے اور وہ سبھی سیٹوں پر پاؤں پسارے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان سب لوگوں کا ایک دوسرے سے تعلق محض ہمسفری کا تھا۔ مگر ان کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ وہ سبھی ایک ہی کے۔ ٹو کا سگریٹ باری باری پی رہے تھے۔ جو سواری سگریٹ کا کش لگا لیتی تھی' وہ اگلی سواری کو سگریٹ تھما کر اپنے ہاتھ سے مونچھوں کو چھو کر یہ اطمینان کر لیتی تھی کہ مونچھیں اور ان کی دونوں نوکیں اپنی جگہ پر موجود ہیں اور سگریٹ کا کش لگانے کے دوران انہیں کوئی نقصان

نہیں پہنچا۔

تھوڑی دیر بعد "سڑک کی رانی" ایک اور جگہ سواریاں لینے کے لئے رکی تو وہی بوڑھی عورت پوچھنے لگی۔۔۔۔ "پتر حافظ آباد آ گیا ہے؟"۔۔۔۔ کلینر نے جواب دیا۔ "ماں توں فکر نہ کر۔ جدوں حافظ آباد آئے گا' میں تینوں دس دیاں گا۔"

بس پھر روانہ ہوئی اور ڈرائیور باری باری وہی دونوں ریکارڈ لگاتا رہا اور سواریاں اسی طرح خوف و ہراس کی حالت میں سفر کرتی رہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے "سڑک کی رانی" حافظ آباد پہنچ گئی۔ کافی سواریاں وہیں اتریں۔ کلینر باہر کھڑا اونچی آواز میں "چلو پنڈی بھٹیاں' چنیوٹ' ربوہ' سرگودہا" کی ہانکیں لگاتا رہا۔ نئی سواریاں بس میں سوار ہوتی رہیں اور بس ایک مرتبہ پھر سواریوں سے بھر گئی۔ مگر اس محویت کے دوران کلینر بوڑھی عورت کو حافظ آباد اتارنا بھول گیا۔ کسی اور سواری نے بھی اسے یاد نہ دلایا۔ دس منٹ ٹھہرنے کے بعد "سڑک کی رانی" حافظ آباد سے چل دی۔ جب ہم سات آٹھ میل دور نکل گئے تو وہ بڑھیا پوچھنے لگی۔۔۔۔ "پترا حافظ آباد حالی کنی دور اے؟"۔۔۔۔ یہ الفاظ سن کر کلینر چونک اٹھا اور اسے اپنی بھول کا شدید احساس ہوا اور کہنے لگا۔۔۔۔ "بیڑہ غرق میں نے تو بڑی ماں کو حافظ آباد اتارنے کا یقین دلایا تھا۔ مگر مجھے مسافروں کی گہما گہمی میں یاد ہی نہیں رہا"۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے شیدے نے بس روکنے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ ڈرائیور نے گھنٹی کی آواز سن کر بریک لگائی اور "سڑک کی رانی" چند لمحوں بعد کھڑی ہو گئی۔

شیدے نے بڑھیا کو وہیں اتارنا چاہا۔ مولوی صاحب اور میں نے سخت احتجاج کیا اور کہا کہ اس بوڑھی بیچاری کا کیا قصور۔ تمہاری تسلی کی وجہ سے ہی وہ خاموس رہی تھی اور پھر یہ سیدھی سادھی عورت اس سخت دوپہر میں کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اسے واپس حافظ آباد جا کر اتارو۔ اس نے لیت و لعل کی مگر ہم نہ مانے۔ دوسری سواریوں نے بھی ہماری تائید کی۔ اور انہیں مجبوراً بس واپس حافظ آباد لے جانا پڑی۔ کیونکہ غلطی سراسر کلینر کی تھی۔ جب بس دوبارہ حافظ آباد پہنچی تو کلینر نے اس بوڑھی عورت کو کہا کہ "لو ماں۔ حافظ آباد آ گیا ہے۔ جلدی جلدی اتر جاؤ۔"

بڑھیا نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔۔۔۔ "بچہ! میں اینھے نئیں اترنا چنیوٹ جانا اے۔ میرے پتر نیں آکھیا سی ماں جدوں لاری حافظ آباد پہنچے گی' دوائی پی لئیں۔" یہ الفاظ سنتے ہی ڈرائیور' کلینر اور تمام سواریوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہو رہا تھا۔

ڈرائیور نے بس پھر چلا دی- مگر اب بس کی فضا اور ماحول بہت حد تک بدل چکے تھے- ابھی ہمیں چلے پندرہ منٹ ہی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ بس کا اگلا ٹائر پنکچر ہو گیا- ڈرائیور نے دو ہٹے کٹے دیہاتی مسافروں کو بس میں سے بلایا اور انہیں چھت سے دوسرا ٹائر اتارنے کا حکم دیا- انہوں نے ٹائر اتارا تو پھر مونچھوں والے ڈرائیور نے انہیں پنکچر ٹائر کو اتارنے کا کام سپرد کیا- وہ بیچارے پہیہ کھولنے میں مصروف ہو گئے- اور ڈرائیور قریب کھڑا ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا- اور بے نیازی سے سگریٹ پیتا رہا- دوسرے ٹائر میں ہوا کم تھی- کلینر ایک اور موٹے تازے مسافر کو پکڑ لایا اور اسے ہوا بھرنے پر لگا دیا- پمپ خراب ہونے کی وجہ سے ہوا بھرنا آسان نہ تھا' مگر ڈرائیور کے رعب اور منزل مقصود پر پہنچنے کی تمنا کے باعث وہ زور لگاتا رہا لیکن ہوا بھری نہ جا سکی- پہلے تو ڈرائیور قہر آلود نظروں سے ہوا بھرنے والے کو گھورتا رہا- پھر شیدے کو کہنے لگا- "دیکھ اوئے کدرے وال تے نہیں خراب"____ کلینر نے والو نکال کر دیکھا تو اس کا ہی نقص نکلا- چنانچہ والو ٹھیک کر کے لگایا تو ہوا بھرنی شروع ہوئی- ہمارے قریباً بیس منٹ ضائع ہوئے- مگر ان تین جوانوں نے ہوا بھر کر ٹائر لگا دیا اور بس ایک مرتبہ پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی-

پنڈی بھٹیاں میں دس منٹ ٹھہر کر ہم روانہ ہوئے- اب مونچھوں والا ڈرائیور بھی اچھے موڈ میں تھا- سڑک خالی دیکھ کر وہ گاہے گاہے دونوں ہاتھوں سے اپنی مونچھوں کو بل دے لیتا تھا- اور جب بس اس کے کنٹرول سے باہر ہونے لگتی تو وہ فوراً" ایک ہاتھ سے سٹیرنگ تھام لیتا مگر اس کا دوسرا ہاتھ البتہ اپنا کام باقاعدگی سے سرانجام دیتا رہتا- ڈرائیور ایک بار پھر ریکارڈ بجانے لگا تو سواریوں نے کوئی نیا ریکارڈ سنانے کی فرمائش کر دی- اس نے سواریوں کے تعاون کے پیش نظر ان کی مئودبانہ درخواست قبول کر لی اور پھر یہ ریکارڈ لگا دیا-

"او مرنوں ذرا نئیں ڈر دے جناں نین ملا لے نیں"

سخت گرم لو چل رہی تھی- مسافر پسینے سے بری طرح شرابور تھے- ہچکولوں اور دھچکوں سے سب کا برا حال تھا- موت کی یاد دلانے والے بھیانک گانوں نے مسافروں کو مکمل طور پر بدحواس کر دیا تھا- اس دوران دو ایک لطیفے بھی ہو گئے- ایک دیہاتی نوجوان مسافر کیلا کھانے لگا- اس نے کیلے کا چھلکا اتار کر گودا بدحواسی میں کھڑکی سے باہر پھینک دیا' اور چھلکا منہ میں ڈال لیا- ایک اور سواری انار کھانے لگی- اس نے بڑی محنت سے انار کے دانے نکالے- جب وہ دانوں سے بھری ہاتھ کی مٹھی منہ میں ڈالنے لگا تو بس کے سڑک سے یکدم

اترنے کے باعث زور کا دھچکا لگا- انار کے دانے منہ میں جانے کی بجائے فرش پر بکھر گئے' اور مسافر بیچارہ شرمسار ہو کر رہ گیا-

پھر ایک جگہ سڑک بہت ہی خراب تھی- تیز رفتاری کی وجہ سے بس کو بہت زیادہ دھچکے لگے- سواریاں اچھل اچھل کر گرنے لگیں- کئی مسافروں کی نشستیں اسی اچھل کود میں خود بخود تبدیل ہو گئیں- وہ ہاتھی نما آدمی سوتے میں میرے اوپر آ گرا' اور اس کی کہنی میری پسلیوں میں سوراخ کرنے لگی- ایک بچہ اچھل کر کسی اور سواری کی گود میں جا پہنچا- ایک بوڑھے مسافر کے چوزوں پر گرنے سے تین چوزے شہید ہو گئے- اس ہاتھی نما انسان نے قلا بازی کھا کر غریب عورت کی تمام ہانڈیاں چکنا چور کر دیں- چھت پر رکھا ہوا سامان لڑھک کر سڑک پر جا گرا- سواریوں نے کلمہ شہادت' درود اور قرآن پاک پڑھنا شروع کر دیا اور استغفار کا ورد بلند آواز میں کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگیں- میں خود بھی بقول شاعر

دیکھ کر حیران تھا اس منظر کو میں
سوچتا تھا بھاگوں اب کدھر کو میں
یوں ہوا محسوس مجھ کو ایک بار
میں نہیں بس پر ہے بس مجھ پر سوار

ہم نے ڈرائیور سے گاڑی آہستہ چلانے کی درخواست کی تو اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بڑی خونخوار نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر حقارت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا- ہماری کیفیت بالکل ایسی تھی---- "گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے-"

شیدے کلینر نے بس روکنے کی گھنٹی بجائی- ڈرائیور نے اسے بھی بڑی خشمگیں نظروں سے گھورا اور جھڑک دیا- اسی لمحہ ایک پہیہ کسی کھڈ میں گرنے کی وجہ سے بس بے قابو ہو گئی اور مخالف سمت سے آتے ہوئے ایک تیز رفتار "سپرد خدا" ٹرک سے جا ٹکرائی- ٹکراؤ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ زور دار دھماکہ ہونے کے ساتھ ہی "سڑک کی رانی" الٹ گئی- کئی مسافروں کو شدید چوٹیں آئیں- سواریوں کی دلدوز چیخیں قیامت صغریٰ کا منظر پیش کر رہی تھیں- مجھے بھی خاصی چوٹیں لگیں مگر میرے ہوش و حواس قائم رہے- چند راہگیروں اور مقامی دہقانوں نے جو حادثہ کے فوراً" بعد وہاں پہنچ گئے تھے---- ہمارے

ساتھ مل کر زخمیوں کو بس سے نکالا۔ جب ڈرائیور کو نکالنے لگے تو وہ بالکل بے ہوش پڑا تھا مگر اس حالت میں بھی اس کا ایک ہاتھ مونچھ تھامے ہوئے تھا۔

دو گھنٹے بعد ایک اور بس آئی جس میں تمام زخمیوں کو ڈال کر چنیوٹ ہسپتال پہنچایا گیا۔ مجھے تو شام کو مرہم پٹی کر کے ہسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ مگر جو سواریاں زیادہ زخمی تھیں انہیں سرگودہا ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا اور اس طرح "سڑک کی رانی" سے پہلی اور آخری ملاقات کے طفیل میں جنازے میں شمولیت کرنے سے رہ گیا۔

○

پی کے (P.K)

وہ انڈین فلموں کے مافیا کا سربراہ ہے۔ جیسے PK' DK وغیرہ اور نہ کسی جابر اور سفاک جاگیردار کے نام کا مخفف جیسے دلیس پانڈے (D. P) یا گوپال ٹھاکر (G. T)' بالی ووڈ کی کسی Detective Film کا ہیرو ہے۔ جیسے سیکریٹ ایجنٹ 007 اور نہ ہی پی آئی اے کی فلائٹ شیڈول کا علامتی نشان مثلاً PK 210' یا پھر PK 304 وغیرہ۔ وہ تو مشہور و معروف پاکستانی صنعتکار جناب میاں ایس ایم فاروق کا دبئی میں چہیتا ڈرائیور ہے۔

شکل و صورت سے عالم دین لگتا ہے۔ گفتگو سے فلاسفر' لباس سے تورسٹ' چال ڈھال سے بانکا چھبیلا نوجوان' فطرتاً" چالاک اور مستعد' آداب ملازمت کا چیمپئن' طبیعت سے بذلہ سنج' مزاج اور ٹھاٹھ باٹھ امیرانہ اور متحدہ عرب امارات کے گلی' کوچوں' سڑکوں اور قابل دید مقامات و عمارات کا بھیدی۔

وہ سخت باتونی' سارا دن باتیں کرتا نہیں تھکتا۔ بات ہوائی جہازوں کی ہو یا کمپیوٹرز سے چلنے والی ریل گاڑیوں کی۔ گفتگو سیاسی ہو یا مذہبی' مردوں کی حکمرانی کا ذکر ہو یا پھر عورتوں کی مظلومیت اور ان کے حقوق کا۔ انگریزی فلمیں زیر بحث ہوں یا اردو کی' سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا معاملہ ہو یا پاکستان کے دیہات کی پسماندگی کا' یورپ امریکہ یا عرب تہذیب اور فیشن پر تبصرہ مقصود ہو' یا پاکستانی کلچر پر پی۔ کے ہر معاملہ اور موضوع پر اپنی قیمتی اور دانشورانہ رائے کا اظہار کرنے سے کبھی نہیں چوکتا۔

وہ ایک مشاق اور تجربہ کار ڈرائیور ہونے کے ساتھ ساتھ ہر مسئلہ' مشکل' ضرورت' سواں اور صورت حال سے نپٹنے کی صلاحیت اور اہلیت کا حامل چالاک اور ہوشیار شخص ہے۔ ایئر پورٹ' بنکوں' سینماؤں' ہوٹلوں' ریسٹورانوں' شاپنگ مالز' سرکاری دفاتر یہاں تک کہ سبزی منڈی کے بارے میں کوئی اطلاع یا واقفیت درکار ہو۔ تو وہ فوراً" جیب سے اپنا موبائیل فون نکال کر متعلقہ جانکاری حاصل کر لے گا۔ اسے دبئی اور شارجہ کے اکثر اہم اور ضروری ٹیلیفون زبانی یاد ہیں۔ یا پھر اس نے اپنی ڈیجیٹل ڈائری میں نوٹ کر رکھے ہیں۔

دبئی میں یکم مارچ سے 31 مارچ تک ہر سال دبئی فیسٹیویل لگتا ہے۔ جس میں دنیا بھر کے ٹورسٹ' شائقین اور وزیٹرز اسی فیسٹیویل سے لطف اندوز ہونے کے لئے جوق در جوق آتے ہیں۔ دبئی شہر کو ان دنوں بری نفاست اور قرینے سے دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ رات کو رنگا رنگ روشنیوں' قمقموں اور سرچ لائٹوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ شاہراہوں کے دونوں اطراف درختوں' سبزہ زاروں' باڑوں' آہنی جنگلوں پر روشنی کے حسین و جمیل پھولوں' مرصع آرائشوں مختلف جگمگاتے ہوئے آرٹ کے نادر نمونوں' شاپنگ سنٹروں' ریسٹورانوں اور عمارات کو قمقموں کی قطاروں' جھالروں اور محرابوں کی شکل میں ٹیوب لائٹس اور رنگین بلبوں کی چکا چوند کر دینے والی روشنیاں سارے شہر کو بقعہ نور بنا دیتی ہیں۔ دیکھنے والا اس فراوانی اور کثرت سے میلوں میں پھیلے ہوئے شہر کی تزئین و آرائش دیکھ کر حیرت میں کھو جاتا ہے۔ یہ یقیناً بڑا قابل دید منظر ہوتا ہے۔ پھر امریکہ' یورپ' مڈل ایسٹ' فار ایسٹ' انڈیا اور پاکستان کے نامور فنکار' سنگرز' ایکٹرز اور ڈانسرز ٹولیوں کی صورت میں ان دنوں دبئی میں مختلف پروگرام پیش کر کے شائقین سے داد تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح عالمی گھوڑوں کی ریس' اونٹوں کی دوڑ' پولو اور دیگر کھیلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہر رات 8 بجے اور دس بجے بڑی زبردست اور سنسنی خیز آتشبازی دیکھنے کو ملتی ہے۔ فیسٹیویل کے دوران تمام اسٹورز' شاپنگ سنٹرز اور دوکاندار گاہکوں کو خریداری کرنے پر 20 سے لے کر 30 فیصدی قیمتوں میں رعائت یعنی discount دیتے ہیں۔

مجھے محترم فاروق بھائی نے مارچ کے پہلے ہفتے میں ہی میرے اور میرے چھوٹے بھائی اعجاز احمد کے ویزے بھجوا دیئے۔ اور فرمایا کہ ان کا ڈرائیور جو ہمیں پہچانتا ہے۔ آپ کو ائیر پورٹ سے لے لیگا۔ اور ان کے مہمان خانے میں پہنچا کر سیٹ کر دے گا۔ ہم نے اپنے عزیز دوست اور بھائی خواجہ محمد یونس کو ٹیلیفون کر کے اپنے دبئی میں پہنچنے کے پروگرام سے مطلع کر دیا۔ تو وہ بھی ہمارے اس تفریحی پروگرام میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس طرح ہم 18 مارچ کو پی آئی اے کی فلائٹ PK 209 پر لاہور سے سوار ہو کر ڈیڑھ بجے دوبئی پہنچ گئے۔ امیگریشن والوں نے تو ہمیں چند منٹوں میں فارغ کر دیا۔ مگر ہمارا سامان خاصی دیر بعد کنویئر بیلٹ پر آیا۔ سامان لے کر ہم Arrival Lounge سے باہر آئے۔ تو وہاں میرے عزیز بھتیجے چوہدری محمد فاروق تارڑ پسر صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان ہمارے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ ان کے پاس ہی میاں فاروق صاحب کا ڈرائیور PK ہمارا منتظر تھا۔ فاروق تارڑ

صاحب نے تو اپنی بنک ڈیوٹی پر جانا تھا' چنانچہ وہ شام کو ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اور پی۔ کے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک نہایت پرشکوہ اور عالیشان عمارت جو دبئی کی مشہور ترین شاہراہ کلثوم روڈ جیسے پوش علاقہ میں واقع ہے۔ اسی عالیشان عمارت میں ساتویں منزل کے فلیٹ نمبر 702 میں ہمیں پہنچا دیا گیا۔

فلیٹ کا محل وقوع اور اس کی گیلری سے نظر آنے والا نظارہ بے حد دلفریب اور دلکش تھا۔ ہم لوگ اس کے کشادہ اور ہوا دار ڈرائنگ / ڈائننگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ اتنے میں پی۔ کے چائے بنا کر لے آیا۔ پی۔ کے ہمیں پہلے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لئے ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہ تھی۔ دوسرے میاں فاروق کی سخت ہدایات کی وجہ سے وہ ہماری ہر خدمت بجا لانے کے لئے پر تول رہا تھا۔

میں نے اسے پاس بٹھا کر بڑے پیار سے پوچھا کہ اسے پی۔ کے کیوں کہتے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ اس کا اصل نام تو خالد مقصود ہے۔ مگر اس کے یار دوست اور ساتھی ہمیشہ اسے پیا خالد کہہ کر پکارتے ہیں۔ جس کا مخفف پی۔ کے ہے۔ ویسے بھی اسے پی۔ کے کہلوانا پسند ہے۔ پھر کہنے لگا کہ اس کی والدہ اور بیوی سے بھی اسے پی۔ کے کہلوانا اچھا لگے گا۔ اس پر اعجاز احمد نے کہا کہ ایسا غضب نہ کرنا۔ اگر تمہاری بیوی نے P.K کہہ دیا۔ تو سمجھو تمہیں طلاق ہو گئی۔ لہٰذا محتاط رہنا۔ جس پر اس نے وضاحت کی کہ جب ماں اور بیوی پی۔ کے (P.K) کہے گی۔ تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ماں جب پی۔ کے کہتی ہے۔ تو اس کا مطلب ہے۔ "پتر خالد" اور اگر بیوی P.K کہے۔ تو اس کا مقصد ہو گا۔ "پیارے خالد" یہ وضاحت سن کر ہم بہت محظوظ ہوئے۔

پی۔ کے دھرم پورہ لاہور کے ایک جاٹ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اس کے والدین نے فیملی پلاننگ کے سنہری اصولوں کی دھجیاں اڑا کر دنیاوی اقدار کی بالا دستی قائم کرتے ہوئے چھ بیٹے اور تین بیٹیوں کو جنم دے کر اپنی شاندار کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ پی۔ کے ان بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے۔ اس نے دھرم پورہ کے ایک اسکول میں میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ مگر پڑھائی میں اسے دلچسپی نہ ہونے کے باعث ایف اے پاس نہ کر سکا۔ اس کا رجحان کھیتی باڑی کی طرف تھا۔ مگر خاندانی مجبوریوں اور کثیر اخراجات کی بدولت انہیں اس مختصر زرعی اراضی کو فروخت کرنا پڑا۔ اس طرح اس نے ڈرائیونگ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس کا مقدر اچھا تھا کہ اسے میاں ایس ایم فاروق جیسے مخیر'

شفیق' زندہ دل' خدا ترس' نیک اور ہمدرد مالک ملا۔ جس کی شفقت' فراخدلی' مربیانہ فطرت' اعلیٰ ظرف اور ملازموں سے عمدہ حسن سلوک نے پی۔ کے کو ایک پرسکون اور پراعتماد ماحول میں اچھا انسان بننے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے چھ برس تک لاہور میں میاں فاروق صاحب کی فرم میں بطور ڈرائیور کے ملازمت کی۔ پھر اس کا تبادلہ دبئی میں کر دیا گیا۔ جہاں وہ گذشتہ چھ برس سے میاں ایس ایم فاروق کے ذاتی ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ پی۔ کے خود ہی بتاتا ہے کہ میاں فاروق جیسے عظیم محسن کے زیر سایہ کام کرنا کیسا ہے۔ جیسے رب العزت کا خاص کرم ہو۔ وہ اپنے مالک کی طرح پابند صوم صلوۃ ہے۔ اور ان کی عنایات اور مہربانیوں کا قصیدہ گو ہے۔ میاں فاروق کی کرم نوازیوں کا یہ حال ہے کہ پی۔ کے کو انہوں نے اپنے ساتھ سعودی عرب لیجا کر دو مرتبہ عمرہ کی سعادت سے ہمکنار کرایا ہے۔ میاں فاروق اپنے ملازموں کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔ یہ ان کی عظمت کی بہترین مثال ہے۔

شام پانچ بجے ہم لوگ دبئی کے مشہور شاپنگ سنٹر Carre Four جو عرف عام میں سٹی سنٹر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ چلے گئے۔ تاکہ فلیٹ کے لئے کچھ ضروری سامان خرید کر لے آئیں۔ سٹی سنٹر میں شاپنگ کرنے والوں کا اس قدر رش تھا کہ اس وسیع و عریض ہال میں چلنا پھرنا تک ممکن نہ تھا۔ بہرحال اپنی ذاتی ضرورت کا سامان خرید کر ہم لوگ واپس فلیٹ میں چلے آئے۔ رات کو P.K نے کسی ریسٹوران پر فون کر کے فلیٹ پر ہی کھانا منگوا لیا۔

رات گیارہ بجے خواجہ محمد یونس لندن سے بذریعہ Royal Jardanian Air Line دبئی پہنچنے والے تھے۔ مگر جہاز ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھا۔ لہٰذا میں تو تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی سو گیا۔ مگر اعجاز احمد اور پی۔ کے خواجہ یونس کو لینے ائیر پورٹ چلے گئے۔ خواجہ محمد یونس سے میری ملاقات اگلی صبح ناشتہ کے ٹیبل پر ہوئی۔ خواجہ محمد یونس ہمارے سفر کا پکا ساتھی ہے۔ چار ماہ قبل ہم نے عمرہ کی سعادت بھی اکٹھے حاصل کی تھی اور وہاں ہی مارچ میں دبئی آنے کا پروگرام بن گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پسند کا ہمسفر اور ساتھی تفریح کو دوبالا کر دیتا ہے۔ میں اور اعجاز احمد خواجہ محمد یونس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ دبئی میں اگلے آٹھ روز بڑے خوشگوار اور پرلطف گزریں گے۔ پی۔ کے خواجہ محمد یونس سے پہلی دفعہ ملا تھا۔ مگر اگلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے خاصا مانوس ہو چکا تھا۔ دوپہر کو پی۔ کے ہمیں پار دبئی کے معروف ریسٹوران "راوی" میں لے گیا جس کا کھانا بے حد لذیذ اور ذائقے دار

تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پاس ہی لیمسی پلازہ کے ایک خوبصورت سینما ہال میں فلم دیکھنے چلے گئے۔ شام کو ہم اپنے فلیٹ میں لوٹ آئے۔ ایک گھنٹے بعد فاروق تارڑ صاحب کا ٹیلیفون آ گیا۔ وہ کہنے لگے۔ کہ "آج شام آپ کو دبئی کی سیر کروانا ہے۔ آپ تیار رہیں۔ میں آپ کے فلیٹ پر آ کر آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

رات آٹھ بجے فاروق تارڑ ہمیں اپنی گاڑی میں دبئی فیسٹیویل کی خوشنما اور جاذب نظر سجاوٹ سے آراستہ سڑکوں اور آرٹ کے نادر اور دلکش نمونوں سے مزین شاہراہوں اور جگہ جگہ نفیس و دلاویز مرصع شاپنگ سنٹروں کی دیدہ زیب چکا چوند روشنیوں کے جھرمٹ میں پار دبئی کے ایک نہایت ہی عمدہ اور عالیشان چائنیز ریسٹوران میں کھانا کھلانے لے گئے۔ کھانا خاصا مزیدار اور پرلطف تھا۔ سبھی نے کھانے سے پورا پورا انصاف کیا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو ہمیں وہ بین الاقوامی نمائش دکھانے گلوبل ولیج لے گئے۔ مختلف ملکوں کے خوبصورت اور قرینے سے سجائے گئے اسٹال بڑے دلفریب اور پرکشش دکھائی دیئے۔ تماشائیوں اور نورسٹوں کا وہاں ایک ہجوم بے کراں اس ایریا میں پیدل مٹرگشت کرتا نظر آیا۔ ولیج میں جگہ جگہ ریسٹوران' کیفے اور سنیک بارز میں غیر ملکی اپنی اپنی پسند کی اشیاء سے دل بہلا رہے تھے۔ دبئی اس وقت دنیا کا رنگین و دلنشین بارونق تفریح کا شاہکار دکھائی دیتا تھا۔ دو گھنٹے اس گوشہ عافیت میں گزار کر ہم لوگ واپس چلے آئے۔

اگلے روز پی۔ کے گیارہ بجے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہ ہمہ وقت مختلف موضوعات اور گوناگوں مسائل پر گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ زیادہ باتیں اور بلا ضرورت بولنے کی وجہ سے وہ یہ تمیز ہرگز نہیں کر سکتا کہ کونسی بات کرنی ہے۔ اور نامناسب بات چھپانی ہے۔ مسلسل بولتے رہنے سے وہ بسا اوقات بڑی غلط پٹڑی پر چڑھ جاتا ہے۔ اور سامعین سخت اکتاہٹ اور بوریت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض اوقات سر درد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک دن وہ اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگا کہ وہ گھر میں سب سے چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں باپ کا بہت لاڈلہ تھا۔ اور اکثر اپنے باپ سے جیب خرچ لینے کے لئے ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنا چہرہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر شیر کی طرح غرانے لگتا۔ اگر خرچہ ملنے میں دیر ہوتی۔ تو پھر کتے کی طرح بھونکنے لگتا۔ جس سے باپ بیچارہ سمجھ جاتا کہ اب اگر پیسے نہ دیئے۔ تو عین ممکن ہے کہ برخوردار پلا کہیں کاٹ نہ لے۔

چند برس بعد جب وہ قدرے بڑا اور سیانا ہو گیا۔ تو اس نے دس روپے لینے کے لئے

طریقہ واردات بدل دیا- اب اس نے باپ کی تہمد یعنی دھوتی پکڑنا شروع کر دی- باپ اگر دس روپے شرافت سے دے دے تو بیٹا دھوتی چھوڑ دے گا- ورنہ باپ کو اس ہونہار پتر کے ہاتھوں ننگا ہو جانا تھا- بلکہ ایک مرتبہ P.K نے دس روپے نہ ملنے پر دھوتی نیچے گرا کر باپ کو برہنہ کر دیا تھا- جس کے عوض اسے دس روپے کی بجائے زبردست گالی گلوچ سے نوازا گیا- اس واقعہ کے بعد پی- کے کو دھوتی پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی- کیونکہ اس کا سادہ لوح باپ اپنے لاڈلے پتر کی ڈیمانڈ پر اسے ناجائز حربہ استعمال کرنے سے پہلے دس روپے دے دیتا تھا-

ایک روز میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھا ٹیلیویژن دیکھنے میں محو تھا- میرا بایاں ہاتھ صوفے کے بازو پر تھا- مجھے ایک دم اپنے ہاتھ پر گھنی داڑھی والے چہرے کی ہلکی سی رگڑ محسوس ہوئی- تو میں چونک گیا- پی- کے اس وقت میرے ہاتھ پر داڑھی والا منہ رکھے- شیر کی غراہٹ کی آواز نکال رہا تھا- مجھے اس غراہٹ میں خر خراہٹ زیادہ محسوس ہوئی- تو میں نے اندازہ لگا لیا کہ P.K مجھ سے کوئی بات منوانا چاہتا ہے- چنانچہ میں نے اسے فوراً" اپنا مطالبہ پیش کرنے کو کہا- تو اس نے بڑی سعادت مندی اور انکساری سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "میاں جی مجھے انگریزی فلم "Gladiator" دکھا دیں- جس کو حال ہی میں لاس اینجلس (Los Angles) میں پانچ اکیڈیمی ایوارڈ ملے ہیں- وہ فلم دبئ کے ایک جدید سینما میں پچھلے سات آٹھ ماہ سے مسلسل چل رہی ہے- پی- کے مجھے بارہا یہ یقین دہانی کروا چکا تھا کہ وہ مجھے اپنا باپ سمجھتا ہے- اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ اپنے مرحوم باپ کے ہاتھ پر منہ رکھ کر غراتے ہوئے جب کسی چیز کا مطالبہ کیا کرتا تھا- تو وہ خواہش پوری نہ ہونے کی صورت میں کیا کرتا تھا- اس لئے میں نے فوراً" اس کا مطالبہ مان لیا- اور اگلے روز فلم Gladiator دکھانے کا پروگرام بنا لیا-

فلم کا رسیا' مٹھائی کا شیدائی' آئس کریم کا عاشق' گفتگو کا چیمپئن پی- کے اچھی طرح جانتا تھا کہ دبئ اور شارجہ میں شاپنگ کے لئے کونسا سنٹر بہترین ہے- کہاں اچھا پاکستانی' لبنانی' تھائی' انگلش اور چائنیز کھانا مل سکتا ہے- کس کس سینما میں کونسی اچھی انگریزی یا اردو بھارتی فلم چل رہی ہے- ادویات' سوئیٹس' چاکلیٹ' آئس کریم' برگر' بیکری کا سامان' الیکٹرانکس وغیرہ کہاں سے بہتر دستیاب ہیں- اس طرح کارپٹس' سامان آرائش' گارمنٹس' جوتے' ہارڈوئیر اور آٹو یارٹس کی خرید و فروخت کے معاملہ میں P.K کی انفارمیشن مکمل اور

پرفیکٹ ہو گی- بلاشبہ وہ دبئ میں شاپنگ کی ڈکشنری کی حیثیت رکھتا ہے-

اسکول کے زمانے میں پی- کے نے گاؤں کے گندے جوہڑ میں ڈوبتے ہوئے اپنے ایک ہم جماعت کو بچا کر دوسرے لڑکے کو جوہڑ میں پھینک دیا تھا- یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ لڑکا تیراکی نہ جانتا تھا- اس نے یہ اس لئے کیا تھا- کیونکہ اس لڑکے نے پی- کے کو اس بچے کو بچانے کی غرض سے جوہڑ میں دھکا دیا تھا- اس طرح اس لڑکے کی جان بچ گئی- اس دوسرے لڑکے کا مقدر اچھا تھا کہ اس کو چند راہگیروں نے ڈوبتے ہوئے دیکھ کر بچا لیا تھا- ورنہ پی- کے ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاتا-

اس دن دبئ پار ایک ہوٹل میں لنچ کیا- پھر شارجہ جا کر اسٹار گیلیکسی سینما میں فلم دیکھنے چلے گئے- سینما بڑا ماڈرن اور نہایت خوبصورت تھا- مگر فلم اتنی ہی بور تھی- چونکہ ٹکٹ پر خرچ کی گئی رقم وصول کرنا تھی- اس لئے ڈھیٹ ہو کر دیکھتے رہے- فلم ختم ہونے کے بعد اپنے عزیز دوست حاجی مراد علی کے بیٹے حامد مراد جو شارجہ ہی میں قیام پذیر ہیں نے ہمیں سینما کے پاس "Splash" اسٹور میں ملنا تھا- یہ انڈیا کی تیار کردہ مصنوعات کا خاصا مشہور اسٹور ہے- جہاں سے امپورٹیڈ اشیاء بھی ملتی ہیں- پندرہ منٹ بعد حامد مراد آ گیا- اور وہ ہمیں شارجہ کے دہلی نہاری ریسٹورنٹ میں ڈنر کھلانے کے لئے لے گیا- اس کا کھانا بھی بہت مزیدار اور لذیذ تھا- کھانے کے بعد ایک گھنٹہ تک شارجہ کے روشن اور آراستہ شاپنگ سنٹروں' دوکانوں' عمارات اور کشادہ شاہراہوں کا نظارہ کرتے رہے- پھر رات گئے اپنے فلیٹ پر واپس آ گئے- اگلے روز الائن جانے کا پروگرام تھا- اس لئے پی- کے کو دس بجے صبح آنے کا کہہ کر اسے گھر بھیج دیا-

بدھ وار مورخہ 21 مارچ کو خواجہ محمد یونس' اعجاز احمد اور میں P.K کے ہمراہ الائن روانہ ہوئے- ڈیڑھ گھنٹے کا یہ سفر بڑا پرلطف اور دلفریب تھا- آسمان ابر آلود اور موسم بے حد خوشگوار- سارا راستہ پھلواری کی رنگا رنگ قطاروں' دو رویہ درختوں' سرسبز اور چھوٹی چھوٹی رنگین بوگن بیلیا کی خوبصورت جھاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ اس سفر کو بڑا پرکشش اور دیدہ زیب بنا رہا تھا-

اس علاقہ میں میٹھے پانی اور زرخیز مٹی نایاب ہونے کے باوجود مالیوں' اور بیلداروں کی فوج ظفر موج کے ساتھ زر کثیر کی لاگت سے اس صحرا کو اس قدر خوشنما اور تزئین و آرائش سے ہمکنار کرنا حیرت انگیز کارنامہ ہے- یہ حسین و جمیل صورت حال حکمرانوں کی بے مثال

لگن' غیر معمولی دلچسپی' لاجواب شوق اور بے پناہ توجہ اور محنت کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ الائن کا علاقہ شروع ہوا تو بڑے ہی دلکش اور دلاویز مناظر دیکھنے کو ملے۔ قالین کی طرح سبز گھاس کے تاحد نظر طویل قطعات اور ان میں فراوانی سے بچھائی گئیں رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اس قدر جاذب نظر دکھائی دیتا تھا کہ دیکھنے والی آنکھیں محو حیرت ہو جاتی ہیں۔ صاف شفاف کشادہ اور ہموار سڑکیں اس علاقے کی خوبصورتی اور حسن میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ الائن قدرتی میٹھے پانی کے چشموں اور جھرونوں سے مالا مال ہے۔ یہ متحدہ عرب امارات کا گرمیوں کا صدر مقام ہے۔ الائن کا شہر نہایت جدید اور خوبصورت ہے۔ یہاں بیرونی ممالک سے آنے والے ٹوریسٹوں اور سیاحوں کی بہت بڑی تعداد روزانہ اس شہر کی فضا اور سرسبز اور شاداب پہاڑیوں اور قدرتی مناظر کو دیکھنے کے لئے آتی ہے۔ یہ شہر حسن و رعنائی' آرکیٹیچرل بیوٹی' کشادگی اور پلیننگ کے اعتبار سے یورپ کے کسی شہر سے کم نہیں۔

الائن کی ایک پر شکوہ اور ذی شان مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ مسجد کا نہایت دیدہ زیب اور عمدگی سے آراستہ وسیع و عریض ہال دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ یہاں ساری مساجد حکومت تعمیر کراتی ہے۔ ہال میں قیمتی کارپٹ والل ٹو والل بچھا تھا۔ انمول اور نادر فانوس چھت کی تزئین و آرائش کو نمایاں کر رہے تھے۔ وضو اور طہارت کا انتظام بھی بڑا عمدہ اور تسلی بخش تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے وہاں ہی ایک پاکستانی ہوٹل میں کھایا۔ پھر P.K. ہمیں گاڑی میں بیٹھا کر شہر کی خوبصورت اور کشادہ شاہراہوں پر پھراتا رہا۔ یہ شہر مجموعی طور پر ایک پرکشش اور دلفریب باغ کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ تین بجے بعد دوپہر ہم لوگ واپس دبئی کے لئے چل پڑے۔ پی۔ کے سے کیا ہوا وعدہ اسے یاد تھا۔ اس لئے وہ ہمیں سینما کمپلیکس میں لے آیا۔ جہاں فلم Gladiator چل رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فلم بڑی لاجواب اور نہایت عمدہ تھی۔ ہم فلم دیکھ کر اس شاندار سینما ہال سے باہر آئے تو بڑے سحر زدہ تھے۔ ہیرو کی انتہائی خوبصورت اور دلاویز اداکاری' نفیس ہدایت کاری اور بہترین عکاسی اور منظر کشی فلم کے نمایاں پہلو تھے۔

سن پچاس کی دہائی میں جب ہمیں خیرات کے طور پر امریکی گندم کھانے کے لئے ملتی تھی۔ تو ہمارے قلب و جان سے بے اختیار "امریکہ زندہ باد" کے نعرے بلند ہوتے سنائی دیتے تھے۔ اور رات کو سوتے ہوئے خواب میں امریکہ کے مشہور اور اہم شہروں اور قابل

دید مقامات کی پرلطف اور دلاویز سیر ہو جایا کرتی تھی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ "آدمی جس کا دیا کھاتا ہے۔ اسی کے گیت گاتا ہے۔" اس طرح جب کبھی بھی ہمیں دبئی جانے کا اتفاق ہوا تو وہ ہمیشہ محترم اور پیارے بھائی میاں ایس ایم فاروق کی بدولت ہی نصیب ہوا۔ کیونکہ وہ اکثر ہمیں ویزا بھیج کر بلا لیتے ہیں اور دبئی پہنچنے پر اپنا ایک خوبصورت اور لگژری فلیٹ ہماری رہائش کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ ہمہ وقت ان کا ڈرائیور ہماری سہولت اور آسائش کے لئے موجود ہوتا ہے۔ فریج ہر قسم کے جوس' مشروبات' پھل' دودھ' مکھن' پنیر' دہی' بیکری کا سامان' چائے' کافی' بسکٹ اور خدا جانے کون کون سی نعمتوں اور اشیاء سے بھرا ہوتا ہے۔ ان جملہ ضروریات کی فراہمی کے باوجود میاں ایس ایم فاروق کو ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہی ہے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ علاوہ ازیں ہر صبح ٹیلیفون پر ہماری خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد ہماری دن بھر کی مصروفیات کا حال جان کر شام ہمارے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنا کر اپنی فیکٹری واقعہ جبل علی چلے جاتے ہیں۔ شام کو تھکے ماندھے جب گھر لوٹتے ہیں۔ تو فون کر دیتے ہیں کہ تیار رہنا ایک گھنٹے تک باہر چلیں گے۔

اس طرح ہماری راتیں خوشگوار بنانے کی غرض سے وہ ہر روز ہمیں کبھی جمیرا بیچ کے کسی مہنگے ترین فائیو اسٹار ہوٹل میں یا دبئی کی کسی شہرہ آفاق سروس کلب کے ورلڈ کلاس ریسٹوران میں یا پھر کسی شاپنگ پلازہ کے ٹاپ فلور پر واقعہ فیشن ایبل یورپی اسٹائل کے ریسٹورانٹ میں کھانا کھلانے لے جاتے ہیں۔ ایک دو مرتبہ کسی بڑے الٹرا ماڈرن سینما ہاؤس میں فلم دکھانے لے جاتے ہیں۔ الغرض میاں فاروق اپنی حیثیت' حسن ذوق' وسیع النظری اور فیاض طبع اور آداب میزبانی سے سرشار ہو کر مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہیں۔

اس دفعہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میاں ایس ایم فاروق کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ہماری موجودگی کے دوران دبئی نہ پہنچ سکے۔ اس کا انہیں خاصا ملال بھی تھا۔ مگر ہمیں ان کی غیر موجودگی بہت زیادہ کھٹکتی رہی۔ ان کے بغیر دبئی کی رونقیں ماند' فضا خاموش' ماحول ناگوار خاطر اور سرگرمیاں بڑی حد تک بے آب و تاب رہیں۔ میاں فاروق کی ذات بابرکات کا طلسم' چہرے کی نمایاں مسکان' ان کی صحبت کا سحر انگیز تاثر اب ہمارے لئے "دور کے ڈھول سہانے" کے مترادف تھا۔ میاں فاروق نے اگرچہ اپنے ڈرائیور P.K. کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ہماری خدمت اور اطاعت گزاری میں کوئی کسر باقی نہ رکھے۔ اور اس نے آپ کی تلقین پر عمل بھی کیا۔ مگر اس طرح ان کی عدم موجودگی کا خلا تو پورا نہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال

یہ کسر کسی حد تک میاں فاروق کی جگہ عزیزم فاروق تارڑ نے پوری کر دی۔ اس نے ہماری دلجوئی' تفریح' مہمان نوازی اور خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

پی۔ کے اپنے مالک میاں فاروق کے بارے میں اکثر قصیدہ گوئی اور مدح خوانی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ ان کی بے پناہ شفقت' بے مثال کرم نوازی' لاتعداد عنایات اور ہمدردانہ رویہ کا ذکر کرتے نہیں تھکتا۔ P.K. کے ساتھ ان کا سلوک ایک ملازم کی نسبت ایک خاندان کے فرد جیسا ہے۔ اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی مروت' محبت' سخاوت اور نوازشات کی بوچھاڑ کرنا ان کا معمول ہے۔ پی۔ کے کی ناقابل برداشت اور بے معنی گفتگو' ناواجب اور ناروا فرمائشیں' ہر معاملہ اور مسئلہ میں اس کی نامناسب دخل اندازی اور مداخلت صرف میاں فاروق جیسے اعلیٰ ظرف اور حوصلہ مند انسان ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ شادی کرنے کے لئے طویل رخصت' سال میں چار مرتبہ بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان آنے جانے کی سہولت' بیوی اور بچے کو اپنے خرچ دبئی لانے اور اپنے لگژری فلیٹ میں رہنے کی اجازت دینا' دو مرتبہ اپنے ساتھ ارض مقدس لیجا کر عمرہ کی سعادت نصیب کرانا یہ صرف پی۔ کے کو میاں فاروق جیسا فیاض' سخی اور دریا دل انسان ہی ایسی مراعات فراہم کر سکتا ہے۔ انہی بے شمار عنایات اور سہولتوں کے سبب پی۔ کے اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت اور خوش نصیب آدمی خیال کرتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ خاصا گھل مل گیا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں ہمارا شوفر' گائیڈ اور خدمتگار بھی تھا۔ ہمارے لئے چائے اور بعض اوقات ناشتہ تیار کرنا' میلے کپڑوں کی دھلائی اور استری کرنا' شاپنگ کرانا' سیر و تفریح کے لئے مختلف مقامات پر لے جانا۔ یہ پی۔ کے کا روز کا معمول تھا۔ اکثر اوقات جب وہ موڈ میں ہوتا۔ تو انگریزی بولنے لگتا۔ ایک دن زیادہ ترنگ میں آ کر گانا گانے لگا۔ تو میں نے فوراً" اس کے منہ اور داڑھی پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ کیونکہ مجھے عورت کا حقہ پینا' مولوی کا گانا اور خسرے کا ناچنا ہرگز اچھا نہیں لگتا۔

جمعرات کو ہمارا کہیں جانے کا پروگرام نہ تھا۔ اس لئے ہم دیر تک اپنے فلیٹ میں گپ شپ لگاتے رہے۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ تو مجھے میاں فاروق صاحب کی مانوس اور پیاری آواز سنائی دی۔ وہ کراچی سے بول رہے تھے۔ اور ہماری خیریت دریافت کرنے لگے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کی عدم موجودگی ہمارے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ وہ دبئی نہیں آ سکتے تو ہم یہاں آنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے بغیر دبئی بڑی سونی سونی اور بے رونق سی لگتی ہے۔

میاں فاروق فرمانے لگے کہ ان کا دل تو چاہتا ہے کہ وہ ایک دو دن کے لئے آ جائیں۔ مگر پاکستان میں ان کا موجود رہنا بڑی مجبوری ہے۔ یہ جواب سن کر ہمیں ان کی جدائی برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اگلے روز ہم حسب پروگرام ابوظہبی کے لئے روانہ ہو گئے۔ آج بھی موسم بڑا سازگار اور ابر آلود ہونے کی وجہ سے خوشگوار تھا۔ گاہے گاہے ہلکی سی پھوار گاڑی کی ونڈ اسکرین پر پڑ رہی تھی۔ سفر پرلطف تھا۔ ہم منزل مقصود پر پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ ابوظہبی میں ہم افضال ہاشمی کے چھوٹے بھائی اعجاز ہاشمی کے گھر پہنچے تو وہ ہمارے منتظر تھے۔ افضال ہاشمی بھی گوجرانوالہ سے ایک روز پہلے وہاں پہنچے تھے۔ اعجاز ہاشمی کا خوبصورت ولا ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ وہ ابوظہبی میں ایک بڑے معروف بین الاقوامی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ اور ان کی بیگم ہسپانوی نیشنل ہے۔ وہاں ہی ہم نے اپنے دیرینہ ہمدم عبدالغفار کو بلا لیا تھا۔ قبل ازیں جب کبھی ہمیں ابوظہبی آنے کا اتفاق ہوا۔ تو مسٹر عبدالغفار ہی ہمارے میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اب وہ قدرے ناراض تھے کہ اس دفعہ انہیں شرف میزبانی سے کیوں محروم رکھا گیا۔ جب ہم نے انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہماری استدعا کو قبول کرتے ہوئے وہاں آ کر ہم میں شامل ہو گئے۔ ہم نے P.K. کو پانچ بجے تک چھٹی دے دی۔ اور خود دو گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں کی ایک نہایت عمدہ اور بارونق عربی کلب میں لنچ کرنے آ گئے۔ ہمارے وہاں کے میزبان اعجاز ہاشمی کے جگری دوست ایک عربی شہزادے تھے۔ اس شاندار کلب کے وسیع و عریض نفاست سے آراستہ ہال میں بوفے لنچ کا پروقار اہتمام کیا گیا تھا۔ سوپ' سلاد' کھانے' ڈیزرٹ (سویٹ) کی اتنی ورائٹی تھی کہ اسے کھانا تو کجا گنا نہ جا سکتا تھا۔

سنا ہے ملازمت حاصل کرنے والے چند امیدواروں سے انٹرویو کے دوران یہ سوال باری باری پوچھا گیا۔

سوال۔ کھانے کی ایک میز پر بے شمار اعلیٰ اور عمدہ کھانے کی اشیاء سجا کر رکھی ہوئی ہوں۔ مثلاً پھل' آئس کریم' پیسٹریز' مٹھائیاں' ملک شیک' ٹافیاں' کوک' حلوہ اور فرنی وغیرہ جو چیزیں بچوں کو بے حد مرغوب اور پسند ہیں۔ اور کسی بچے کو اس میز پر بٹھا دیں۔ تو بتاؤ بچہ ان چیزوں میں سے کون سی آئٹم پہلے کھائے گا۔

اس کے کئی دلچسپ جوابات امیدواروں نے اپنی فہم و فراست کے مطابق دیئے۔ مگر

سب سے زیادہ دلچسپ اور پسندیدہ جواب یہ تھا۔

"کہ بچہ یہ ساری چیزیں دیکھ کر رونے لگے گا۔ کھائے گا کچھ نہیں۔"

ہماری حالت بھی اس وقت یہی تھی کہ کون سی چیز پہلے کھائی جائے۔ اور کون سی بعد میں۔ بوفے کے اس مینو میں یورپین' عربی' پاکستانی' لبنانی' تھائی اور چائنیز ڈشیں بڑے سلیقے اور قرینے سے سجا کر رکھی ہوئی تھیں۔ دراصل کھانے کی ساری آئٹمیں تو چکھی بھی نہ جا سکتی تھیں۔ بہرحال یہ دعوت بڑی لاجواب اور یادگار تھی۔ تمام شرکاء نے اپنی اپنی ہمت اور بساط کے مطابق کھانے سے انصاف کیا۔ اور کھانا حقیقت میں تھا ہی بے حد لذیذ۔

کلب سے فارغ ہو کر ہم ابوظہبی کی سب سے خوبصورت اور قابل دید سیر گاہ کورنیش دیکھنے چلے گئے۔ ابوظہبی کے اس پرکشش اور دیدہ زیب علاقے کو دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے سیاح اور ٹورسٹ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ آتے ہیں۔ ویسے بھی سمندر کے ساتھ یہ نہایت حسین اور بہترین سیر گاہ مانی جاتی ہے۔ وہاں سے سمندر سے حاصل کی گئی (Reclaim) جگہ پر کئی قسم کے پلازہ اور کمپلیکس بنائے جا رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ اور شام کو تماشائیوں اور ٹورسٹوں کا ہجوم اس طرف امنڈتا چلا آتا ہے۔ یہ دنیا کے مہنگے ترین پراجیکٹوں میں سے ایک ہے۔

چھ بجے ہم لوگ ابوظہبی کا دورہ مکمل کر کے واپس دبئی کے لئے چل پڑے۔ کوئی پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ ہمارے موبائیل ٹیلیفون پر رنگ ہوئی۔ موبائیل آن ہوا۔ تو فاروق تارڑ بول رہے تھے۔ پوچھنے لگے کہ دبئی کب تک پہنچو گے۔ میں نے بتایا کہ آٹھ بجے تک انشاء اللہ پہنچ جائیں گے۔ تو وہ کہنے لگے کہ رات کو اکٹھے ڈنر کریں گے۔ اور وہ سوا آٹھ بجے ہمیں ہمارے فلیٹ سے لے لیں گے۔ چنانچہ دبئی پہنچنے پر پی۔ کے کو چھٹی دے دی۔ اور ہم فاروق تارڑ کے ہمراہ دبئی کے ایک ٹاپ کوالٹی ریسٹورانٹ جو Twin Towers میں واقع تھا۔ میں کھانا کھایا۔ یہ ریسٹورانٹ خاصا مہنگا ہونے کے باوجود گاہکوں سے بھرا پڑا تھا۔ زیادہ تعداد یورپین مردوں اور عورتوں کی تھی۔ دبئی کے لوگوں میں خوشحالی اور فارغ البالی بڑی واضع دکھائی دیتی ہے۔ کھانے کے بعد فاروق تارڑ ہمیں دبئی ہائی نائٹ دکھانے شہر کی پررونق شاہراہوں کی سیر کرواتے ہوئے واپس ہمارے فلیٹ پر اتار کر چلے گئے۔ سارا دن اچھی خاصی گہما گہمی اور مصروفیت میں گزرا تھا۔ اس لئے اچھی خاصی تھکاوٹ ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی لباس بدل کر لیٹ گئے۔ اور چند ہی لمحوں میں خواب

خرگوش میں گم ہو گئے۔

پاکستانی روپیہ کی قدر میں مسلسل گراوٹ کی وجہ سے ہمارے لئے شاپنگ خاصی مہنگی ہو چکی تھی۔ اس لئے ہم نے ہر قسم کی شاپنگ کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ خواجہ محمد یونس نے اپنی ایک سال کی پوتی کے لئے البتہ دو فراک خرید کئے تھے۔ جو بعد میں پتہ چلا کہ وہ تین ماہ کی بچی کے سائز کے ہیں۔ اب وہ پریشان ہوا۔ کیونکہ ان فراکوں کا تبدیل کرنا ضروری تھا۔ میں نے تو مشورہ دیا تھا کہ یہ فراک بھی رہنے دیں۔ یہ کسی اور نوزائیدہ بچے کے کام آ جائیں گے۔ مگر وہ نہ مانا اسے خدشہ تھا کہ انڈر سائز فراک خریدنے کی وجہ سے گھر میں اس کی ریپوٹیشن پر خاصا اثر پڑے گا۔ اس لئے دوبارہ جا کر فراکوں کا سائز تبدیل کر لیا۔ اتوار کی دوپہر کو میرے ماموں زاد بھائی سلمان نے ہمیں لنچ پر بلایا ہوا تھا۔ وہ آجکل پار دبئی میں رہتے ہیں۔ پی۔ کے ہمیں ان کی رہائش گاہ پر اتار کر چلا گیا۔ وہاں میرے دوسرے کزن کا بیٹا اور اس کی بیگم بھی آئے ہوئے تھے۔ دعوت میں بچیوں نے خاصا تکلف کر رکھا تھا۔ کافی دنوں بعد گھر کا کھانا کھانے کو ملا۔ بہت لطف آیا۔ کوئی تین بجے گھر آ کر سو گئے۔

رات ساڑھے سات بجے پاکستانی سفارت خانے نے پاکستان ڈے منانے کے سلسلے میں دعوت دے رکھی تھی۔ فاروق تارڑ ہمیں ایک عظیم الشان ساٹھ منزلہ فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گئے۔ جہاں اس پروقار دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہوٹل کی تزئین و آرائش' آرکیٹیکچرل بیوٹی اور معیار تعمیر اس قدر نفیس اور دلاویز تھا کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ یہ ساٹھ منزلہ Twin Towers کی پرشکوہ عمارتیں ہیں۔ ایک میں ایمی ریٹس ائر لائن کے دفاتر ہیں۔ اور دوسری میں عالیشان فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ یہ دونوں عظیم الشان قوی ہیکل عمارتیں دبئی کے حکمران شیخ محمد نے اپنی ذاتی دلچسپی اور شوق سے بنوائی ہیں۔ اور ان کثیر المقاصد منصوبے کے تمام اخراجات اپنی گرہ خاص سے ادا کئے ہیں۔ یہ الٹرا ماڈرن اور عجیب و غریب طرز تعمیر کا لاجواب شاہکار ہے۔

ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئے۔ تو حیرت انگیز فرحت اور سحر آمیز تاثر کا احساس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے الف لیلیٰ کی کسی طلسمی سرزمین میں داخل ہو گئے ہیں۔ اوپر دیکھا تو چھت بہت زیادہ اونچائی اور بلندی کی وجہ سے کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔ لونج کی حسین و جمیل سجاوٹ' فرش کے دیدہ زیب ڈیزائن اور بے نظیر لے آؤٹ' دنیا کے چوٹی کے آرکیٹیکٹوں کے کمال آفریں اور شاہکار کارناموں کی منہ بولتی تصویر نظر آئی۔ اس مرصع

اور نفاست سے آراستہ ہال میں پانچ شیشوں سے بنی ہوئی لفٹیں اوپر نیچے آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں- یہ لفٹیں اس لونج کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث تھی-

ہمیں ان نرالی اور پرکشش لفٹوں میں بیٹھنے کا اشتیاق ہوا- تو ہم خود بخود بے اختیار ہو کر لفٹوں کے دروازوں کی طرف بڑھ گئے- لفٹ میں سوار ہوئے تو وہ بڑی سرعت اور تیزی سے اوپر اٹھنے لگی- لفٹ کی اسپیڈ اتنی زیادہ تھی کہ لفٹ کے شیشوں کی دیوار سے باہر دیکھنا بڑے حوصلہ کا کام تھا- لفٹ ساٹھویں منزل پر تیس سیکنڈ میں پہنچ گئی- اور ہم لوگ باہر نکل کر برآمدے میں آ گئے- ہوٹل کی ایک سائیڈ کی دیوار پورے شیشے کی بنی ہوئی ہے- اور اوپر سے باہر کا منظر بڑا صاف اور شفاف نظر آتا تھا- اوپر سے دور ٹریفک کاروں کی لمبی قطاریں چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں دکھائی دیتی تھی- بہرحال نیچے دیکھنے سے ایک عجیب سے خوف اور ڈر کا احساس ہوتا ہے- لونج کی طرف والے برآمدے سے نیچے جھانکنا چاہا- تو جی متلانے لگا- اور ہم لوگوں نے عافیت اسی میں خیال کی کہ فوراً" نیچے چلے جائیں-

اس ہوٹل میں عام کمرہ دس ہزار روپے روزانہ پر مل سکتا ہے- لیکن اسپیشل روم اور پریذیڈینشل سوئٹ 50 ہزار سے دو لاکھ روپے روزانہ تک مل سکتا ہے- آپ حیران نہ ہوں- دبئی میں جمیرہ بیچ پر واقع "برج العرب ہوٹل" میں دس لاکھ روپے روزانہ کا کمرہ بھی دستیاب ہے- جہاں عرب کے شیوخ، شہزادگان اور بڑے بڑے بزنس ٹائیکون ہی ٹھہرتے ہیں- اس ہوٹل کے نیچے ایک بہت بڑا اور مہنگا شاپنگ سنٹر ہے- جس کو لفٹوں اور Escalators کے ذریعہ ملایا گیا ہے- اس شاپنگ آرکیڈ کی دوکانوں یا شاپس پر عام گاہک کا پہنچنا بعید از قیاس ہے- یہاں تو شہزادگان، عرب شیوخ، بڑے صنعتکار، ہالی ووڈ کے ایکٹرز، ایکٹریسز اور ارب پتی تاجر ہی شاپنگ کر سکتے ہیں- ہم تو ان دوکانوں کی شان و شوکت، تزئین و آرائش، سامان کے خوبصورت انداز ڈسپلے سے اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ اشیاء برائے فروخت کی قیمتوں کے بارے میں استفسار بھی کرنا مناسب خیال نہ کیا-

پاکستانی ریسیپشن (Reception) بڑی پربہار اور دلفریب تھی- ہوٹل کا زیریں منزل پر واقع یہ مرصع اور خوبصورت ہال معزز اراکین دبئی حکومت وزراء، دیگر ممالک کے سفراء، مشہور صنعتکار، تاجر اور پاکستان کی دبئی میں مقیم اہم شخصیات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا- ہوٹل کے باوردی اور باادب ویٹرز اور ویٹریسز معزز مہمانوں کو گھوم پھر کر مشروبات، اسنیکس، ٹکہ بوٹی اور سیخ کباب پیش کر رہی تھیں- ہال میں جگہ جگہ میزوں پر پستہ، بادام، کاجو اور

زیتون کے دانوں سے بھری ہوئی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں- ہال کی ایک جانب دیوار پر پاکستان کے بارے میں محکمہ اطلاعات اور پاکستانی ٹیلیویژن پر ڈاکو منڑی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں- پاکستان کے سفیر متعینہ متحدہ عرب امارات اور دیگر عملہ سفارت مہمانوں سے فرداً" فرداً" مل کر ان کی اس تقریب سعید کے پرمسرت موقعہ پر شرکت کرنے اور اسے رونق بخشنے کے لئے شکریہ ادا کرنے میں مصروف تھے- تھوڑی دیر بعد مہمان جانے شروع ہو گئے- اور باقی شرکاء مختلف ٹولیوں اور گروپوں میں اپنی من پسند شخصیات سے تبادلہ خیال کرنے میں مصروف رہے- بہرحال یہ ریسیپشن ہر لحاظ سے کامیاب اور پروقار تھی- ایک گھنٹہ وہاں ٹھہر کر ہم بھی وہاں سے چلے آئے- اب مسٹر فاروق تارڑ ہمیں رات کے کھانے پر لیجانا چاہتے تھے- مگر ہم نے معذرت کر لی- کیونکہ اسنیکس وغیرہ کھانے کے بعد ڈنر کی قطعاً" گنجائش نہ تھی-

اس لئے فاروق تارڑ ہمیں فلیٹ پر چھوڑ کر چلے گئے-

اگلی صبح 8 بجے خواجہ محمد یونس نے واپس لندن جانے کے لئے Royal Jordanian Air Line کی پرواز پکڑنی تھی- اس لئے سوموار 26 مارچ کی صبح چھ بجے P.K. انہیں ائیرپورٹ چھوڑنے چلا گیا- خواجہ محمد یونس کی روانگی کے بعد ہمیں اداسی نے گھیر لیا- پچھلے آٹھ دن ان کی بذلہ سنج اور ہنس مکھ طبیعت کی وجہ سے بڑے پرلطف اور پرمسرت گزرے تھے- ان کی خوش و خرم اور مزاح سے بھرپور رفاقت کی وجہ سے ہمارا دورہ دبئی بڑا خوشگوار اور بہترین تفریح کا آئینہ دار رہا- اب خواجہ محمد یونس ہمیں اداس چھوڑ کر لندن چلا گیا تھا- اگلے روز ہماری بھی پاکستان واپسی تھی- مگر یہ چوبیس گھنٹے گزارنا اب خاصا مشکل دکھائی دیتا تھا- اس دن کوئی قابل ذکر فلم کسی سینما میں چل نہیں رہی تھی، شاپنگ ہم کر نہ سکتے تھے، کسی قابل دید مقام کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہ تھی- P.K. کی لگاتار اور پیہم گفتگو سن سن کر ہم عاجز آ چکے تھے- اس لئے یہی مناسب خیال کیا کہ P.K. کو بھیج کر نزدیک ترین میکڈانلڈ یا کینٹکی فرائڈ چکن سے Take Away منگوا کر گزارا کر لیا جائے- اور پھر خواب غفلت میں کھو کر اپنی تھکاوٹ اور اداسی سے چھٹکارا حاصل کر لیں- چنانچہ یہ ترکیب بڑی عمدہ تھی- اس لئے کارگر ثابت ہوئی-

اب دبئی میں ہماری یہ آخری رات تھی- اس لئے ہم نے P.K. کو جلدی گھر بھیج دیا- تاکہ اگلے دن وہ دس بجے تک آ جائے- وہ ہمیں چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا- لیکن ہم نے سمجھا

بجھا کر اسے راضی کر لیا۔ اور وہ صبح وقت پر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

رات کو فاروق تارڑ آ گئے۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر جمیرہ بیچ کے ایک مشہور ریسٹوران "چکن کلہ ان" لے گئے۔ یہ ریسٹوران بھی دبئی کے مشہور و معروف چین (Chain) یعنی سلسلہ کا مین ریسٹورانٹ تھا۔ مینو کارڈ دیکھا۔ تو اس میں چکن کی بے شمار ورائٹیز درج تھیں۔ بہرحال ہم نے اپنی صوابدید کے مطابق تین مختلف آئٹموں کا آرڈر دے دیا۔ کھانا بڑا لذیذ اور ذائقے دار تھا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ایک امریکن آئس کریم کے شہرہ آفاق چین "رابن یا سکن" کے پالر میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی۔ یہ بہترین کوالٹی کی آئس کریم تھی۔ جو بڑی Tasty تھی۔ رات کو دبئی کی چکا چوند روشنیوں سے نہائی ہوئی شاہراہوں سے ہوتے ہوئے فاروق تارڑ ہمیں ہمارے فلیٹ پر پہنچا کر چلے گئے۔

فاروق تارڑ نے اس مرتبہ ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ میاں فاروق کی عدم موجودگی کا ہمیں زیادہ احساس نہ ہونے دیا۔ جن کے ہم دل سے احسان مند اور ممنون ہیں۔

اگلے روز پی۔ کے ساڑھے نو بجے ہی آ گیا۔ ہم نے اپنا سامان پیک کر رکھا تھا۔ اور دوپہر بارہ بجے پی۔ کے نے سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ نیچے گئے تو فاروق تارڑ ہمیں الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کی بے مثال مہمان نوازی اور اپنے انتہائی قیمتی وقت سے نوازنے کا شکریہ ادا کیا۔ تو وہ حسب معمول مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ ان کا فرض تھا۔ پھر ان سے مل کر ہم لوگ دبئی ایئر پورٹ پر چلے آئے۔ گاڑی سے سامان اتار کر پی۔ کے ہمیں الوداعی سلام کہہ رہا تھا۔ اور ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈیپارچر لونج میں چلے گئے۔

گھر آیا مہمان

مہمان کا کسی گھر میں آنا برکتوں کا نزول ہوتا ہے' جس گھر میں مہمانوں کی ریل پیل ہو' وہاں رزق کی کمی نہیں ہوتی۔ مہمان رحمت کا فرشتہ ہوتا ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ مہمان اپنے ہی مقدر کا کھاتا ہے۔ مہمان بن بلایا ہو' یا "مان نہ مان' میں تیرا مہمان" ہو' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ لوگ جو مہمان کو بلائے جان تصور کرتے ہیں' بڑے بدذوق اور بدنصیب ہوتے ہیں۔ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ مہمان نوازی میں کس قدر لطف' راحت اور سکون ملتا ہے۔

مہمان نوازی اگرچہ عربوں کی مشہور ہے مگر مہمان ہمارے ملک کے شہرہ آفاق ہیں۔ مہمان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جانے کے لئے آتا ہے مگر یہ ضرب المثل ہمارے ملک کے مہمانوں پر صادق نہیں آتی۔ کیونکہ یہاں بیشتر مہمان ایک دفعہ آ کر اہل خانہ کی بے مثال میزبانی سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے اور میزبان دن کے چین اور رات کے سکون سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسی قسم کا ایک مہمان کسی بدنصیب کے ہاں اچانک وارد ہوا۔ اہل خانہ نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ خوب خدمت تواضع کی۔ ہر قسم کی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کیں۔ مہمان اپنے مہربان اور مشفق میزبان کے اعلیٰ حسن سلوک' لاجواب خاطر مدارت اور پر تکلف مہمان نوازی سے اتنا متاثر ہوا کہ واپس جانے کا پروگرام ہی منسوخ کر بیٹھا۔ دن تو دن' ہفتے گزر گئے۔ مہمان براجمان رہا۔ اہل خانہ کی تشویش بڑھتی گئی۔ ان کے لئے یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ مہمان کبھی رخصت بھی ہو گا یا نہیں۔ آخر ایک دن قدرت اور مہمان دونوں مہربان ہوئے۔ معزز مہمان نے انتہائی انکساری سے میزبان پر انکشاف کیا کہ وہ چند روز ٹھہر کر واپسی کا پروگرام بنائے گا۔ یہ سن کر میزبان نے سر تھام لیا اور سخت احتجاج کے انداز میں کہنے لگا---- "ایسا نہیں ہو سکتا۔ کم از کم میری زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

مہمان یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوا اور میزبان کے خلوص' حسن سلوک اور شرافت کا تذکرہ کرتے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں کہنے لگا---- "آپ گھبرائیں نہیں- میں پھر آ جاؤں گا"---- میزبان پرجوش انداز میں بولا---- "خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہو گا- آپ پھر نہیں آئیں گے"---- مہمان سخت حیرت زدہ ہوا اور کہنے لگا---- "آپ مجھ پر یقین کریں- میں ضرور واپس آؤں گا"---- میزبان نے جواب دیا---- "یقین کیسے کروں- میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آپ یہاں سے جائیں گے ہی نہیں' تو واپس کیسے آئیں گے-"

ایک صاحب ذوق جب کبھی کسی کے گھر جاتے تو وہاں سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے- ایک مرتبہ انہیں کسی بزرگ کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا- خاصی رات بیت گئی- باتوں کا سلسلہ اور مہمان نوازی کی رسومات کب کی ختم ہو چکی تھیں' مگر حضرت مہمان ڈٹے بیٹھے تھے- صاحب خانہ نے جب مہمان کی مستقل مزاجی اور صبر آزما بیٹھنے کا ڈھنگ دیکھا تو اپنے بڑے لڑکے کو آواز دی- لڑکا جب آیا تو اہل خانہ نے اسے مکان کی رجسٹری اندر سے لانے کو کہا- مہمان یہ انوکھی فرمائش سن کر بول اٹھا---- "چودھری صاحب اتنی رات گئے رجسٹری کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟" صاحب خانہ نے برجستہ جواب دیا---- "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مکان کے مالک آپ ہیں یا میں- اگر آپ ہیں تو میں چلتا ہوں-"

اہل ثروت میزبانوں کے لئے کسی مہمان کو مستقل طور پر اپنے ہاں رکھنا گوارا ہو سکتا ہے مگر غریب میزبانوں کے پلے اگر کوئی ایسا مہمان پڑ جائے' تو وہ بیچارہ زندگی سے عاجز آ جاتا ہے اور مہمان بلائے جان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کر گزرتا ہے- کسی میراثی کے پیر صاحب معہ اپنے تین عدد مریدوں کے اس کے گھر مہمان اترے- میراثی اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر ان کی خدمت تواضع کرتا رہا اور چند ہی روز میں قلاش ہو گیا- اب میراثی میزبان کے پاس مہمانوں کی خاطر مدارت کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی' مگر مہمان تھے کہ جانے کا راستہ ہی بھول چکے تھے- چنانچہ ایک دن میراثی نے سخت عاجز آ کر اپنے پیر صاحب سے مئودبانہ دریافت کیا---- "حضور' اب آپ کا مزید قیام ہو گا یا کوچ؟" پیر صاحب نے بڑے مشفقانہ انداز میں جواب دیا---- "بیٹا' ابھی کچھ روز اور قیام ناگزیر ہے-" میراثی کہنے لگا---- "بہت بہتر حضور! ہمارا پھر آج کوچ ہے-"

"جان نہ پہچان میں تیرا مہمان" قسم کے مہمان ہمارے ملک میں خاص اہمیت کے حامل

ہوتے ہیں- ایسے مہمان جہاں دل چاہے' جب دل چاہے پہنچ جاتے ہیں- صاحب خانہ کے ساتھ رشتہ ناطہ یا کوئی تعلق واسطہ پیدا کر لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے- میزبان ابھی ان کی شناخت کا مسئلہ ہی طے کرنے کے چکر میں ہوتا ہے اور وہ پور طرح بطور مہمان آباد ہو چکے ہوتے ہیں-

کہتے ہیں کہ موت کی طرح مہمان کے آنے کا کوئی وقت معین نہیں ہوتا اور نہ ہی مہمان کے آنے کا کوئی خاص سگنل یا نمایاں اشارہ ہوتا ہے- پرانے وقتوں میں کوے میزبان کی منڈیر پر مہمان کی آمد کا اعلان قبل از وقت کر دیا کرتے تھے اور میزبان پوری طرح چوکنا ہو کر مہمان کا منتظر رہتا تھا- مگر سائنس کے اس جدید دور میں کووں کو پتہ ہی نہیں چلتا اور مہمان آ ٹپکتا ہے- سردی' گرمی' بارش' آندھی اور طوفان بھی مہمان کی آمد کو نہیں روک سکتے- مہمان جب چاہے آ سکتا ہے اور اپنے چہیتے میزبانوں کو شرف میزبانی کی لذت سے ہمکنار کر دیتا ہے- مہمان کو کہیں آنے جانے کے لئے کسی معقول عذر' بہانہ یا جواز تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی- بس اس کا منزل مقصود پر پہنچ جانا ہی کافی ہوتا ہے-

شادی' بیاہ یا منگنی کی کوئی تقریب ہو' کسی بوڑھے' جوان یا بچے کی اتفاقی' حادثاتی یا طبعی موت واقع ہو جائے' کسی نومولود کی آمد' عقیقہ یا ختنہ کی رسم ہو' اہل خانہ میں سے کوئی بیمار پڑ جائے' کوئی بچہ امتحان میں کامیاب ہو یا اسے ملازمت مل جائے یا کوئی شخص حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے واپس آیا تو مہمانوں کو دھاوا بولنے کا نادر موقع مل جاتا ہے وہ بغیر اطلاع آنا شروع ہو جاتے ہیں- اہل خانہ خوشی یا غم مکمل طور پر فراموش کر کے مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہو جاتا ہے اور اسے سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں ملتی- غریب میزبان تو ایسے حالات میں اکثر یہ سوچتا ہے' کاش وہ خود ہی اللہ کو پیارا ہو گیا ہوتا اور اسے ایسی بے بسی اور بے چارگی سے واسطہ نہ پڑتا-

ایک غریب مزدور کا دو سالہ پوتا فوت ہو گیا- اس کے عزیز و اقارب دور دور سے اس کے غم میں شریک ہونے کے لئے آ گئے- اہل خانہ کو پوتے کے دفن کرنے سے زیادہ فکر اپنے مہمانوں کی تھی کہ انہیں کیا کھلائے گا- مہمانوں کے پیٹ کو ایندھن مہیا کرنے کے لئے اس نے اپنی تمام جمع شدہ پونجی لٹا دی اور بال بال قرض میں پھنس گیا- مگر مہمان پھر بھی رخصت نہ ہوئے- میزبان سخت تنگ آ چکا تھا- آخر خودکشی کی ناکام کوشش میں سزا پا کر جیل چلا گیا اور مہمانوں سے چھٹکارا حاصل کیا-

بیمار پرسی کے لئے جو مہمان آتے ہیں' ان کے انداز و اطوار بڑے ہی دلچسپ اور عجیب ہوتے ہیں- مریض کو خاموش لیٹے دیکھ کر اس کی تکلیف کا اندازہ لگاتے ہیں- پھر پاس بیٹھے ہوئے لواحقین سے انتہائی راز داری سے دریافت کریں گے---- "کیا مریض بول سکتا ہے؟ کچھ کھاتا پیتا ہے؟ ایسی کیفیت کب سے ہے؟"____ اکثر مہمان تو مریض کو کندھے سے پکڑ کر اچھی طرح سے جھنجھوڑتے ہوئے اس سے حال معلوم کرتے ہیں- پھر چند ایک روائتی سوالات پوچھ کر وہ حکیم یا ڈاکٹر کا روپ دھار لیتے ہیں اور مریض کے لئے نسخے تجویز کرنا شروع کر دیتے ہیں-

اگر پیچیدہ بیماری اور تکلیف کے پیش نظر معالج نے کسی بدنصیب مریض کو مکمل آرام کا مشورہ دے رکھا ہو تو کیا مجال کہ مہمان اسے ایک لمحہ بھی سکون سے گزارنے دیں- مریض اور اس کے لواحقین کی حالت اس وقت بے حد قابل رحم ہوتی ہے اور وہ مہمان کا ادب و احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دل پر جبر کر کے سب کچھ برداشت کرتے ہیں- مہمان عورتیں تو اس معاملے میں کہیں زیادہ پریشانی کا باعث بنتی ہیں- مریض کی حالت زار دیکھ کر فوراً" فتویٰ صادر کر دیتی ہیں---- "چونکہ کرملی کا بیٹا تھو اسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر دسویں روز چل بسا تھا- لہٰذا خدا بخش کا بچ رہنا بھی ممکن نہیں-" پھر دوسری مایوس کن باتیں کر کے مریض اور اس کے لواحقین کی ایسی دل شکنی کریں گی کہ موت سے پہلے ہی سوگواری کا عالم طاری ہو جاتا ہے-

ہمارے معاشرے میں اکثر بزرگ اپنی ضد' ہٹ دھرمی اور تلخ مزاجی کے باعث تمام گھر والوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں- ایسے حالات میں ان کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جانا لازمی ہوتا ہے- ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں تسبیح لئے گھر کو خیرباد کہتے ہیں اور بقایا عمر عزیز کا بیشتر حصہ بطور خاص مہمان دوسروں کے ہاں گزار دیتے ہیں- وہ جہاں کہیں بھی مہمان ٹھہریں' بڑی مستقل مزاجی سے ڈٹ جاتے ہیں- انہیں واپسی کی کوئی جلدی تو ہوتی نہیں' لہٰذا بڑے صبر و سکون سے میزبانوں کے اعصاب پر سوار رہتے ہیں-

بے تکلف مہمانوں کی ایک قسم خاص طور پر قابل ذکر ہے- وہ میزبان کے ساتھ ایسی بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں کہ میزبان سر پکڑ کر رہ جاتا ہے- ایسے مہمان چونکہ خوش خوراک ہوتے ہیں' اس لئے وہ اکثر ڈاکٹر کی ہدایت یا موسم کا سہارا لے کر انوکھے اور مہنگے پسندیدہ کھانوں کی فرمائش بڑی ڈھٹائی سے کرتے ہیں- میزبان ایسے مہمانوں کی ناز برداریاں

اٹھاتے ہوئے ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے-

کئی کفایت شعار لوگ اپنے اخراجات کے بوجھ سے بچنے کے لئے اپنے عزیز رشتہ داروں کے ہاں بحیثیت مہمان چلے جاتے ہیں اور چند روز مزے اور سکون میں گزار آتے ہیں- اس قسم کا مہمان ایک ہندو بنیا نندہ تھا- اس نے سوچا کہ چند روز عزیزوں کے ہاں گزار آئے- اس طرح اس کے اخراجات بھی بچیں گے- آرام اور سکون بھی میسر آئے گا- چنانچہ وہ پورے نو دن اپنے رشتہ داروں کے ہاں ٹکا رہا' اور ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتا رہا- دسویں روز وہ اپنے گھر کو لوٹا تو تھوڑی دیر بعد اس کے گھر نو مہمان آ گئے- نندہ بے ساختہ بول اٹھا:

نندہ گیا نو دن نو نندے کے گھر
گھر آ کے کیا حساب نندہ گھر کا گھر

ایک چوہدری چند دوستوں اور گاؤں کے میراثی کے ہمراہ کسی غریب مزارعے کے ہاں گیا- مزارع اتنے مہمان دیکھ کر گھبرا گیا- مگر ظاہری طور پر بڑی خوشی کا اظہار کرنے لگا- مہمانوں کی خاطر مدارت کے لئے اس نے دو سیر دودھ پڑوس سے حاصل کیا- اس دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر چینی ملانے لگا- ابھی دودھ میں چینی ملا رہا تھا کہ چند مہمان اور آ گئے- غریب مزارعے نے نلکے سے کچھ اور پانی دودھ والے برتن میں ملا دیا- پھر اپنے مہمانوں کو پلانے لگا- ابھی وہ مہمانوں کو دودھ کی لسی پلا رہا تھا کہ تین مہمان اور آ گئے- اس نے نلکے سے اور پانی ڈال لیا اور مہمانوں کو پلانے لگا- میراثی کے علاوہ تمام مہمان لسی پی چکے تو میراثی کے لئے بہت تھوڑی لسی بچی- میزبان نے تھوڑا سا اور پانی ملا کر ایک گلاس میراثی کو پیش کیا- میراثی جو نلکے کے قریب ہی بیٹھا تھا اور پانی کی کاروائی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا' فوراً" بول اٹھا---- "جہمان مولا خوش رکھے' مجھے وہ بھینس تو دکھاؤ جس کا دودھ لائے تھے-" مزارع نے حیران ہو کر پوچھا---- "بھینس دیکھ کر کیا کرو گے؟"____ میراثی نے جواب دیا---- "خدا شاہد ہے' میری آنکھوں کے سامنے نلکے کا پانی ختم ہو گیا ہے' مگر لسی کی سفیدی ابھی باقی ہے-"

کئی میزبانوں کے لئے مہمانوں کی آمد باعث مسرت ہوتی ہے اور وہ بڑے جوش و خروش اور عقیدت سے مہمانوں کی آمد کا انتظار کرتے ہیں- ایسے ہی ایک سکھ میزبان بڑا بن

ٹھن کر مہمانوں کے آنے کا منتظر تھا اور اپنے مکان کے باہر تھڑے پر ٹہل رہا تھا کہ اس کا ایک دوست قریب سے گزرا۔ اور پوچھنے لگا۔۔۔۔

"سردار جی! صبح صبح یہ بوسکی کی قمیض اور سرخ نکٹائی لگا رکھی ہے۔ کہاں کے ارادے ہیں؟"

"امرتسر سے مہمان آ رہے ہیں۔" سکھ نے جواب دیا۔

"لیکن نیچے آپ نے صرف کچھا پہن رکھا ہے۔" دوست نے کہا۔۔۔۔ "پتلون کیوں نہیں پہنی؟"

سکھ نے جواب دیا۔۔۔۔ "ہو سکتا ہے مہمان نہ ہی آئیں۔"

اکثر لوگ ایرے غیرے نتھو خیرے قسم کے مہمانوں کی آمد کو پسند نہیں کرتے۔ اور اگر ان کے ہاں کبھی اتفاق سے کوئی ایسا مہمان آ جائے تو وہ اس کی خاصر تواضع سے اجتناب کرتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک میزبان کے گھر کوئی مہمان آیا تو چھوٹے بچے سے مہمان کے آنے کی اطلاع پا کر اہل خانہ کا موڈ خراب ہو گیا۔ بچے سے پوچھنے لگا۔۔۔۔ "کون بدبخت ہے؟" بچے نے کہا۔۔۔۔ "ابو وہی ہے جو پچھلی بڑی عید کے موقعہ پر ہمارے گھر سے بھوکا واپس گیا تھا۔" میزبان فوراً" بولا۔۔۔۔ "نہ جانے ایسے بے حیا لوگوں کو شرم کیوں نہیں آتی۔ ایک مرتبہ ان کی خدمت تواضع کر دو تو وہ روز ہی آ ٹپکتے ہیں۔"

بعض موقعہ شناس مہمان ٹھیک دوپہر یا شام کے کھانے کے وقت آ دھمکتے ہیں اور اپنے مقدر کا حصہ کھا کر ہی ٹلتے ہیں۔ دوسری طرف کئی میزبان اتنے ہوشیار اور سمجھدار ہوتے ہیں کہ مہمان کا ماتھا دیکھ کر پڑھ لیتے ہیں کہ ان کے گھر کے کھانے پر اس کی مہر نہیں لگی ہوئی۔ اس لئے وہ منشائے ایزدی پورا کرنے کے لئے خود بھی اتنی دیر کھانا نہیں کھاتے جب تک مہمان رخصت نہ ہو جائے۔

ہماری بیاہ شادیوں کی دعوتوں میں دو تین فیصد مہمان ایسے ہوتے ہیں جنہیں لڑکے والوں نے مدعو کیا ہوتا ہے نہ لڑکی والوں نے۔ اور وہ دونوں گھروں کے مدعوئین میں شامل ہو کر اور اپنا مطلب نکال کر رفو چکر ہو جاتے ہیں اور کسی کو ان کی شاندار کارگزاری پر شک تک نہیں گزرتا۔

کئی مہمان معدہ یا صحت کمزور ہونے کے باوجود اپنی حریص اور لالچی طبیعت کی وجہ سے زیادہ کھا لیتے ہیں اور بعد میں انہیں اچھی خاصی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان کا پیٹ

تو بھر جاتا ہے مگر آنکھوں کی بھوک نہیں مٹتی۔ ایک پروفیسر صاحب جو معدے کے دائمی مریض تھے' ایک رات کسی شادی کی تقریب میں تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنی حریص نگاہوں کو مطمئن کرنے کی خاطر روسٹ مرغ' چکن بریانی' نرگسی کوفتے اور نہ جانے کیا کیا اپنے پیٹ میں اتار لیا۔ رات وہ اپنے ایک جاننے والے کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ انہیں ایک علیحدہ کمرہ دیا گیا جس کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ رات کو دو بجے پروفیسر صاحب کے پیٹ میں گڑبڑ ہو گئی۔ انہوں نے سوچا اتنی رات گئے صاحب خانہ کو جگانا مناسب نہیں۔ لہٰذا وہ دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکل گئے۔ اور قریب ہی کھڑے ایک تانگے کے نیچے بیٹھ گئے۔ پاس ہی لیٹے ہوئے تانگے والے کی چھٹی حس بیدار ہو گئی اور اس نے چور چور کا شور مچا دیا۔ پروفیسر صاحب تانگے والے کا واویلا سن کر حواس باختہ ہو گئے اور پاجامہ ہاتھ میں تھامے بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئے اور اندر سے کنڈی لگا دی۔

تانگے والے نے پیچھا کیا اور دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔ پروفیسر صاحب بدحواسی کے عالم میں ایک کونے میں کھڑے کانپ رہے تھے۔ اتنے میں میزبان باہر تشریف لے آئے اور تانگے والے سے اس قدر بے ہنگم شور مچانے کی وجہ پوچھی تو تانگے والے نے بتایا کہ ایک چور میرے تانگے کے قابلے اتار رہا تھا۔ میرے آواز دینے پر بھاگ کر آپ کے گھر میں داخل ہو گیا ہے۔ اہل خانہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ انہوں نے تانگے والے کو یقین دلایا کہ اسے دھوکا ہوا ہے اور ان کے مہمان ایسے نہیں۔ تانگے والا اس یقین دہانی سے مطمئن ہو کر معذرت کرتا ہوا چلا گیا۔

کچھ گھروں میں دستور ہے کہ جب ایسا مہمان پلے پڑ جائے جو واپس جانے کا نام ہی نہ لے تو میزبان میاں بیوی آپس میں لڑنے لگتے ہیں تاکہ مہمان اس بدمزگی سے تنگ آ کر بوریا بستر گول کر لے۔ یہ ترکیب اکثر کامیاب رہتی ہے مگر بعض ڈھیٹ قسم کے مہمان اس کا قطعاً" کوئی اثر نہیں لیتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ چند برس پہلے ہمارے پڑوس میں پیش آیا تھا۔ ایک پرلے درجہ کا ڈھیٹ مہمان ان پڑوسیوں کے ہاں قیام پذیر ہوا۔ ہفتہ عشرہ گزر گیا مگر مہمان ایسا سیٹ ہوا کہ واپس جانے کا نام تک نہ لیتا تھا۔ میزبانوں نے مہمان کو بھگانے کے لئے روزانہ آپس میں لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ مہمان نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ ایک روز میاں بیوی نے بڑی مضحکہ خیز جنگ لڑی۔ مہمان نے دونوں میزبانوں کو بہت سمجھایا اور آئندہ جھگڑا کرنے سے باز رہنے کی سخت تلقین کی۔ میزبانوں نے جب بازی الٹتے دیکھی تو بہت

سٹپٹائے اور مہمان سے کہنے لگے کہ ہمارے لڑائی جھگڑے کی اصل وجہ گھر کے اخراجات ہیں جو آپ کی موجودگی کے باعث ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکے ہیں۔ یہ سن کر مہمان مسکرایا اور بڑی شفقت سے کہنے لگا۔ "لیکن اب میرا یہاں سے جانا اس لئے بھی مناسب نہیں کہ آپ پھر لڑنے لگیں گے۔ اگر میں یہاں نہ ہوا تو آپ کی صلح کون کروائے گا۔"

مہمان اگر شریر بچوں کی صورت میں وارد ہوں تو اللہ پناہ دے۔ میزبان کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک میاں بیوی کے قریبی رشتہ داروں نے اپنے چار بچے ان کے ہاں ایک ماہ قیام کرنے کے لئے بھیجے۔ وجہ روانگی بچگان یہ بتائی کہ ہمارے شہر میں چیچک کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ بچے آپ کے پاس بھجوا رہے ہیں کہ وہ چیچک جیسے موذی مرض سے محفوظ رہیں۔ میاں بیوی نے چاروں بچے اپنے پاس رکھ لئے۔ تیسرے روز مہمان بچوں کے والدین کو میزبان میاں بیوی کا تار موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا:

"ہم آپ کے بچے واپس بھجوا رہے ہیں۔ برائے کرم چیچک کی وبا ادھر بھیج دیں۔"

بعض مہمانوں کو چوری کی بھی عادت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایک ایسے مہمان سے دو ماہ ہوئے واسطہ پڑا تھا۔ حسن اتفاق تھا کہ اس دوران میرے ہاں مہمانوں کا خاصا جمگھٹا رہا۔ میں مہمانوں کی ناز برداریوں میں مصروف تھا اور کوئی معزز مہمان "گھر آیا مہمان" کا مسودہ ہی لے اڑا' جو میں ایڈیٹر "حکایت" کو بغرض اشاعت بھیجنے والا تھا۔ میں نے اس چور مہمان کا کھوج لگانے کی بہت جدوجہد کی۔ آنے والے تقریباً تمام مہمانوں سے فرداً فرداً گمشدہ مسودے کے متعلق استفسار کیا مگر سبھی نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ آخر مایوس ہو کر یہ مضمون دوبارہ لکھنے لگا اور اس طرح "حکایت" کے صفحات سے پورے دو ماہ کی غیر حاضری ہو گئی۔

اب میں بے حد محتاط ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے گھریلو ملازم کو ہدایت کر دی ہے کہ آئندہ وہ کسی بھی مہمان کو اتنی دیر تک واپس نہ جانے دے جب تک اس کی اچھی طرح سے تلاشی نہ لے لی جائے۔

○

جوہری
پتھروں کا سوداگر

چند روز ہوئے میرا گزر کالج روڈ گوجرانوالہ سے ہوا' ٹریفک کا خاصا رش تھا۔ اس لئے میرا ڈرائیور گاڑی بہت آہستہ چلا رہا تھا۔ جب میں اسلامیہ کالج کے صدر دروازے کے سامنے پہنچا تو کالے رنگ کی ایک چمکدار اور خوبصورت نئے ماڈل کی مرسیڈیز E_500 ہمارے آگے سے گزری۔ مرسیڈیز کی اگلی سیٹ پر باوردی ڈرائیور کے ساتھ باوردی گن مین بیٹھا نظر آیا۔ اور پچھلی نشست پر ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس بزرگ کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے مجھے سلام کہتے ہوئے رکنے کا اشارہ دیا۔ تو میرے ڈرائیور نے کار وہاں ایک سائیڈ پر کھڑی کر لی۔ اتنے میں ان کی کار بھی رک گئی۔ اور وہ بزرگ بھی گاڑی سے اتر کر میری طرف آ گئے۔ علیک سلیک کے بعد میری خیریت دریافت کرنے لگے۔ مجھے ان کی شکل و صورت بڑی مانوس سی لگی۔ مگر یاد نہ آ رہا تھا کہ انہیں کہاں دیکھا ہے۔ اسی دوران وہ میری ذہنی کیفیت بھانپ کر کہنے لگے۔

بزرگ: آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں۔

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ تو وہ کہنے لگے۔

بزرگ: میں تمہارا پرانا ہم جماعت سرور سعید بٹ ہوں۔

یہ سن کر بھی میں اس الجھن سے نجات حاصل نہ کر پایا۔ تو انہوں نے کہا۔

سرور سعید بٹ: میں عزیز صاحب آپ کو آخری مرتبہ 1986ء میں ترکی کے شہر استنبول میں ملا تھا۔ (یہ الفاظ سنتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ اور اسے کہا۔)

میں۔ معاف کرنا مجھے آپ کی سفید ریش نے دھوکا دیا ہے۔

بہرحال میں اس کی انتہائی قیمتی کار' باوردی ڈرائیور اور گن مین' عمدہ اور نفیس لباس' ظاہری طمطراق اور شان و شوکت دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔ میرے لئے حیرانگی کی بات یہ تھی کہ میں جس ہم جماعت سرور سعید بٹ کو جانتا تھا۔ وہ تو اول نمبر کا کڑکا' نوسرباز اور چکر

باز لڑکا ہوتا تھا۔ آج اس کی یہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے میں نے بجلی کے کسی تار کو اچانک چھو لیا ہو۔ وہ میری حیرت کو بھانپ کر کہنے لگا۔

سرور سعید بٹ : میں بیرون ممالک میں عرصہ دراز تک زندگی کے دن گزار کر واپس وطن لوٹ آیا ہوں۔ اور کہا کہ میں نے گلبرگ III لاہور میں چار کنال کی ایک کوٹھی خرید لی ہے۔ اور لبرٹی مارکیٹ لاہور کے پاس ایک تین منزلہ شاندار عمارت خرید کر اس میں گراؤنڈ فلور پر ہیرے جواہرات کا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ اور یہیں پہلی منزل پر اپنا دفتر قائم کر دیا ہے۔ آپ کسی دن لاہور تشریف لائیں۔ اور مجھے شرف میزبانی بخشیں۔ پھر اس نے مجھے اپنا Visiting Card بھی دیا اور تاکید کی میں لاہور جا کر ان کے پاس ٹھہروں۔ میں نے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے میرے متعلق کئی سوالات پوچھ ڈالے۔ مثلاً آجکل آپ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں رہائش پذیر ہیں؟ فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز کی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں یا نہیں؟ بھابھی اور بچے کیسے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے بتایا کہ آجکل ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔

سرور سعید بٹ کے اس انوکھے اور حیرت انگیز انکشاف نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہیرے جواہرات کا کاروبار کرنے کے لئے تو کروڑوں روپے درکار ہوتے ہیں۔ اسے اتنی بڑی رقم کیسے ہاتھ لگی؟ بچپن میں بیشک وہ شوقیہ طور پر ہیروں اور جواہرات کا ذکر بڑی رغبت اور دلچسپی سے کیا کرتا تھا۔ پھر کالج میں پہنچ کر وہ اکثر ہیرے، زمرد، عقیق، الماس، فیروزہ اور نیلم وغیرہ کے بارے میں اپنی وسیع معلومات کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے جواہرات اور انمول ہیروں یا نادر موتیوں کا کاروبار کرنے کا ارمان دل میں موجود ہو۔ مگر اس کے پاس ہرگز ایسے وسائل موجود نہ تھے جن کے بل بوتے پر وہ ایسا کر پاتا۔ یہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ اسکول کے دنوں میں بھی ہٹ دھرمی اور بے ایمانی کا شاہکار مانا جاتا تھا۔ پسند کی ہر چیز جائز و ناجائز ذرائع سے حاصل کرنا اس کا شیوہ تھا۔ اصول پسندی، رواداری، قانون کی پاسداری، اخلاقی اقدار اور وفا شعاری اس کی لغت میں بے معنی اور لغو چیزیں تھیں۔ وہ مطلب براری، ہیرا پھیری، حصول مدعا کی خاطر ہر جرم مثلاً چوری، ڈکیتی، اغوا اور قتل تک کا ارتکاب کر سکتا تھا۔

اسکول کے زمانے میں اس کی جیبیں پیسوں سے بھری ہوتی تھیں۔ تعلیم سے زیادہ آوارہ گردی، شرافت سے بڑھ کر بے راہروی، نیک چال چلن کی بجائے بدقماشی، حلیم طبع

روا داری کی بجائے روباہی اس کی فطرت کے قریب تھیں۔ دوسروں کے نازک جذبات اور لطف احساسات اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس کا باپ محمد سعید بٹ ریلوے کیرج ورکشاپ لاہور میں ورک مستری تھا۔ بڑا دیانتدار، نیک طبیعت اور فرشتہ سیرت انسان تھا۔ پابند صوم صلوۃ، حلال کی روزی کمانے اور بچوں کو کھلانے والا یہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اس کی ماں زہرہ بی بی بڑی پاکباز، حیا دار اور عابدہ خاتون تھی۔ وہ گلی محلے کے بچوں کو مفت قرآن پڑھاتی تھی۔ مگر خدا جانے سرور سعید بٹ کس پلید مٹی کا بنا ہوا شخص تھا۔ اس میں ایک اچھے اور سلجھے ہوئے انسان کی کوئی خوبی یا خصلت موجود نہ تھی وہ اول درجے کا ڈھیٹ، بد لحاظ اور بے مروت آدمی تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اسکول میں خاصا پاپولر اور معروف طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں پر بڑی فراخدلی سے مال خرچ کر کے ان کی نہل سیوا کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنی سادہ لوح ماں، اور بڑی بہن ذکیہ جو اسی محلے میں رہتی تھی سے مختلف بہانے کر کے پیسے بٹور لیتا تھا۔ وہ بڑا ہوشیار، چالاک اور زمانہ ساز لڑکا تھا۔ ہر قسم کے حالات واقعات اور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دانشور لوگ کہتے ہیں کہ جعلسازی، فریب کاری اور دھوکہ دہی کے لئے بھی ذہانت، عقلمندی اور انجام سے بے پروا ہونے کے ساتھ ساتھ دیدہ دلیری، بے باکی اور مکاری کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔

سرور سعید بٹ میں ایسی تمام بے ہودگیاں اور حرکات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جن کی بدولت وہ اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کی خاطر ان ناجائز حربوں اور شرمناک ہتھکنڈوں کو بروئے کار لا کر اپنی من پسند سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتا تھا۔

اب میرے ذہن میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ سرور سعید بٹ کی کونسی لاٹری نکلی تھی یا بیرون ممالک میں جوئے کے جیک پاٹ لگ گئے تھے۔ جس سے وہ اس قدر امیر اور دولتمند ہو گیا تھا؟ جائز اور شریفانہ ذرائع سے اتنی بڑی رقم کا حصول کسی صورت ممکن نہ تھا۔ بہرحال میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ "جو ہو سو ہو" میں ہر حالت میں اس کے کروڑ پتی ہونے کا راز ضرور جان کر رہوں گا۔ اس لئے قبل اس کے میں اس کو لاہور جا کر ملوں۔ میں نے اس کے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ان سے اس کے بارے میں جو بھی انفارمیشن یا واقفیت حاصل ہو سکے اکٹھی کرنے کی کوشش کروں۔

اس طرح سرور سعید بٹ کا سب سے قریبی جگری یار رانا منور حیات کا کھوج لگا کر میں

اسے ملنے گیا۔ رانا منور چونکہ میرا بھی کلاس فیلو تھا۔ اس لئے وہ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اور مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چند منٹ کے لئے اندرون خانہ چلا گیا۔ پھر آ کر میرے پاس بیٹھ کر میری خیر خیریت دریافت کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم چائے اور بسکٹ لے آیا۔ میں نے رسمی طور پر کہا۔ "اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" تو رانا منور کہنے لگا۔

رانا منور : تم زندگی میں پہلی دفعہ میرے غریب خانے پر آئے ہو اور سچ پوچھو تو تم میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے شایان شان مہمان نوازی کا فریضہ ادا نہیں کر پایا۔

میں نے کہا۔ دوستوں میں کوئی تکلف روا نہیں ہوتا۔ تمہاری محبت اور کرم فرمائی کے مقابلہ میں ان تکلفات کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ "آمدم بر سر مطلب" میں آج ایک خاص مقصد کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔

رانا منور : اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔ اس میں میری عزت افزائی ہوتی۔

میں نے کہا۔ یہ تمہاری نوازش ہے۔ پھر تمہارا حسن سلوک اور قدر افزائی میرے لئے باعث افتخار ہے۔ پھر میں نے بلا تمہید کہا کہ آج میں تمہارے جگری یار سرور سعید بٹ کے بارے میں کوئی جانکاری حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔

میرے یہ الفاظ سن کر رانا منور حیات یکدم بھونچکا رہ گیا' اسے غالباً یہ ہرگز امید نہ تھی کہ میں اس سے ایسی بات پوچھوں گا۔

وہ اس وقت خاصا مضطرب اور متذبذب دکھائی دیا۔ میں نے اس کا اضطراب بھانپ کر کہا۔

میں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہے۔ دراصل میں تمہیں پریشان کرنے نہیں آیا۔

رانا منور : تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ سوال میرے لئے کس قدر سوہان روح اور باعث کوفت ہے۔ سرور سعید بٹ میری ہنستی بستی زندگی کا ایک ایسا ناسور ہے۔ جس سے ہر وقت بدبو کے بھبکے اٹھتے ہیں۔ وہ کسی کا دوست' بہی خواہ' ہمدرد یا سجن نہیں ہو سکتا۔ وہ خبیث انتہائی بد اطوار' بد خصلت' بد باطن اور بد اصل شخص ہے۔ وہ یار مار' طوطا چشم اور بڑا خود

غرض ہے۔ بد تمیزی' گستاخی اور بے غیرتی اس کی سرزشت اور خون میں شامل ہے۔ خدا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی۔ جب میرا اس سے تعارف ہوا تھا۔ پھر کسی طرح آہستہ آہستہ وہ میری دوستی اور زندگی میں خون کی طرح سرایت کرتا چلا گیا۔ دوست پروردگار کا ایک بہت بڑا عطیہ اور نعمت ہوتا ہے۔ وہ ایک مونس و غمخوار' ہمدرد و بہی خواہ' دکھ درد آزمائش اور مشکل کے وقت کام آنے والا ایسا بااعتماد ساتھی ہوتا ہے جو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ مگر سرور سعید بٹ تو ایسا سراب ہے۔ جو صحرا کی ریت میں دور سے پانی کی موجودگی کا شائبہ دیتا ہے۔ وہ ایسا چھلاوہ یا شر شرار ہے۔ جو فریب نظر بن کر دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ وہ ایسا بد فطرت انسان ہے۔ جس سے سوائے ترغیب گناہ' گمراہی اور ذلت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے اسے بڑی قریب سے دیکھا' آزمایا اور پرکھا ہے۔ دن رات اس کی رفاقت میں گزارے ہیں۔ اس کی غمی خوشی' دکھ درد' جذبات و احساسات' حرکات و سکنات' میل ملاقات اور اس کی محبت اور نفرت کے ہر پہلو پر برسوں تک گہرا جائزہ اور مطالعہ کر کے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس کا اظہار میں نے آپ سے کر دیا ہے۔

میں۔ کیا سرور سعید بٹ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ یا بعد میں اسے غلط ماحول ملا جس کی وجہ سے وہ ایسا بگڑ گیا؟

رانا منور : "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق شروع سے ہی اس میں ایسی علامات اور جراثیم پائے جاتے تھے۔ جو عمر کے ساتھ ڈیویلپ ہوتے چلے گئے۔ ماحول نے اسے کیا خراب کرنا تھا۔ وہ تو راستہ ہمیشہ اپنے خیال اور منشا کے مطابق متعین کرتا تھا۔ وہ خود (Evil Genius) یعنی وہ غیر معمولی شیطانی ذہانت کا مجسمہ تھا۔ وہ بے راہرو اور بھٹکا ہوا شخص تھا۔ اس کی سوچ ہی گمراہ کن تھی۔ اس لئے وہ ہر کام کر گزرتا تھا۔ جو اس کی شر انگیز فطرت چاہتی تھی۔ اسکول کے دنوں میں بھی اس کا رویہ دوسرے طالب علموں کی نسبت خاصا مختلف تھا۔ ایک دفعہ تفریح (Recess) کے دوران وہ سگریٹ پی رہا تھا کہ اس کے ٹیچر نے اسے دیکھ لیا۔ جب دوبارہ کلاس لگی۔ تو اس ٹیچر نے اسے بنچ پر کھڑا کر کے مولا بخش یعنی ڈنڈے سے مارنے لگا۔ تو اس نے مارنے کی وجہ دریافت کی۔ جس پر استاد نے کہا کہ تم اسکول میں سگریٹ پیتے ہو۔ تو سرور سعید بٹ نے فوراً" جواب دیا۔

سرور سعید بٹ : میں قرآن کی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے سگریٹ نوشی چھوڑ دی ہے۔

استاد- (سخت حیرت میں)- کب چھوڑی ہے-

سرور سعید بٹ : پانچ منٹ پہلے-

اس پر استاد کے علاوہ سبھی طلباء بھی ہنسنے لگے- اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا-

بلاشبہ وہ بڑا ذہین و فطین طالب علم تھا- مگر پڑھائی کی بجائے اس کی توجہ زیادہ تر تخریبی سرگرمیوں پر مرکوز رہتی تھی- وہ میٹرک کا امتحان کسی طرح پاس کر گیا- پھر اس نے تعلیم کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیا- اور گھر آ کر سوچنے لگا کہ آئندہ زندگی کا کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے کہ اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ رونما ہو گیا- جو کچھ اس طرح کا تھا-

ایک دن اس کے گھر کی سڑک کا گٹر بند ہو گیا- اور پانی مین ہول سے اچھل کر باہر آنے لگا- پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گندا اور بدبودار پانی اس سڑک اور اطراف کی گلیوں میں پھیل گیا- جس سے گٹر کے پانی کی سڑاند اور تعفن نے اس علاقے کی زندگی اجیرن بنا دی- اہل محلہ سرور بٹ کے پاس جا کر واویلا کرنے لگے کہ انہیں اس آفت ناگہانی سے نجات دلائی جائے- جس پر سرور سعید بٹ نے انہیں تسلی دی کہ صبح ان کی یہ تکلیف رفع ہو جائے گی- خاطر جمع رکھیں- چنانچہ اگلے روز سرور سعید بٹ نے اپنے گھر سے ایک بڑی بالٹی لے کر اس میں گٹر کا انتہائی غلیظ اور بدبودار پانی بھر کر سیدھا X.E.N ایجکشن پبلک ہیلتھ انجینئرنگ کے دفتر جا پہنچا اور وہ پوری بالٹی اس کی دیدہ زیب پوشاک پر پھینک دی- جس سے اس کا نفیس سوٹ ٹائی اور کپڑوں کے علاوہ میز پر رکھی ہوئی تمام فائلیں بھی اس فضلا سے بھرے ہوئے گندے پانی میں بھیگ گئیں- اور یہ بدبودار پانی پھینکنے کے بعد سرور سعید بٹ نے بلند آواز میں اسے کہا کہ تم بھی ہماری پریشانی میں شامل ہو کر دیکھو کہ تمہاری غفلت کی وجہ سے ہمارا کیا حال ہو چکا ہے؟ اس وقت ایکجکشن کے عملے کے افراد سرور سعید بٹ کی اس انتہائی شرمناک اور ذلیل ترین حرکت سے سیخ پا ہو کر اس پر حملہ آور ہو گئے- مگر سرور سعید بٹ تو پہلے ہی چوکنا تھا اور اسے اس جوابی کاروائی کی توقع تھی- اس لئے اس نے جیب سے چاقو نکال لیا- اور مقابلہ کرنے والوں کو بے نقط غلیظ گالیاں دیتے ہوئے قتل کر دینے کی دھمکیاں دینے لگا- جس سے وہ پیچھے ہٹ گئے اور سرور سعید بٹ کو وہاں سے فرار ہونے کا موقعہ مل گیا-

اگلے روز ایکجکشن پبلک ہیلتھ انجینئرنگ کی رپورٹ (F.I.R) درج کرانے پر پولیس سرور سعید بٹ کو گرفتار کرنے کی غرض سے آئی- تو اس نے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری

کے منظور شدہ کاغذات دکھا دیئے- اس طرح وہ گرفتار ہونے سے بچ گیا- بعد میں دو سال تک مقدمہ چلتا رہا- مگر استغاثہ اس کا جرم ثابت نہ کر سکا- اور سرور سعید بٹ باعزت بری ہو گیا-

فیصل آباد کا ایک مشہور و معروف ڈاکو غالباً چراغ بالی سرور سعید بٹ کا گہرا دوست تھا- وہ اس کی دلیری' جوانمردی اور شجاعت کا نہ صرف مداح تھا- بلکہ وہ اس کی داستانیں بڑے فخر اور مزے لے لے کر سنایا کرتا تھا- وہ بڑا نڈر اور بے خوف شخص ہونے کی وجہ سے اس کا آئیڈیل بھی تھا- بعد میں پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا- وہ اکثر اس کا ایک واقعہ بڑی دلجمعی سے سنایا کرتا تھا- جو کچھ اس طرح سے تھا-

چراغ بالی اپنے دور کا بہت بڑا ڈکیت اور قاتل مانا جاتا تھا- پولیس اور انتظامیہ اس کے نام سے گھبراتی تھی- اور اس کی غیر قانونی حرکات اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کی بدولت بے حد پریشان تھی- وہ پولیس کو بیشمار مقدمات اور وارداتوں میں مطلوب تھا- اور وہ اس کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی- مگر وہ ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا- اس علاقے کے لوگ بھی چراغ بالی سے ہمدردی رکھتے تھے- کیونکہ وہ غریب اور نادار لوگوں کی ہمیشہ مالی مدد کرتا رہتا تھا- آخر ایک جگہ کامیاب چھاپہ مار کر پولیس چراغ بالی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی-

تفتیش کے دوران پولیس کے اعلیٰ افسران نے چراغ بالی سے پوچھا-

پولیس آفیسر: کیا تم سیدھی طرح اپنے جرائم کا اقبالی بیان دینا پسند کرو گے یا پھر ہم تھرڈ ڈگری کے ذریعہ تم سے سچی باتیں اگلوانے کی کوشش کریں-

چراغ بالی : آپ کو کسی تردد یا تکلف کی ہرگز ضرورت نہیں ہے- آپ صرف دو کلو جلیبیاں اور دو کلو دودھ منگوا کر مجھے کھلا دیں- پھر بلا کسی حیل و حجت کے میں سب کچھ از خود بتا دوں گا-

چراغ بالی کے یہ الفاظ سن کر پولیس افسروں کو یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ بڑا آسان راستہ ہو گا- چراغ بالی سے اپنے جرائم کا اعتراف کرانے اور اقبالی بیان حاصل کرنے کا- چنانچہ انہوں نے بازار سے دو کلو جلیبیاں اور دو کلو دودھ منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیا- جسے اس نے بڑی رغبت اور شوق سے کھا لیا- یہ سب کچھ کھا کر اس نے پولیس افسران سے پوچھا-

چراغ بالی : یہ بتائیں کہ یہ میں نے کیا کھایا ہے؟

پہلا پولیس افسر: دودھ اور جلیبیاں۔

چراغ بالی: دیکھو بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ میں نے کوئی چیز نہیں کھائی۔ آپ جھوٹ بولنے سے اجتناب کریں۔

دوسرا پولیس افسر: یہ کیا غضب ڈھا رہے ہو۔ ابھی ہمارے سامنے تم نے یہ چیزیں کھائی ہیں۔ اب ان سے انکاری ہو گئے ہو۔ یہ دونوں چیزیں تمہارے کہنے پر تو منگوائی ہیں۔

پہلا پولیس افسر: تم نے وعدہ کیا تھا کہ دودھ اور جلیبیاں کھلا دو۔ تو تمام جرائم جن میں تم اور تمہارے ساتھی ملوث ہیں۔ ان سے پردہ اٹھا دو گے۔ اور ان کے بارے میں اقبالی بیان دے دو گے۔

چراغ بالی: وہ تو درست ہے۔ مگر وہ چیزیں کھلاؤ گے۔ تو تب بیان دوں گا۔

پہلا پولیس افسر: تو ابھی تم نے ہمارے سامنے کیا کھایا تھا۔

چراغ بالی: میرا خیال ہے کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے پہلے مجھ سے یہ منوا لیں کہ میں نے یہ دو چیزیں کھائی ہیں۔ اقبالی بیان دینے کا تو بعد میں سوچیں گے۔

چراغ بالی کا یہ موقف سننے پر دونوں پولیس افسران انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور یہ بات ان پر واضح ہو گئی تھی کہ ملزم اس قدر دلیر اور ڈھیٹ ہے۔ وہ کسی صورت میں نہیں مانے گا کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ اس سے اقبالی بیان اگلوانے کے لئے کوئی اور ہی حربہ اختیار کیا جائے۔

سرور سعید بٹ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد کافی عرصہ سے بیکار تھا۔ وہ اپنی ضروریات زندگی دوستوں سے ادھار مانگ کر یا پھر واقف کاروں سے ٹھگ بازی کر کے اپنا وقت چلا رہا تھا۔ یہ مانگ تانگ اور ٹھگی ٹھوڑی کا سلسلہ زیادہ دیر تک چلنے والا نہ تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دوست و احباب اور ساتھی اس کو دیکھتے ہی اپنی بیزاری اور بے اعتنائی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ لہٰذا اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ فوری کر لے۔ چنانچہ اس نے اپنی صواب دید کے مطابق اسمگلنگ کو ترجیح دی۔ اس وقت سونے اور ہیروئن کی سمگلنگ کے چانسز زیادہ تھے۔ اس نے پشاور کے پاس باڑہ مارکیٹ میں ایسے لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ جو اسے سونے اور ہیروئن کی سپلائی باقاعدگی سے کر سکیں۔ اس کے لئے اسے زیادہ جدوجہد نہ کرنی پڑی۔ کیونکہ جلد ہی ایسے دو قابل اعتماد بیوپاری اور سپلائر مل گئے۔ جو اس کے اس نئے دھندے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکیں۔ یہ سلسلہ

سرور سعید بٹ کی منشاء کے مطابق چل نکلا۔

ایک دن علی الصبح سرور سعید بٹ اسکوٹر پر سوار ہو کر اپنے جگری دوست رانا منور حیات سے ملنے آیا۔ اور اس کے گھر کی بیل بجائی۔ رانا منور حیات اس وقت باتھ روم میں شیو کر کے ابھی فارغ ہوا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر باہر نکل آیا۔ تو وہ پائجامہ اور بنیان میں ملبوس تھا۔ کندھے پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ چہرے پر شیو کے صابن کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ جو ابھی تک صاف نہ کئے گئے تھے۔ وہ سرور سعید بٹ کو اپنے گھر کے دروازے پر موجود پا کر حیران ہو رہا تھا۔ اور کہنے لگا۔

رانا منور حیات: خیر تو ہے۔ آج اتنی سویرے تم ادھر آئے ہو۔ ٹھہرو میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتا ہوں۔

سرور سعید بٹ: میں ذرا جلدی میں ہوں۔ تم میرے پیچھے اسکوٹر پر بیٹھو۔ تھوڑی دیر میں واپس آ جاتے ہیں۔

رانا منور حیات: میں منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر آتا ہوں۔

سرور سعید بٹ: نہیں یار اتنا وقت نہیں ہے۔ تم اسکوٹر پر بیٹھو۔ یہیں شہر میں ہی جانا ہے۔

رانا منور حیات: قمیض تو پہن لینے دو۔ ایک منٹ لگے گا۔

سرور سعید بٹ: عجیب سبق آدمی ہو۔ تم نے کونسا سسرال جانا ہے۔ چند منٹوں کی تو بات ہے۔

اب رانا منور حیات کے پاس مزید کوئی بہانہ یا عذر نہ تھا۔ اس لئے وہ سرور سعید بٹ کے پیچھے اسی حال میں بیٹھ گیا۔ اور سرور سعید بٹ نے اسکوٹر چلا دیا۔ جب اسکوٹر گوجرانوالہ شہر کی حدود سے باہر نکلا تو رانے منور نے استفسار کیا کہ کدھر جا رہے ہو؟ جس پر سرور سعید بٹ نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔ ذرا گکھڑ تک جانا ہے۔ پھر جب گکھڑ بھی گزر گیا۔ تو رانے منور کو تشویش لاحق ہوئی۔ تو اس نے پوچھا۔

رانا منور حیات: سرور سعید تمہارے ارادے کیا ہیں؟ مجھے شک ہے کہ تم کسی حرامزدگی پر تلے بیٹھے ہو؟

سرور سعید بٹ: یار سچی بات تو یہ ہے کہ گجرات سے ایک شخص سے رقم لینی ہے۔ وہاں سے رقم لے کر واپس آ جائیں گے۔

رانا منور حیات : تم بکواس کر رہے ہو- اگر تم گجرات میں نہ رکے- تو میں اسکوٹر سے چھلانگ لگا دوں گا-

سرور سعید بٹ : نہیں میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ تمہیں اسکوٹر سے کودنے کا موقعہ دوں- بس گجرات سے واپس گوجرانوالہ چلے چلتے ہیں-

پھر گجرات کے بعد لالہ موسیٰ' کھاریاں' سرائے عالمگیر اور جہلم آ گیا- اب رانا منور حیات کا موڈ مکمل طور پر آف ہو چکا تھا- مگر اسکوٹر کہیں رکنے کا نام نہ لے رہا تھا- سرور سعید بٹ نہ معلوم کس چکر میں تھا- وہ کہاں جانا چاہتا تھا- اور رانا منور حیات کو اس حالت میں ساتھ لانے میں مصلحت کیا تھی؟ رانا منور حیات اس کی شیطانی فطرت سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کے فریب میں آ گیا تھا- اسے تو اپنے حلیہ پر ندامت کا احساس ہو رہا تھا اور ناشتہ کئے بغیر خالی پیٹ اس خبیث کے ہمراہ بلا سوچے سمجھے چلا آیا تھا- اس کی جیبیں خالی تھیں- اب وہ سرور سعید بٹ کی اس راز داری سے مکمل طور پر دل برداشتہ ہو چکا تھا- وہ اس کرب اور بیزاری کے سفر سے راہ فرار اختیار کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا- لیکن اسے اپنی کسمپرسی اور کم مائیگی سے زیادہ اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا- کہ اس کے اوچھا اور چھچھورا پن کے جال میں کیسے پھنس گیا- آخر سہاوا کے ایک پٹرول پمپ پر وہ پٹرول لینے کے لئے رکا- تو رانا منور نے بغاوت کا اعلان کر دیا- اور سرور سعید بٹ کو کہنے لگا-

رانا منور حیات : تو بڑا کمینہ اور کم ظرف شخص ہے- یہاں سے اب میرا اور تیرا ساتھ ختم- میں واپس گوجرانوالہ بھیک مانگ کر جاؤں یا پھر پیدل چلا جاؤں گا- مگر تم جیسے ذلیل شخص کا ساتھ ہرگز نہ دوں گا-

سرور سعید بٹ نے اپنا جوتا اتار کر رانا منور کے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ لو میرا سر حاضر ہے- جس طرح چاہو اپنا غصہ نکال لو- مگر خدا کے واسطے میرا ساتھ نہ چھوڑو- میں تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے ساتھ لے جا رہا ہوں- پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا- اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے جسے دیکھ کر رانا منور حیات کا سارا غصہ کافور ہو گیا- اور وہ کہنے لگا-

رانا منور حیات : تم نے مجھے کپڑے پہننا تو در کنار منہ دھونے کا موقعہ بھی نہیں دیا- اور پھر چند منٹوں کا کہہ کر مجھے ساتھ لے آئے- اب کم از کم مجھے اتنا تو بتا دو کہ تمہاری منزل مقصود کہاں ہے-

سرور سعید بٹ : میں دراصل تمہیں سرپرائیز دینا چاہتا ہوں- اس لئے میری درخواست ہے کہ تم مجھ سے یہ سوال نہ پوچھو- تو بہتر ہو گا-

پھر سرور سعید بٹ نے ایک ہوٹل میں لیجا کر اسے بڑا عمدہ ناشتہ کروایا- اور وہاں سے راولپنڈی کی جانب روانہ ہو گئے- اب رانا منور کا موڈ بہت اچھا تھا- کیونکہ اس کے پیٹ کی آگ بجھ چکی تھی- اور اس نے سرور سعید بٹ کو دل سے معاف کر دیا تھا-

راولپنڈی پہنچ کر سرور سعید بٹ نے ایک ریسٹورانٹ سے لنچ باکس تیار کروائے' موسمی پھلوں کے ساتھ کوکا کولا کی بوتلیں خریدیں- اور پھر اپنی انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے- نوشہرہ پہنچ کر انہوں نے اسکوٹر میں دوبارہ پٹرول بھروا لیا- اور اس طرح وہ پشاور پہنچ گئے- اس وقت تین بجے بعد دوپہر کا عمل تھا- چائے پی کر وہ طورخم کی جانب چل پڑے- قبائلی علاقے کے درمیان یہ شاہراہ درہ خیبر سے ہوتی ہوئی طورخم پہنچتی ہے- اس وقت یہ اہم ترین سڑک بڑی سنسان اور ویران تھی- جس پر یہ دونوں جانباز دنیا جہاں سے بے پرواہ ہو کر جا رہے تھے- سڑک کے دونوں اطراف سے مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں- کسی قسم کی ٹریفک دکھائی نہ دے رہی تھی- ایسے معلوم ہوتا تھا- جیسے کرفیو لگا ہو- لیکن ان دو اسکوٹر سواروں کی نگاہیں اپنی منزل مقصود پر مرکوز تھیں- اس طرح اسکوٹر چلتا رہا- اور وادی خیبر گولیوں کے پیہم شور میں اسکوٹر کی آواز بھی شامل ہو رہی تھی- آخر یہ سفر تمام ہوا- اور وہ دونوں جب طورخم پہنچے- تو وہاں بھی کرفیو کا سماں تھا- دوکانیں بند اور کوئی بندہ بشر نظر نہ آ رہا تھا- یہ بڑی حیرانگی کی بات تھی کیونکہ یہ علاقہ بالعموم اور باڑہ مارکیٹ بالخصوص بڑی پررونق جگہیں ہیں- وہاں پر خریداروں اور مقامی لوگوں کا خاصا ہجوم ہمہ وقت دکھائی دیتا ہے- سرور سعید بٹ کو بخوبی علم تھا کہ اس نے کہاں جانا ہے- اس لئے وہ سیدھا ایک دوکان کے گرے ہوئے شٹر کو دستک دینے لگا- تھوڑی دیر بعد اندر سے دھیمے لہجہ میں آواز آئی- کون ہے- سرور سعید بٹ نے اپنا نام بتایا- تو کسی نے کہا کہ پچھلی طرف آ کر سیڑھی کے دروازے پر آ جاؤ- چنانچہ وہ دونوں وہاں گئے- تو انہیں سیڑھی کے اوپر والا دروازہ کھول کر اندر بلا لیا گیا- اب وہ چاروں اطراف سے بند ایک بیٹھک نما کمرے میں پہنچ گئے تھے- وہاں پر موجود گل خاں شنواری نے ان کا استقبال کیا- اور بڑی حیرت انگیز کیفیت میں کہنے لگا-

گل خاں شنواری : بابو سرور- تم لوگ ادھر کیسے پہنچ گیا- یہاں تو دو قبائلی قبیلوں کے

درمیان بڑے گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اور سڑک کے دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ سڑک پر تو ٹریفک کل دوپہر سے بند ہے۔ ہم حیران ہیں کہ تم لوگ یہاں زندہ سلامت کیسے پہنچ گئے۔ گولیوں کی بوچھاڑ اور گولہ بارود کی بھرمار میں تمہارا بچ رہنا ایک معجزہ ہے بابو۔ ان قبیلوں کی جنگ بڑی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہے۔ اور کئی کئی روز تک چلتی رہتی ہے۔ پھر جب تک جرگہ ان فریقین میں صلح نہ کروا دے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لڑائی کے دوران بھگدڑ اور افراتفری کی صورت میں سارا بازار اور علاقہ بند ہو جاتا ہے۔ اور کرفیو کا سماں ہوتا ہے۔

سرور سعید بٹ : ہاں راستے میں ساری سڑک سنسان اور ویران تھی۔ ٹریفک نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ گولیاں ہر طرف سے چل رہی تھیں۔ مگر ہم ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر چلے آئے۔ قسمت اچھی تھی کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اور ہم زندہ سلامت آپ کے پاس آ گئے۔

پھر چائے آ گئی۔ اس کے ساتھ کئی روز کی باسی مٹھائی تھی۔ جسے وہ کیڑے مکوڑوں سے صاف کر کے کھانے لگے۔ اس وقت تھکاوٹ کی وجہ سے چائے بڑا لطف دے رہی تھی۔ ابھی تک آس پاس سے گولیاں چلنے کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ اور وہ اس بند کمرے میں محفوظ بیٹھے تھے۔ شام کو گولیاں اور بارود چلنے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ کیونکہ مغرب کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں۔ نماز مغرب کی ادائیگی تک یہ سیز فائیر جاری رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بگل کی آواز سنائی دی۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ دونوں قبیلوں میں جرگہ نے صلح کرا دی ہے اور جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اب فضا پرسکون ہو گئی۔ شام کا دھندلکا پھیلا تو میزبان انہیں چھت پر لے گئے۔ جہاں پہلے سے چند چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ ان چارپائیوں میں سے دو پر بیٹھ گئے۔ اور باقی دو پر میزبان اور اس کے دو کارندے براجمان ہو گئے۔ ایک گھنٹے بعد گل خاں شنواری کا ایک ملازم تازہ تازہ بجی (بکرے کا گوشت جو ایک بڑے توے پر چربی میں پکاتے ہیں) اور ایک ڈش میں چپلی کباب اور ٹرے میں افغانی روٹیاں لے آیا۔ ایک طرف بھوک لگی ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف بجی اس قدر لذیذ اور ذائقے دار تھی۔ پھر چپل کباب بھی بہت عمدہ بنائے گئے تھے۔ وہ دونوں کھاتے ہی چلے گئے۔ بعد میں انہیں قہوہ کی دو دو پیالیاں پلا دی گئیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر سرور سعید بٹ نے اپنی کمر سے لپٹی ہوئی چمڑے کی پیٹی اتار کر اس میں سے ایک لاکھ روپیہ گل خاں شنواری کو

ادا کیا۔ جس کے بدلے میں اس نے سونے کی چند اینٹیں اسے دیں۔ جو سرور سعید بٹ نے اسی پیٹی کی جیب میں رکھ لیں۔ رات وہ لوگ وہاں ہی سوئے پھر علی الصبح چائے اور افغانی روٹی کھا کر وہ دونوں اسکوٹر پر بیٹھ کر واپس گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں سرور سعید بٹ نے رانا منور حیات کو اپنا حصے دار (پارٹنر) بنانے کی نوید جانفزا سنائی تو رانا منور حیات کہنے لگا۔

رانا منور حیات : یہ حرام کی کمائی تمہیں ہی مبارک ہو۔ میں تو ایسی آمدنی کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر ناجائز اور حرام خیال کرتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھے اس کام کے لئے ساتھ لے جا رہے ہو۔ تو میں خدا کی قسم کبھی تمہارے ساتھ نہ جاتا۔ اور آئندہ بھی مجھے اس لعنت سے دور ہی رکھنا۔

رانا منور سے میں نے پوچھا کہ تمہارے خیال میں سرور سعید بٹ اول درجے کا مکار' عیار اور خودغرض شخص ہے۔ وہ کسی کا سجن یا بہی خواہ نہیں ہو سکتا۔ تو کیا تمہارے ساتھ بھی اس نے کوئی فریب دہی یا دغا بازی کی حرکت کی ہے۔

رانا منور حیات : ہاتھ چالاکی' ٹھگ بازی اور دھوکہ دہی اس کی سرشت میں شامل ہے۔ اور وہ ہر کس و ناقص' جان پہچان والے اور دوست و احباب کو نشانہ ستم بنا کر حظ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس کے قبیح اور شرمناک بہکاوے میں آ کر اس کی ستم ظریفی کا نشانہ بن گیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کا فطرت شناس اور بھیدی ہونے کے باوجود میں اس کے ہوس پرور جال میں پھنس گیا۔ ہوا یوں کہ میری دو بیٹیوں کی شادی ہو رہی تھی۔ میں نے ان کے لئے زیورات بنوانے تھے۔ میں کوئی امیر آدمی تو ہوں نہیں۔ سرکاری ملازمت میں جو کچھ پس انداز کیا تھا اسی میں اب گزارہ کرنا مطلوب تھا۔ میں اور میری بیوی سوچ رہے تھے کہ اس قدر کم رقم سے کیا کچھ بنوایا جا سکتا ہے کہ اس دوران یہ خبیث اور بدباطن سرور سعید بٹ آ گیا۔ اور میرا چہرہ دیکھ کر میری پریشانی کو بھانپ کر پوچھنے لگا۔

سرور سعید بٹ : یہ کیا رانا۔ آج تمہارے چہرے پر یہ اداسی کیوں چھائی ہوئی ہے۔

رانا منور حیات : کیا کروں یار۔ میری دو بیٹیوں کی شادی ہو رہی ہے۔ گھر والی زیور بنوانے کی تکرار کر رہی ہے۔ مگر میرے محدود وسائل مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بس آجکل اسی الجھن میں گرفتار ہوں۔ میری بیوی بھی اسی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتی ہے۔

سرور سعید بٹ : کم از کم بیس تولے سونا تو ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے تمہارے پاس

آجکل کے حساب سے اسی ہزار روپے درکار ہیں۔

رانا منور حیات : لیکن میں پچاس ہزار روپے سے زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ پھر باقی رقم کا بندوبست کیسے ہو گا۔

سرور سعید بٹ : دیکھو رانا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ میں اگر تمہارا یہی کام پچاس ہزار روپے میں کروا دو تو کیا خیال ہے۔

رانا منور حیات : اللہ تمہارا بھلا کرے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "دوست وہ جو مصیبت کے وقت کام آئے۔" تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔

پھر گھر کے اندر جا کر پچاس ہزار روپے لا کر سرور سعید بٹ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی زیورات کی فہرست اسے دے دی ہے۔ اور سرور سعید بٹ پندرہ دنوں کے اندر اندر مذکورہ زیورات تیار کروا کر رانا منور حیات کے حوالے کر دے گا۔ کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

رانا منور حیات : یہ وہ وعدہ تھا۔ جو کبھی ایفا نہ ہوا۔ یہ تو رب العزت کا خاص کرم تھا کہ ابھی ہم نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کی تاریخ مقرر نہ کی تھی۔ اگر وہ تاریخ کا تعین ہو گیا ہوتا تو ذلت اور شرمندگی ہمارا مقدر بن چکی ہوتی۔ اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بدبخت روپے ہتھیانے کی غرض سے مجھے بھی جل دے جائے گا۔ وہ تو ایسا زہریلا سانپ ہے۔ جو اپنے دودھ پلانے والے مالک کو بھی ڈس لیتا ہے۔ بیٹیوں کے معاملہ میں تو بدترین دشمن بھی کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے اجتناب کرتا ہے۔ پھر جب وعدہ کے مطابق سرور سعید بٹ مجھے بچیوں کے جہیز کے زیورات پہنچانے کے لئے نہ آیا۔ تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ اور میں اس کے گھر گیا۔ تو مجھے وہاں سے پتہ چلا کہ وہ چند روز ہوئے طہران (ایران) چلا گیا ہے۔ اور اس کی واپسی تین ماہ بعد ہو گی۔ یہ خبر سن کر مجھے چکر آ گیا۔ پھر اپنے حواس مجتمع کر کے اس کی بیوی سے ملا۔ اور اس سے پوچھا کہ سرور سعید بٹ میرے لئے کوئی پیغام تو نہیں دے گیا؟

بیوی سرور سعید : نہیں بھائی صاحب۔ کیوں خیر تو ہے۔ آپ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔

رانا منور حیات : میں نے اس کی بیوی کو اپنی بیٹیوں کی شادی کے لئے زیورات بنوا کر دینے کے لئے سرور سعید بٹ کو پچاس ہزار روپے کی ادائیگی کا ذکر کیا۔ تو وہ پریشان ہو گئی اور کہنے لگی۔

بیوی : مجھے انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ مگر بھائی صاحب۔ آپ تو انہیں اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ پھر آپ نے اتنی بڑی رقم ان کے حوالے کیسے کر دی؟

رانا منور حیات : مجھے یہ ہرگز امید نہ تھی کہ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ اب میں اپنی بیوی اور بچیوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ یہی میری کل پونجی تھی۔ چنانچہ وہ بڑی آزردہ حالت میں اپنے گھر چلا آیا۔ رقم نہ ہونے کی خاطر بیٹیوں کی شادی دو سال تک رکی رہی۔ پھر خدا بہتر جانتا ہے کہ اس نے یہ فریضہ کیسے ادا کیا۔ مگر وہ رقم آج تک اسے نہیں مل سکی۔ اس نے سونے اور ہیروئن کی سمگلنگ میں کروڑوں کمائے اور گنوائے ہوں گے۔ مگر کیا مجال کہ اسے رانا منور جیسے دوست کی رقم لوٹانے کا خیال بھی آیا ہو۔ بلکہ اس دوران سرور سعید بٹ نے کبھی کوئی رابطہ بھی نہیں کیا۔ یہ سونے کا کاروبار کب تک چلا۔ اور کب ختم ہوا معلوم نہیں مگر بعد میں سرور سعید بٹ نے قبائلی علاقے سے سونے کی بجائے ہیروئن سمگل کرنی شروع کر دی۔ اور ایران کو باقاعدہ طور پر سپلائی کا آغاز کر دیا۔ سرور سعید بٹ یہاں سے پرانی کاریں خرید تا ان کی بوسیدہ باڈیاں بدل کر ان میں ہیروئن کے پیکٹ بھرتا۔ اور پھر بڑی نفاست سے ان پر نیا رنگ کر کے ایران لے جاتا۔ جہاں اسے ہیروئن کے بیوپاری منٹوں میں اس کا سارا مال خرید لیتے۔ اس طرح چند پھیرے لگانے سے وہ کروڑ پتی بن گیا۔ اور اس نے طہران میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سرور سعید بٹ ہیروئن کا سپلائر ہونے کے ساتھ ساتھ شراب اور شباب کا رسیا بھی تھا۔ اسے ایران میں مقیم لاکھوں کی تعداد میں پیشہ ور طوائفوں اور شکاری ماڈل گرلز کی فتنہ خیزیوں اور حشر سامانیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اور وہ ان کی زہد شکن جوانیوں اور مستی بھری سحر طرازیوں میں کھو گیا۔ وہ تو کلی کلی پر منڈلانے والا بھنورا اور حسن و جمال کا شیدائی تھا۔ اس رنگین اور ہوس ناک ماحول میں اس نے پانچ برس گزار دیئے۔ یہ شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کا دور حکومت تھا۔ جس میں ہر قسم کی عیش و عشرت' ہوس پرستی' عشوہ گری اور عصمت فروشی اپنے عروج پر تھیں۔ سرور سعید بٹ جیسے عیاش اور اوباش شخص کے لئے یہ دور بڑا پرکشش اور سازگار رہا۔ اس دوران اس نے بڑی روانی سے فارسی بولنی سیکھ لی۔ اور کوئی چکر چلا کر ایرانی پاسپورٹ بھی حاصل کر لیا۔

وہاں سے اس کا دل اچاٹ ہوا۔ تو وہ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک' سری لنکا اور بعد میں منیلا (فلپائن) کی خاک چھانتا رہا۔ اور وہاں کے عوام کو ہیروئن جیسے ذلیل ترین نشہ سے متعارف

کراتا رہا۔ اور دولت سمیٹتا رہا۔ اگرچہ اسے ان ملکوں کا معصیت آلود ماحول' نشہ آور اشیاء مثلاً شراب' ہیروئن' حشیش' چرس اور گانجا وغیرہ کی بہ آسانی فراہمی' ہوس ناکی اور عیاشی کی لاتعداد عشرت گاہوں' عصمت فروشی کے اڈوں اور جوئے کے انگنت ٹھکانوں کی بھرمار سرور سعید بٹ کے لئے بڑا پرلطف اور سازگار ماحول تھا۔ مگر وہ جلد ہی ان ملکوں سے بیزار ہو کر ترکی کے شہر استنبول میں سیٹل ہونے کا حتمی فیصلہ کر کے وہاں چلا گیا۔ استنبول آبنائے باسفورس پر واقع ایک نہایت حسین و جمیل شہر ہے۔ یہ شہر آدھا ایشیا اور آدھا یورپ میں ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ استنبول میں پہلے تو سرور سعید بٹ نے اپنی مکارانہ اور ریاکارانہ فطرت کے پیش نظر چند آوارہ منش نازنینوں اور کال گرلز سے اپنے جنسی تعلقات استوار کر لئے پھر چند مہینوں بعد اس نے ایک نہایت من موہنی اور دلکش خدوخال والی دوشیزہ سے شادی کرلی۔ اس مہوش اور پری جمال حسینہ نے جیون ساتھی بن کر سرور سعید بٹ کی کائنات ہی بدل ڈالی۔ اب وہ وحشی درندہ اور عصمتوں کا سوداگر ایک مہذب انسان اور اچھا شوہر بن کر استنبول میں وقت گزارنے لگا۔ شراب اور تمباکو نوشی اس معاشرے میں معیوب خیال نہیں کئے جاتے۔ اس لئے سرور سعید بٹ پر کوئی قدغن نہ تھی۔ اس کی بیوی اور سالی فیشن اور اسپورٹ گارمینٹس بنانے کی ماہر تھیں۔ اس لئے سرور سعید بٹ نے ان کی مدد اور شراکت سے گارمینٹس کی فیکٹری لگا لی تھی۔ یہ چھوٹی سی فیکٹری ان کی گزر اوقات کے لئے کافی تھی۔ یہ کام چل نکلا مگر سائیڈ بزنس کے طور پر وہ پاکستان سے حشیش اور ہیروئن منگوا کر یورپی ممالک کے گاہکوں کو سپلائی کر کے ان کی خدمت کرتا رہتا۔ جس کی وجہ سے اس کا بنک بیلنس مسلسل بڑھتا رہا۔ اور نارکوٹس کا بے تاج بادشاہ بن کر ورلڈ مافیا کا سرگرم رکن بن گیا۔ اس نے اپنے اس کاروبار کو وسعت دینے کی غرض سے ہالینڈ جیسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر ایمسٹرڈیم میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ پھر راٹر ڈیم اور ہیگ میں اپنے خفیہ دفاتر قائم کر لئے۔ اور اپنے پراعتماد ساتھیوں کو وہاں سیٹ کر دیا۔

اگست 1986ء میں فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر کی حیثیت میں ترکی میں ایک ہائی پاور وفد لے کر گیا تھا۔ استنبول میں اس روز یونین چیمبر آف ترکی' کی طرف سے ریسیپشن میں ہم لوگ شرکت کے لئے پہنچے۔ تو ترکی چیمبر کے صدر نے ہمیں خوش آمدید کہا اور پھر اپنے ممبران ایگزیکٹو کمیٹی سے ہمارا تعارف کرایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے سرور سعید بٹ کو اس تعارفی تقریب کے آخر میں وہاں قطار

میں کھڑا پایا۔

میں نے اس سے ملنے کے بعد پوچھا کہ تم کہاں ہو؟

سرور سعید بٹ: میں پچھلے کئی سالوں سے یہاں ہوں۔

میں اس وقت بڑی جلدی میں تھا۔ اس لئے اسے بعد میں ملنے کو کہہ کر آڈیٹوریم میں پہنچ گیا۔ تین گھنٹوں بعد اس سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی۔ تو میں نے اسے اپنے ہوٹل کا پتہ دے کر شام پانچ بجے ملنے کے لئے کہا۔ جو اس نے بسرو چشم قبول کر لیا۔

پانچ بجے سرور سعید بٹ میرے ہوٹل سوئیٹ میں آیا۔ تو میں نے پوچھا۔

میں: تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں آجکل استنبول میں ہوں۔

سرور سعید بٹ: میں پرسوں ترکی کے ٹیلیویژن پر خبریں سن رہا تھا کہ ایک دم اسکرین پر آپ کی تصویر آگئی۔ آپ غالباً ازمیر شہر کا دورہ کر رہے تھے۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ یہ میرا ہم جماعت ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر میں نے پاکستان ایمبیسی کے کونسل جنرل مسٹر طارق پوری سے پوچھا کہ آپ کب استنبول آ رہے ہیں۔ تو انہوں نے بتایا کہ کل شام یہاں پہنچ جائیں گے۔ انہی سے مجھے پتہ چلا کہ آپ کی بیگم اور چھوٹے بھائی بھی ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ اس طرح میں ترکی چیمبر آف کامرس میں پہنچ گیا۔ اور آپ سے ملاقات ہو گئی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ تم استنبول میں کب سے ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟

سرور سعید بٹ: میں پچھلے پانچ برسوں سے ادھر ہوں۔ یہاں میں نے ایک ترک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اور گارمینٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری چلا رہا ہوں۔ بہرحال اچھی گزر اوقات ہو رہی ہے۔ پھر کہنے لگا۔

سرور سعید: کیا میں اپنی بیوی اور سالی کو بھابھی اور آپ سے ملانے لا سکتا ہوں۔ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔

میں نے جواب دیا۔ کیوں نہیں۔ ہمیں خوشی ہو گی۔ آپ کل اسی وقت آ جائیں۔ اور چائے ہمارے ساتھ پئیں۔

چنانچہ وہ اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ رات کو چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز استنبول نے ہمارے اعزاز میں ڈنر دے رکھا تھا۔ اور عشائیہ کے بعد محفل موسیقی منعقد کی گئی تھی۔ بڑی رنگین و دلنشیں محفل تھی۔ وہاں کے فنکاروں نے ترکی کے لوک گیت اور ڈانسز بڑے دلکش انداز میں پیش کئے تھے۔ یہ دلفریب اور پرلطف محفل کافی رات گئے

تک جاری رہی۔

دوسرے دن پانچ بجے بعد دوپہر سرور سعید بٹ اپنی معصوم اور پری جمال دلہن اور سالی کے ہمراہ آئے۔ تو ہم نے انہیں عزت اور احترام سے خوش آمدید کہا۔ وہ انگلش اور اردو نہ جانتی تھیں۔ اور ہم "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے مصداق ہماری بات بذریعہ سرور سعید بٹ کے ہو رہی تھی۔ جو ترجمان کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ ہمیں وہ Presidential Suits اس فائیو اسٹار ہوٹل انٹر کانٹینینٹل کے ٹاپ فلور پر دیا گیا تھا۔ اس کا کرایہ دس ہزار ڈالر سے کسی صورت کم نہ ہو گا۔ اس میں وسیع و عریض بیڈ روم' کشادہ ڈرائنگ' ڈائننگ' سیکریٹری اسٹینو روم دو باتھ وغیرہ شامل تھے۔ سرور سعید بٹ کی بیگم اور سالی یہ پرتعیش اور پر آسائش سوئٹ دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ پھر انہیں ہم نے پرتکلف چائے پیش کی۔ جس سے وہ بہت مطمئن دکھائی دینے لگیں۔ پھر بیگم سرور سعید بٹ نے ہمیں رات کھانے پر مدعو کرنا چاہا۔ لیکن ہم نے معذرت کر لی۔ کیونکہ ہمارے تمام لنچ و ڈنر سرکاری طور پر فکس تھے۔ البتہ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔ لیکن بیگم کا آنا ممکن نہ ہو گا۔ کیونکہ دوسری مصروفیت آڑے آئیں گی۔

دو دن بعد میں اپنے سیکریٹری جنرل فیڈریشن کو ساتھ لے کر سرور سعید بٹ کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ چھوٹا سا گھر بڑی خوبصورتی اور سلیقہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ گھر کی صفائی' زیبائش و آرائش میں بڑی نفاست دکھائی دی۔ یہ ترکی عورتوں کے حسن ذوق اور عمدہ ہنر مندی کی معین دلیل تھی۔ جو قابل تعریف تھی۔ پھر جس مہذب اور شائستہ انداز مہمان نوازی کا مظاہرہ چائے اور اسنیکس سرو کرنے میں دیکھا۔ وہ میں آج تک نہیں بھول پایا۔

گھر سے ملحقہ چھوٹی سی گارمینٹس کی مینو فیکچرنگ فیکٹری بڑے قرینے اور دلاویز انداز میں سیٹ کی گئی تھی۔ سرور سعید بٹ کی بیگم اور اس کی بہن دونوں اس یونٹ کو بڑے احسن طریقے سے چلا رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں چند ٹریک سوٹ' پتلونیں اور شرٹیں بھی تحفہ کے طور پر دیں۔ الغرض یہ خاصا دلچسپ اور پرلطف ٹور تھا۔

اگلے سال دوبارہ مجھے جنرل ضیاء الحق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ساتھ استنبول جانے کا اتفاق ہوا۔ تو پھر سرور سعید بٹ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ میرے ساتھ دو گھنٹے تک رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ وی آنا (آسٹریا) میں ہیروں کے کاروبار میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس

لئے اس نے وہاں ایک نہایت مشہور و معروف جواہرات کی ایک فرم میں ملازمت اختیار کر لی ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس طرح جواہرات کی پہچان' خرید و فروخت اور اس کاروبار کے نشیب و فراز سے واقفیت ہو جائے گی۔ اور وہ آئندہ کے لئے یہی پروفیشن اپنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اگلے ہفتے ہی استنبول کو خیرباد کہہ کر وی آنا سیٹل ہو جائے گا۔

سرور سعید بٹ بڑا چالاک و ہوشیار اور زیرک شخص ہے۔ وہ حالات اور واقعات کے مطابق اپنے آپ کو اسی ماحول میں ڈھال لیتا ہے۔ وہ بہ یک وقت اردو' انگریزی' فارسی' عربی' ترکی اور فرانسیسی زبان جانتا اور بول لیتا ہے۔ اس کے پاس کئی ملکوں کی قومیت (Nationality) اور پاسپورٹ ہیں۔ ظاہر ہے کہ سرور سعید بٹ نے یہ سب کچھ ریا کاری اور غلط بیانی سے حاصل کیا ہے۔ ورنہ عام حالات میں ایسا ممکن نہیں۔ سرور سعید بٹ اب کھل کر اپنے مکارانہ اور عیارانہ حربوں کو عملی شکل میں پیش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی حیا' ضمیر کی پکار' انسانی اقدار اور اخلاقی اطوار کا جنازہ نکل چکا تھا۔ وہ اب مکمل طور پر شیطانی چنگل میں پھنس چکا تھا۔ جواہرات کے شو روم اور شاپ میں کام کرنا اس کی خباثت اور عیاری کی کوئی گہری چال ہی ہو سکتی تھی۔ وہ یقیناً کسی بڑے چکر میں سرگرداں تھا۔ اپنے (Employers) مالکان کو شیشے میں اتارنا اور اپنی ایمانداری اور دیانتداری کے بارے میں ان کا مکمل اعتماد حاصل کرنا اس کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ ایسے بیشمار مراحل سے گزر چکا تھا۔ اس لئے وہ ایسی تمام آزمائشوں اور امتحانات کے لئے تیار تھا۔ ویسے بھی اپنے ناپاک اور شرمناک ارادوں کو بروئے کار لانے کے لئے پورا حوصلہ اور دلیری رکھتا تھا۔ اب اسے اس عظیم ادارے میں کام کرتے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور وہ اپنی مستعدی' پیشہ ورانہ صلاحیت اور تدبر سے اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب تھا۔ کمپنی اس کی محنت شاقہ' لگن اور ایمانداری کو مدنظر رکھتے ہوئے چھوٹی موٹی جواہرات کی کھیپ کی سپلائی کے لئے دوسرے ساتھی ملازمین کے ہمراہ اسے بھیجنے لگی تھی۔ ایک دن کسی مخبر کی رپورٹ پر دو مسلح راہزنوں نے ان کی ویگن پر اچانک حملہ کر دیا۔ ویگن اس وقت پوری رفتار سے مین شاہراہ پر جا رہی تھی۔ اتفاق سے سخت دھند کی وجہ سے Visibility (نظر آنا) بڑی خراب تھی۔ سرور سعید بٹ نے اس وقت اپنے ہوش و حواس قائم رکھے۔ اور گاڑی کے رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر کودا اور پلک جھپکنے سے پہلے ہی ایک ڈاکو پر تیزی سے جست لگا کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ اور اسی لمحے اس پر فائر کر دیا۔ اس دوران دوسرے ڈاکو

نے حواس باختہ ہو کر سرور سعید بٹ پر فائر کھول دیئے- دو گولیاں سرور سعید بٹ کے بازو پر لگیں- اور وہ زمین پر گر پڑا- ڈاکو اس دوران اپنے زخمی ساتھی کو وہیں پر چھوڑ کر گھبراہٹ میں فرار ہو گیا- اتنے میں سڑک پر چلنے والی گاڑیاں فائرنگ کی آواز سن کر موقعہ واردات پر جمع ہو گئیں- چند منٹوں میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی- اور فوری طور پر دونوں زخمیوں کو ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال پہنچا دیا- سرور سعید بٹ کا خاصا خون بہہ چکا تھا- مگر اس نے کافی دلیری اور جوانمردی سے کام لیتے ہوئے اپنے اوسان قائم رکھے- پھر آپریشن کر کے اس کے بازو سے دونوں گولیاں نکال لی گئیں- اور ڈاکٹروں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا- دوسری طرف پولیس نے ایک ڈاکو کو باقاعدہ حراست میں لے لیا- اور اس سے دوسری ساتھی کی تفصیل اور ایڈریس حاصل کر لیا-

کمپنی کے ڈائریکٹران کو جب سرور سعید بٹ کی اس دلیری اور شجاعت کے کارنامہ کا پتہ چلا- تو وہ خود ہسپتال میں اس کی تیمار داری کے لئے تشریف لائے- اور اسے اس کی حوصلہ مندی اور بہادری پر خراج تحسین پیش کیا- اور جواہرات کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے جان کی بازی لگانے پر قیمتی انعامات سے نوازا- اس کو ترقی مل گئی- ساری کمپنی میں اس کی عظیم قربانی اور ایثار کا خاصا چرچا ہوا- اور اس کی دفتر میں دھاک بیٹھ گئی- یہ اس کی زندگی کا سب سے گرانقدر اور بیش بہا سرمایہ تھا- جس کا اسے شدت سے انتظار تھا- ایک ماہ بعد سرور سعید بٹ کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا- اور اسے ایک نئے اور کشادہ اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا- جسے کمپنی نے اس کے لئے خاص طور پر حاصل کیا گیا تھا- اور ایک جواں سال حسین و جمیل نرس اس کی خدمت پر مامور کر دی- جو چند ہفتوں بعد اس کی گھر والی بن گئی- یہ سانحہ سرور سعید بٹ کے لئے بڑا معرکہ خیز اور سودمند ثابت ہوا-

دو ماہ بعد وہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا- اب وہ ڈائریکٹران کا چہیتا اور ساتھی ملازمین کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا- سبھی لوگ اس کو چاہت اور شفقت کی نظر سے دیکھنے لگے- اور اس کا اعتماد اس کے حسب منشاء بحال ہو گیا- وہ کسی ایسے سنہری موقعہ کی تلاش میں تھا- جس کے لئے اس نے ساری زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی- اسی دوران کمپنی کے ڈائریکٹران نے ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) اور پراگ (چیکو سلواکیہ) کی ڈائمنڈ کٹنگ فیکٹریز کا دورہ کر کے ان سے اعلیٰ کوالٹی کے ہیروں کی ایک بہت بڑی کھیپ (Consignment) کا سودا کر لیا- ان نادر ہیروں اور انمول جواہرات کی ڈلیوری دو ماہ بعد کمپنی کو ملنی تھی- ظاہر ہے کہ کروڑوں ڈالرز کی

مالیت کی یہ کھیپ نہ صرف انشورنس ہونی تھی- بلکہ اسے وی آنا لے جانے کے لئے خاص لمبی چوڑی ڈبل اسکیوریٹی کا بھی بندوبست ہونا تھا- بہرحال ڈائریکٹران کمپنی نے اس امر کو صیغہ راز میں رکھا- اور جواہرات سپلائی کرنے والی فرم سے ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ طے کر لیا کہ ہیرے کس طرح وی آنا پہنچائے جائیں-

پھر ایک دن سرور سعید بٹ کو ڈائریکٹر جنرل نے اپنے دفتر میں بلا کر تاکید کی کہ وہ آج ہی کمپنی ہذا کے اکاؤنٹنٹ ان چیف کے ساتھ پراگ جائے- اور وہاں سے ایک سرجیکل انسٹرومینٹس بنانے والی فرم سے ایک بریف کیس کی ڈلیوری لے کر شام کو واپس پہنچ جائے- اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اکاؤنٹنٹ ان چیف کے پاس وہ چٹھی ہے- جس کے پیش کرنے پر تم لوگوں کو وہ بریف کیس مل جائے گا- اور یاد رکھنا اس بریف کیس میں بڑے نازک اور قیمتی Surgical instruments ہیں- جنہیں بڑی حفاظت اور احتیاط سے یہاں لانا ہے- اس بریف کیس میں نمبروں والا تالا لگا ہو گا- اس لئے وہ بغیر نمبر کے کھولا نہ جا سکے گا- لہٰذا آپ لوگ اسے کھولنے کی زحمت نہ کریں- تو بہتر ہو گا- اکاؤنٹنٹ ان چیف کے پاس ہوائی جہاز کے واپسی ٹکٹ ہیں- اور ضروری اخراجات کے لئے رقم بھی-

سرور سعید بٹ : بہت بہتر سر- تعمیل حکم ہو گی- اور وہ بریف کیس آپ کے فرمان کے مطابق بحفاظت یہاں لے آئیں گے- ہمیں اسے کھولنے کی چنداں ضرورت نہ ہو گی یہ کہہ کر وہ ڈائریکٹر جنرل کے کمرے سے باہر آ گیا-

باہر آ کر اس نے سوچا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے- اس کمپنی کو سرجیکل انسٹرومینٹس خریدنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ یقیناً کوئی چکر لگتا ہے- بہرحال اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ گھڑی آ گئی ہے جس کا اسے مدتوں سے انتظار تھا- وہ دفتر سے باہر گیا- اور سڑک کے پار قریبی میڈیکل اسٹور سے کوئی ضروری دوا لے کر واپس دفتر میں آ کر اکاؤنٹنٹ ان چیف مسٹر ڈیوڈ اسٹیل سے ملا اور پھر وہ دونوں کمپنی کی کار میں ایئرپورٹ چلے گئے- دو گھنٹے بعد پراگ کی اس فرم سے بریف کیس لے کر ایک ریسٹوران میں لنچ کے لئے چلے گئے- اندر ڈائننگ ہال میں ایک طرف میز کے پاس دو بچھی ہوئی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے- پہلے انہوں نے دو بڑے گرافٹ بیر کے گلاس منگوائے- اس وقت اکاؤنٹنٹ ڈیوڈ اسٹیل ٹائیلٹ گیا- تو یہ سرور سعید بٹ کے لئے نادر موقعہ تھا کہ وہ اس کے گلاس میں نیند آور سفوف ڈال دے- جو اس نے ہال میں موجود دوسرے لوگوں کی

نظروں سے بچا کر ڈال دیا- چند منٹوں بعد ڈیوڈ اسٹیل بھی واپس آ گیا- اور ٹھنڈی گرافٹ بیر کو منہ سے لگا کر تیسرا حصہ گلے کا اپنے حلق میں اتار چکا تھا- اور بقایا بیر کھانے کے ساتھ ختم کی- تھوڑی دیر بعد اکاؤنٹنٹ ان چیف مسٹر ڈیوڈ اسٹیل پر غنودگی نے غلبہ پا لیا- اور وہ بہت جلد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یہیں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا- سرور سعید بٹ نے وہ موقعہ غنیمت جانا- اور بریف کیس کے علاوہ اس کی جیبوں سے ہوائی جہاز کے دونوں ٹکٹ اور بٹوا اڑا کر ائیر پورٹ چلا گیا- وہاں سے نئی ٹکٹ خرید کر وہ بریف کیس کے ساتھ سیدھا کراچی پہنچ گیا- جہاں پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا- اسی شام وہ لاہور آ گیا-

اگلے روز وہ اپنے گھر کے بیرونی بیٹھک نما کمرے کو اندر سے کنڈی لگا کر بڑے اطمینان سے بریف کیس کھولنے کی کوشش کرنے لگا- اب وہ چونکہ اپنے گھر میں تھا- اور اسے بریف کیس کھولنے کی کوئی جلدی بھی نہ تھی- مگر اس جادوئی بریف کیس کی حقیقت جاننے کے لئے کہ اس میں کیا ہے؟ اس کے لئے البتہ وہ خاصا مضطرب تھا- وہ درحقیقت شیطانی قوتوں اور پراسرار طاقتوں کا مالک تھا- اس لئے کسی نہ کسی طرح بریف کیس کھولنے میں کامیاب ہو گیا- بریس کیس کھلا تو اس میں سرجیکل آلات دیکھ کر وہ گھبرا گیا- اس کی اتنی بڑی جدوجہد رائیگاں جاتے دکھائی دی- پھر اس نے بریف کیس کی مکمل طور پر چھان بین کی- تو ان آلات کے نیچے ایک دس انچ' چھ انچ' تین انچ کے ڈبے میں اسے وہ مطلوبہ چیز مل گئی- جس کے لئے وہ تگ و دو کر رہا تھا- اس مخمل کے ڈبے میں اسے جگمگاتے اور چمکتے دمکتے ہیرے مل گئے تھے- جن کی مالیت تیس کروڑ روپوں سے زیادہ تھی- سرور سعید بٹ اب کروڑوں پتی بن چکا تھا- اس نے ترکی یا ایرانی پاسپورٹ پر سفر کیا تھا- یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا- اور نہ ہی اس کی کھوج لگانا کسی کے بس میں تھا- انٹرپول کئی سالوں تک اس معاملے میں تفتیش کرتی رہی- مگر سرور سعید بٹ ان کی عقابی نظروں سے محفوظ رہا- مگر پروردگار تو اس کی ہر شیطانی حرکت اور جرم کو دیکھ رہا تھا- "اس کے گھر دیر ہے- اندھیر نہیں-" انسان اپنے گھناؤنے ہتھکنڈوں' ظلم و ستم' فریب دہی اور ریاکاری سے کمائی ہوئی دولت پر کہاں تک عیش کر سکتا ہے- یہ کوئی نہیں جانتا کہ کب غیبی ہاتھ حرکت میں آ جائے اور وہ ایسے تباہ و برباد کر دیئے جائیں- کہ لوگ انہیں دیکھ کر عبرت حاصل کریں- چنانچہ سرور سعید بٹ کے ساتھ بھی یہی ہوا-

ایک دن وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ فیصل آباد جا رہا تھا کہ اچانک سامنے سے آنے والی ایک

بس اس کی کار سے ٹکرا گئی- ڈرائیور اور اس کا جوان سال بیٹا تو موقعہ پر ہی ہلاک ہو گئے- اور سرور سعید بٹ سخت مضروب حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا- تو ڈاکٹروں نے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دیں- کیونکہ وہ مکمل طور پر ناکارہ ہو چکی تھیں- اس کی بیوی یہ خبر سن کر اگلے جہاں سدھار گئیں- اور اس طرح یہ ہنستا بستہ گھر چند دنوں میں نشان عبرت بن کر رہ گیا- سچ ہے- بدی کا انجام ہولناک ہی ہوتا ہے-

○

چاچا گام

چاچا گام ہمارے شہر کی بڑی اہم اور دلچسپ شخصیت ہے۔ اس کا اصل نام تو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ مگر چاچا گام سے ہر کوئی واقف ہے۔ شادی بیاہ کی رسم ہو یا خوشی کی محفل یا پھر کوئی مرگ کا اجتماع ہو' چاچا گام وہاں موجود ہو گا' اور اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی شجاعت' ذہانت کاریگری' مہم جوئی' شکاری زندگی اور جوانی کے قابل فخر کارنامے اور دلچسپ قصے سنا رہا ہو گا۔ بات آدم خور شیروں کی ہو' یا جنات کی۔ قصہ یورپ کی سیر و سیاحت کا ہو' یا کسی دور دراز مہذب ملک کا۔ ہوائی جہاز کی ایجاد کا ذکر ہو' یا کسی ایٹم بم کا۔ کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا تذکرہ ہو' کسی ریاست کے نواب یا مہاراجے' نباتات کی اقسام زیر بحث ہوں یا پرندوں کی۔ تاریخی واقعات پر تبصرہ ہو رہا ہو' یا ادب اور سیاست پر' ہر فن مولا چاچا گام اپنی وسیع معلومات اور ذاتی تجربات سے سامعین کو مستفید کرتا رہتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس کے علم' تجربات یا کمالات کو تسلیم نہ کرے۔ چاچا گام اکثر اوقات ایسی انوکھی روایات اور ناقابل یقین تجربات بیان کرتا ہے کہ سننے والا محو حیرت ہوتا ہے۔ اس کی نرالی باتیں بعض اوقات انتہائی مضحکہ خیز ہوتی ہیں' مگر وہ اپنے چہرے کی سنجیدگی کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتا۔

چاچے گام کا اصل نام غلام علی ہے۔ وہ آبادی حاکم رائے گلی مستریاں گوجرانوالہ میں 1901ء میں ایک متوسط لوہار خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ محکمہ مال میں تین سال پٹواری رہا۔ پھر بقول چاچا افسران بالا نے اعلیٰ کارکردگی سے خوش ہو کر اسے افسر مال بنا دیا۔ لائل پور کا نقشہ اور نشاندہی چاچے گام کے باپ نے تیار کی تھیں۔ اگر چاچے گام کا والد محکمہ مال میں نہ ہوتا تو آج پاکستان کا یہ مشہور صنعتی شہر لائل پور دنیا کے نقشے پر نہ ہوتا۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد چاچے گام کے باپ نے لوہے کی کرسیاں' آہنی سیف اور الماریاں وغیرہ بنانے کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس کے دونوں بڑے لڑکے (چاچے کے بھائی) فیکٹری میں

خود بھی کام کرتے تھے۔ آمدنی معقول تھی۔ چاچا اپنے والدین کا سب سے چھوٹا لڑکا ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلا تھا۔ فکر معاش اور غم روزگار سے بے نیاز ساری عمر اس نے اپنے ہاتھوں سے کوئی کام نہیں کیا۔ اچھے سے اچھا کھانا کھاتا۔ عمدہ سے عمدہ لباس پہنتا۔ اور سارا دن دوستوں کی محفلیں آباد کرتا۔

اسی سلسلے میں چاچے کے بڑے بھائی نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا جو اسی کے الفاظ میں ہی پیش کیا جاتا ہے۔ 1930ء میں ہم نے لوہے کی کرسیاں بنانے کا بہت بڑا ٹھیکہ لیا۔ تھوڑی ہی مدت میں مکمل سپلائی کرنا تھی۔ کام کرنے والوں کی کمی تھی۔ اس لئے ہم نے گام کو کہا کہ کل سے وہ باقاعدہ فیکٹری میں حاضری دے۔ اور کام کرے۔ اگلے روز گام اچانک بیمار ہو گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی' اور بدن کے تمام جوڑ سخت درد کرنے لگے۔ گھر والے بہت پریشان ہوئے۔ ہم نے تین روز مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کرایا۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پھر شہر کے بڑے ڈاکٹر جو ہمارے باپ کے گہرے دوست تھے' کو بلایا۔ ڈاکٹر صاحب گام کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے معائنہ کیا' تو جان گئے کہ گام مکر کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا دی' جو انتہائی کڑوی تھی اور کہا کہ یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔ اگر یہ دوا کھانے کے بعد دو گھنٹے کے اندر اندر مریض نے بولنا شروع نہ کیا تو مجھے اس کے دماغ کا اپریشن کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد گام نے بولنا شروع کر دیا اور اپریشن کے خوف کے باعث اس کی مصنوعی بیماری کا راز کھل گیا۔

چاچا سکول اور ہسپتال میں داخل ہونے کے سخت خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستر سال کی عمر میں اگر اسے کسی سکول میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو وہ تعلیم حاصل کرنے کی نیت سے نہیں گیا بلکہ الیکشن میں ووٹ ڈالنے یا پھر کسی بارات کے ساتھ گیا ہو گا' کیونکہ ان تقریبات کا اہتمام اکثر سکولوں اور مدرسوں کی عمارات میں ہوتا ہے۔ چاچا بالکل ان پڑھ ہے مگر بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے اس کے علم اور وسیع معلومات کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہیں۔ اور اس کی قابلیت کا لوہا مانتے ہیں۔ چاچے گام کے دوست ہر ملک میں ہیں اور وہ اسے اپنی اپنی زبانوں میں چٹھیاں لکھتے ہیں جو چاچا آسانی سے پڑھ کر سمجھ لیتا ہے۔

دس سال قبل چاچے گام کو ایران سے ایک دوست نے فارسی میں خط لکھا تھا۔ چاچے نے وہ خط کئی فارسی دانوں اور پروفیسروں کو پڑھنے کے لئے دیا' مگر کوئی بھی خط کی عبارت کا

مطلب نہ سمجھ سکا- چاچا خود ہی بتاتا ہے کہ پاکستان بھر میں صرف دو ہی ہستیاں ایسی تھیں' جو اس خط کا مطلب سمجھ سکی تھیں- ایک تو بے چارہ خط پڑھتے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا' اور دوسرے کی آنکھیں ایسی خراب ہوئیں کہ کئی سال تک ڈسکہ ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے باوجود اس کی بینائی ٹھیک نہ ہوئی-

چاچے کو جوانی میں پہلوانی کا بہت شوق تھا اور اسے کوئی جن آ کر روزانہ اکھاڑے میں ورزش کرایا کرتا تھا کیونکہ کسی انسان میں اتنی ہمت اور طاقت کہاں تھی کہ وہ چاچا سے کشتی لڑتا- اس بات کا ذکر وہ اکثر محفلوں میں کر چکا ہے- جوانی کے دنوں میں دس سیر گوشت کی یخنی' چار مرغ' پچاس انڈے' دس سیر دودھ' پانچ سیر دہی' ایک سیر گھی' آدھ سیر مکھن اور دو سیر بادام اس کی روزمرہ کی خوراک تھی-

پتنگ بازی' بٹیر بازی' کبوتر بازی اور نیزہ بازی کا چاچے گام کو بہت شوق ہوا کرتا تھا مگر مرغ بازی سے تو اسے دیوانگی کی حد تک عشق تھا- جو آج بھی اتنی ہی شدت سے قائم ہے- مرغوں کے لڑنے کا مقابلہ اگر ایک ہزار میل دور ہی کیوں نہ ہو' چاچا گام بڑے انہماک اور پابندی سے وہاں پہنچتا اور مقابلے کے چشم دید حالات چٹخارے لے کر دوستوں کو سنایا کرتا- گام اکثر سناتا ہے کہ کس طرح مرغ بازی کا مقابلہ دیکھنے کے لئے وہ بذریعہ بحری جہاز گوجرانوالہ سے کابل پہنچا- اور وہاں بے نظیر دنگل دیکھا تھا- وہ خود بھی درجنوں عمدہ نسل کے لڑنے والے مرغ پالا کرتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا تھا- ایک دفعہ اس کے شیرافگن مرغ کی مقابلے میں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی- کافی علاج معالجہ کے بعد بھی جب ٹانگ نہ جڑی تو چاچے گام نے دھات کا کڑا ٹانگ پر چڑھا دیا- یہ اس کی کاریگری اور ذہانت کا بلا شبہہ شاہکار تسلیم کیا گیا-

تقسیم ملک سے قبل مرغ بازی کے شوق کی بدولت ہی ریاست منی پور کے مہاراجہ سے اس کی گہری دوستی ہو گئی تھی- چاچا خود ہی بتاتا ہے کہ ایک دفعہ منی پور کے راجہ کا چہیتا مرغ بیمار ہو گیا- اس نے بہت سے ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کروایا' مگر مرغ شفایاب نہ ہو سکا- مہاراجہ مرغ کی بیماری کے غم میں خود بھی نڈھال ہو رہا تھا- آخر کسی جوہر شناس نے چاچے گام کا تذکرہ کیا کہ مرغ کو صرف وہی ٹھیک کر سکتا ہے- مہاراجہ نے اپنا وزیراعظم چاچے کے پاس بھیجا- وزیراعظم کی منت سماجت کے پیش نظر چاچا گام اپنی تمام

گوناگوں مصروفیات کو چھوڑ کر اس کے ہمراہ منی پور چلا گیا- ریاست میں پہنچ کر چاچے نے دیکھا کہ تمام شہر سوگوار ہے- راجہ کے محل کے باہر ہزاروں لوگ مرغ کی صحت یابی معلوم کرنے کے لئے جمع تھے' اور ان سب کے چہرے مغموم تھے- محل کے اندر سینکڑوں ملازمین مختلف ادویات تیار کرنے میں مصروف تھے- چاچے نے وہاں پہنچ کر پہلے مریض کا بغور معائنہ کیا' اور اس کی بیماری پہچان گیا- پھر ادویات تیار کرنے والوں کو چھٹی دے دی' اور اپنی جیب سے ادویات کی چند شیشیاں نکال کر نسخہ تیار کر کے مرغ کو کھلا دیا- آدھ گھنٹے کے بعد مرغ نے اذان دے دی- مہاراجہ اور درباریوں کے پژمردہ چہرے خوشی سے کھل اٹھے---- ہر طرف سے "دھنیہ واد" اور "مبارک ہو" کی بلند صدائیں سنائی دینے لگیں- پھر چند روز ہی میں مہاراجہ کا لخت جگر مرغ بالکل تندرست ہو گیا- مرغ کی چونچ ٹوٹی ہوئی تھی- چاچے نے پوری چونچ اتار کر پیتل کی نئی چونچ تیار کر کے لگا دی- مہاراجے نے جب مسیحائی کا یہ کمال دیکھا- تو عش عش کر اٹھا اور چاچے گام کو گلے لگا لیا- اس طرح دونوں کے درمیان دوستی کا عہد و پیمان ہوا- چاچا دو ماہ ریاست کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتا رہا- پھر مہاراجہ نے بے شمار دولت اور قیمتی جواہرات بطور نذرانہ پیش کر کے اپنے دوست کو رخصت کیا-

مرغ بازی ہی کے طفیل مہاراجہ پٹیالہ- نواب ملیر کوٹلہ- "ہند بلبل" رانی نابھ ایک سابق وزیراعظم پاکستان- ایک سابق گورنر مغربی پاکستان اور کئی بڑے بڑے لوگ اور رئیس زادے چاچے گام کے دوست بنے-

ایک ماتم کی محفل میں پتنگ بازی کا ذکر چھڑا- چاچا گام بھی وہاں موجود تھا- اس نے اپنا کارنامہ یوں بیان کیا- بسنت کے تہوار پر اس نے ایک پتنگ خرید کر کے اس پر سو سو روپے کے دو نوٹ دستخط کر کے دونوں طرف چسپاں کر دیئے اور گوجرانوالہ سے وہ پتنگ اڑائی- جب اڑتی ہوئی پتنگ دور آسمان پر پہنچی اور بڑی ہی چھوٹی نظر آنے لگی تو چاچے گام نے کسی اور پتنگ سے پیچ لڑا دیا- دونوں پتنگیں اڑتی رہیں' حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں- چاچا ڈور دیتا رہا- یہاں تک کہ ایک من ڈور جو اسٹاک میں موجود تھی ختم ہو گئی- پھر چاچا نے پتنگ ہاتھ سے چھوڑ دی- چاچے کی پتنگ جموں میں مہاراجہ کے محل میں گری- مہاراجہ اس وقت باغ میں بیٹھا تمازت آفتاب کا لطف اٹھا رہا تھا- مہاراجہ نے خود پتنگ اٹھائی اور سو سو روپے کے کرنسی نوٹ دیکھ کر ششدر رہ گیا- جب مہاراجہ نے غور سے دیکھا تو نوٹوں پر

اپنے جگری دوست چاچا گام کے دستخط پہچان گیا۔ پھر بذریعہ تار چاچے کو مطلع کیا اور اگلے ہی روز جموں جا کر چاچے نے وہ پتنگ واپس لی۔ اس طرح دو بچھڑے دوستوں کا ملاپ بھی ہو گیا۔

1932ء میں ریاست نابھ میں بٹیربازی کا بہت بڑا مقابلہ منعقد ہوا۔ جس میں برصغیر کے تمام بڑے بڑے بٹیرباز اور مرغ باز شریک ہوئے۔ مقابلے کا افتتاح نابھ کی رانی "ہند بلبل" نے کیا۔ چاچا گام بھی بڑے طمطراق سے وہاں جلوہ فگن تھا۔ رانی نے جب چاچے گام جیسا گھبرو اور خوبصورت نوجوان دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی اور اپنا دل ہار بیٹھی۔ اور پھر چاچے گام کو "ہند بلبل" کے حکم کے مطابق پورے دو سال ریاست نابھ میں رکنا پڑا۔ چاچے پر رانی ایسی لٹو ہوئی کہ دن رات اس کی خاطر مدارت میں مگن رہتی۔ چاچے نے یہ عرصہ بڑے امیرانہ ٹھاٹھ سے گزارا' اور پھر والد صاحب کی بیماری کا تار موصول ہونے پر اسے گھر آنے کی اجازت ملی۔

یہ 1935ء کا ذکر ہے۔ ایک انگریز کرنل جسے شکار کا بہت شوق تھا۔ اور اس نے شکاری کتے بھی پال رکھے تھے' چاچے کا گہرا دوست بن گیا۔ چاچا گام اکثر اس کے ساتھ شکار کھیلنے جاتا۔ چاچے نے ایک مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر اس انگریز کرنل کی جان بچائی تھی۔ لہٰذا اس پر خوش ہو کر اس نے ایک نایاب کمبل چاچے کی جوانمردی کے صلے میں تحفہ دیا۔ وہ کمبل آج بھی چاچے کے پاس ہے۔ کمبل بنانے والی کمپنی وہی ایک کمبل بنا کر ختم ہو گئی اور اسے دوسرا کمبل بنانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ کمبل کی عجیب و غریب خصوصیات ہیں۔ چاچا اکثر محفلوں میں اس کا تذکرہ یوں کر چکا ہے۔ ڈبل نمونیہ کے مریض کو دس منٹ کے لئے اس کمبل میں ڈھانپ دیں۔ مریض کو اتنی گرمائی پہنچے گی کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

اسی طرح ایک اور انگریز افسر نے جو غالباً کسی جگہ کا ڈپٹی کمشنر تھا' اور چاچے کا بڑا گرویدہ اور معتقد بھی' چاچے کو بجلی کا ایک ٹیبل فین تحفہ کے طور پر دیا۔ وہ پنکھا دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ جون کے مہینہ کی ایک گرم دوپہر کو چاچے نے وہی پنکھا اپنے مکان کے سب سے پچھلے کمرے میں لگایا۔ پنکھے کی ہوا اتنی تیز اور سرد تھی کہ اگلے دو کمروں سے ہوتی ہوئی صحن سے گزر کر وہ ڈیوڑھی میں پہنچ رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں بھینس بندھی ہوئی تھی۔ بھینس کو اس پنکھے کی تیز اور سخت ہوا سے نمونیہ ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ نمونیہ کی شدت

سے اللہ کو پیاری ہو جاتی کہ چاچے نے اس کمبل کو بھینس پر ڈال دیا اور وہ منٹوں میں تندرست ہو گئی۔ اس کے بعد چاچے نے پھر وہ پنکھا کبھی نہیں چلایا۔ ویسے وہ اب بھی چاچے کے پاس موجود ہے۔ کئی کولڈ سٹوریج والوں نے پنکھا کرایہ پر حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مگر چاچا رضامند نہیں ہوا۔ کمبل کی ایک اور خصوصیت کے متعلق چاچے نے انکشاف کیا کہ اگر مرغی کے انڈوں کو پانچ منٹ کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر رکھیں۔ تو وہ بوائل ہو جاتے ہیں۔

چاچا گام اپنے محیر العقول ذاتی مشاہدات کا بھی ذکر کرتا رہتا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً ایک دیہاتی میلے میں اس نے نو انچ اونچائی اور پندرہ انچ لمبائی کی زندہ گائے دیکھی تھی۔ اس کا تین انچ سائز کا بچھڑا بھی تھا' جو ماں کا دودھ بھی پیتا تھا۔ چاچے کے علاوہ ان دونوں کو سینکڑوں تماشائیوں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چاچے نے مزید انکشاف کیا کہ اس کو رام گائے کہتے ہیں اور وہ لنکا کے جنگلات میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔

ولایت کے متعلق چاچا بتا رہا تھا کہ وہاں ایک انگریزی فلم چلتی ہے۔ پردہ سیمیں پر کسی کلب یا باغ کی تصویر جب ابھرتی ہے تو سارا ہال خوشبو سے بھر جاتا ہے اور جب گھوڑوں کا اصطبل یا شراب خانے کا منظر سامنے آتا ہے تو بڑی ناگوار بو محسوس ہوتی ہے۔

ایک اور اجتماع میں چاچا اپنے نرالے ریڈیو کا ذکر کر رہا تھا کہ اس کے ریڈیو پر سپیشل (خاص) خبریں نشر ہوتی ہیں' جو کسی دوسرے ریڈیو پر نشر نہیں ہو سکتیں۔

دوسری جنگ عظیم کا ذکر چھڑا تو چاچا گام کہنے لگا کہ وہ دنیا کے سب سے عظیم جرنیل ہٹلر سے جرمنی میں ملا تھا' اور اس کے ساتھ رات کا کھانا بھی کھایا تھا۔ چاچے نے اس کو بڑے مفید مشورے بھی دیئے تھے۔ ہٹلر کی شکست کی وجہ صرف چاچے گام کے مشوروں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی۔

چاچے نے اپنی قوت سماعت کے متعلق بتایا کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور انگلستان میں ہونے والے بموں کے دھماکوں کی آواز وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر سنا کرتا تھا۔

جوانی میں چاچا ہمیشہ بوسکی یا کریپ کی قمیض پہنا کرتا تھا اور اس کے اوپر سلمٰی ستاروں والی واسکٹ' نیچے سفید لٹھے کی شلوار یا سرخ لاچا' سر پر کلہ اور مشدی لنگی۔ اس لباس میں

چاچا جب گھر سے نکلتا' تو اس کے انداز بھی شاہانہ ہوتے اور دیکھنے والے رشک کرتے۔

ایک دفعہ چاچا دوستوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا اپنے کارنامے سنا رہا تھا کہ کلے کا ذکر چل نکلا۔ چاچا گام کہنے لگا کہ میرا کلہ اتنا مضبوط ہے کہ لاٹھی اور تلوار کی ضرب بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور سر محفوظ رہتا ہے۔ ابھی یہ الفاظ چاچے کے منہ میں ہی تھے کہ ایک جوان جس کے ہاتھ میں موٹا گنا پکڑا تھا' اٹھا کر چاچے کے کلے پر زور سے دے مارا۔ گام ایک چیخ مار کر چارپائی سے گرا' اور بے ہوش ہو گیا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے چاچے پر عرق گلاب چھڑکا۔ منہ میں پانی ڈالا۔ تب کہیں اسے ہوش آیا۔ ہوش میں آنے کے بعد چاچے نے گنا سر پر مارنے کی وجہ پوچھی' تو اس شریر لڑکے نے جواب دیا کہ وہ کلے کی قوت آزما رہا تھا۔ اس پر چاچے نے سخت سرزنش کی اور بتایا کہ وہ کلہ جس کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ گھر پر ہے۔ سر والا کلہ تو معمولی ہے۔

گام کے پاس ایک پرانی اومیگا گھڑی ہے۔ یہ بھی کسی والئی ریاست (غالباً مہاراجہ فرید کوٹ) نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے پر دی تھی۔ اس گھڑی کی بھی بڑی داستانیں چاچا بیان کرتا ہے۔ یہ گھڑی صحیح وقت بتاتی ہے۔ کبھی کھڑی نہیں ہوئی۔ پچھلے پینتالیس سال سے اس کی مرمت یا صفائی کی ضرورت نہیں پڑی۔ گھڑی یہ بھی بتاتی ہے کہ کب اور کس جگہ بارش ہو گی۔ دن رات پانچ وقت معمول کے مطابق کلائی پر ہلکی سی چبھن کرتی ہے اور چاچے کو نماز کے متعلق خبردار کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چاچے گام نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ایک دفعہ مہاراجہ پٹیالہ کے ذاتی ہوائی جہاز میں چاچا سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنی ناک صاف کرنے کے لئے ہاتھ باہر نکالا۔ ہوا کے شدید دباؤ کی بدولت جھٹکا لگا اور چاچے کی گھڑی نیچے جا گری۔ چاچا بھاگتا ہوا پائلٹ کے پاس گیا اور اسے ہدایت کی کہ فوراً" جہاز کو نیچے لے جائے تاکہ گھڑی پکڑ لی جائے۔ پائلٹ نے فوراً" غوطہ لگایا اور چاچے نے ہاتھ باہر نکال کر گھڑی گرنے سے پہلے فضا ہی میں پکڑ لی۔ اس طرح چاچے کی یہ انمول گھڑی ضائع ہونے سے بچ گئی۔

ایک اجنبی محفل میں چاچا اپنی نادر گھڑی کی خصوصیات بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا کہ کسی نامعقول لڑکے نے چاچے کی گھڑی کے متعلق کچھ نازیبا کلمات کہہ ڈالے۔ بس پھر کیا

تھا۔ چاچا فوراً" غصے میں آ گیا اور کہنے لگا کہ تمہیں کیا تمہارے باپ کو بھی علم نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس نے مزید کہا کہ دنیا میں دو ہی اچھی قسم کی گھڑیاں ہیں۔ ایک "ا-یلجن" اور دوسری "ویلتھم" جاؤ جا کر تصدیق کر لو' پاکستان کے کسی گھڑی ساز نے ان کا نام بھی نہیں سنا ہو گا۔

ہمارے محلے میں احمد دین دودھ دہی کی دوکان کرتا ہے جو چاچا گام کا لنگوٹیا یار ہے۔ وہاں روزانہ رات کو پندرہ بیس بے فکرے دوست اکٹھے ہوتے ہیں اور رات گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ چاچا گام بھی بلاناغہ حقے کی نے منہ میں دبائے وہاں براجمان ہوتا ہے اور اپنے انوکھے تجربات سے حاضرین کو محظوظ کرتا ہے۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ چاچا جوانی میں شکار کا دلدادہ اور سیر و سیاحت کا رسیا ہوا کرتا تھا۔ چاچا اپنی شکاری زندگی کے سنسنی خیز واقعات بڑی روانی سے مزے لے لے کر سنا رہا تھا کہ کس طرح اس نے کجلی بن میں ایک بہت بڑے شیر کو صرف ایک خنجر کی مدد سے ہلاک کیا۔ کجلی بن کے متعلق چاچے گام نے انکشاف کیا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا جنگل ہے۔ یہ پونا سے پچیس میل دور واقعہ ہے۔ یہ کشمیر سے ہوتا ہوا افریقہ تک جا پہنچتا ہے۔ اس سے چھوٹا جنگل امریکہ میں ہے۔ بس دنیا میں دو ہی جنگل ہیں۔ کجلی بن کے ایک وحشی ناگا قبیلے کے متعلق چاچے نے بتایا کہ اس قبیلے کے مرد عورتیں مادر زاد برہنہ رہتے ہیں مگر جب یہ لوگ شہر آتے ہیں تو اپنے ستر ڈھانپ لیتے ہیں۔ جنگل کو لوٹتے وقت پھر ستر پوشی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ چاچا اس قبیلے کا دو روز مہمان رہا اور ان کے برہنہ جنگلی رقصوں سے لطف اندوز ہوا۔

اس جنگل میں چھوٹا سا شہر دوسا بھی ہے جو آگرہ سے ایک چھوٹی ریلوے لائن کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔ ہفتے میں ایک گاڑی وہاں جاتی ہے اور وہی اگلے روز واپس آتی ہے۔ چاچا وہاں اپنی فرم کے لئے آرڈر بک کرنے گیا۔ جب گاڑی ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچی تو چاچا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ریلوے اسٹیشن کے چاروں اطراف لوہے کی سلاخوں کا مضبوط جنگلا لگا ہوا ہے۔ جس کا دروازہ صرف گاڑی آنے اور جانے کے وقت کھلتا ہے۔ مسافروں کو اترتے ہی ہدایت ہوئی کہ جلدی جلدی شہر چلے جائیں۔ اس وقت چاچا نہ سمجھ سکا کہ اس ہدایت کا مطلب کیا ہے۔ دوسا شہر اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا اور سواری کا کوئی انتظام بھی نہ تھا۔ چاچا مقامی لوگوں کی معیت میں پیدل چل پڑا۔ جب شہر پہنچا تو قریباً چار

بجے کا وقت تھا اور لوگ اپنی دوکانیں بند کر رہے تھے- چاچا حیران ہوا کہ بازار اتنی جلد بند کیوں ہوتے ہیں- اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی- جب چاچا اپنے گاہکوں کے پاس پہنچا تو وہ بھی جلدی سے اپنی دوکان بند کرکے چاچے کو ہمراہ لے کر گھر چلے گئے- چاچا یہ دیکھ کر مزید حیرت زدہ ہوا کہ ہر گلی اور مکان کے آگے لوہے کی سلاخوں کے دروازے لگے ہوئے ہیں اور وہ بھی دھڑا دھڑ بند ہو رہے تھے- چاچے نے اپنے میزبانوں سے دریافت کیا کہ آخر یہ سبب کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ ٹھیک پانچ بجے جنگل سے بہت سارے شیر روزانہ شہر میں آ کر قبضہ کر لیتے ہیں اور صبح تک وہیں رہتے ہیں- اگر کوئی انسان نظر آ جائے تو اسے چیر پھاڑ دیتے ہیں- چاچے کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ پچھلے آٹھ سال سے اس مصیبت میں مبتلا ہیں- اب چاچے کی سمجھ میں ساری بات بھی آ گئی- شہر کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کرفیو لگا ہو- پھر ٹھیک پانچ بجے چاچے نے دیکھا کہ بڑے بڑے شیروں نے پورے شہر پر قبضہ کر لیا اور کمال بے نیازی سے ادھر ادھر دندناتے پھرتے ہیں-

اگلے روز چاچے نے وہاں کے مقامی باشندوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور انہیں اس بلائے ناگہانی سے بہت جلد نجات دلانے کا یقین دلایا- چاچے نے اپنی مدد کے لئے پانچ بہادر جوانوں کا انتخاب کیا- آبادی کے معززین اور بزرگوں نے چاچے گام کو موت کا یہ کھیل کھیلنے سے باز رکھنے کے لئے بڑی منت سماجت کی' مگر پہاڑوں اور چٹانوں سے ٹکرانے والا پختہ عزائم کا مالک گام اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا- چنانچہ چار بجے گام نے زرہ بکتر اور اپنا خاص کلہ پہن لیا- ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھال لئے چاچا مین بازار کے درمیان ایک کرسی رکھ کر بیٹھ گیا اور اپنے پانچ مددگاروں کو تیر کمان دے کر آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھا دیا- اور انہیں تاکید کی کہ وہ صرف اس صورت میں تیر چلائیں- جب چاچے گام پر دو سے زیادہ شیر اکٹھے حملہ آور ہوں' وگرنہ وہ تماشا دیکھتے رہیں- ساڑھے چار بجے بازار بالکل خالی ہو گیا اور ہو کا عالم طاری ہو گیا- اسلام کا یہ بہادر اور نڈر سپاہی جذبہ خدمت خلق سے سرشار سر پر کفن باندھے ان آفات کا انتظار کرنے لگا جنہوں نے ساری بستی کا چین اور سکون برباد کر رکھا تھا- ٹھیک پانچ بجے ایک بہت بڑا ہیبت ناک شیر بازار میں آ گیا اور چاچے پر پشت کی طرف سے حملہ آور ہوا- چاچا پوری طرح چوکنا تھا- شیر نے اپنا زبردست پنجہ چاچے گام کے کلہ پر مارا- مگر چاچا مضبوط کلے کی وجہ سے بال بال بچا اور نہایت پھرتی سے مڑ کر شیر کے

سنبھلنے سے پہلے گام نے تلوار شیر کے پیٹ میں گھونپ دی- شیر بڑے زور سے گرجا' اور زخمی ہو کر مزید مشتعل ہو گیا اور دوسری مرتبہ چاچے پر پنجہ مارا- اس دفعہ گام نے ڈھال سے وار روکا اور پلک جھپکنے سے پہلے تلوار کا ایسا وار کیا کہ شیر کی گردن تن سے جدا ہو گئی- چھت پر کھڑے نوجوان چاچے کی بے مثال پھرتی اور لاجواب بہادری دیکھ کر مبہوت رہ گئے- چاچے نے اس طرح اس رات پچاس شیروں کو جہنم رسید کیا' اور باقی شیر اپنے ساتھیوں کا عبرت ناک انجام دیکھ کر جنگل کو فرار ہو گئے- اگلے روز دوسا شہر کے عوام مارے خوشی کے ناچنے لگے- چاچے کو کندھوں پر بٹھا کر پورے شہر میں جلوس نکالا- "چاچا گام زندہ باد-" "نجات دہندہ پائندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی- ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہوئی- عوام والہانہ چاچے کی بلائیں لیتے رہے- پھر اس کی ہدایت کے مطابق شہر میں داخلے کے تمام دروازوں اور راستوں پر شیروں کی نعشیں لٹکا دی گئیں- اگلی تمام رات پھر چاچے نے بازاروں اور گلی کوچوں میں گھوم کر عوام کی حفاظت کی مگر کسی شیر میں اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ دوبارہ شہر کا رخ کرتا- اس طرح چاچے نے دوسا شہر کے عوام کا سکون لوٹا دیا- عوام نے اس کے نام پر مین بازار کا نام "گام بازار" رکھ دیا- ایک ہفتہ بعد جب گام واپس آیا تو تمام شہر اسے الوداع کہنے اسٹیشن پر آیا اور بڑے تپاک سے اسے رخصت کیا-

پاکستان بننے سے پہلے چاچا گام کراچی میں منعقد ہونے والا مرغ بازی کا مقابلہ دیکھنے گیا- وہاں وہ دو یوم تاج ہوٹل میں ٹھہرا- مگر یہ دو یوم اس کے لئے دو ماہ سے بھی زیادہ طویل ثابت ہوئے' وجہ صرف یہ تھی کہ چاچے کو اس کی باتیں سننے والے نہ مل سکے- مجبوراً اسے ہوٹل چھوڑ کر "مولے کی سرائے" میں جانا پڑا- وہاں چاچے کو من پسند سوسائٹی میسر آئی- جہاں وہ اپنے دل کا غبار نکال سکا- دوسرے روز چاچے کو ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اسے سرائے بھی چھوڑنا پڑی- بات یہ ہوئی کہ تیار ہو کر جب وہ بازار گیا تو کسی کم بخت جیب کترے نے چاچے کی خفیہ جیب کاٹ لی اور مبلغ دو ہزار روپے نصف جن کے مبلغ ایک ہزار روپے ہوتے ہیں' سکہ رائج الوقت اڑا کر رفو چکر ہو گیا- چاچے کو جب علم ہوا تو بہت پریشان ہوا- پردیس کا معاملہ تھا- سرائے کے مالک سے ادھار کر کے واپس گوجرانوالہ چلا آیا' اور گھر پہنچ کر بذریعہ وی پی رقم ارسال کی-

جوانی میں چاچا گام کبڈی کا ماہر کھلاڑی تسلیم کیا جاتا تھا' اور اس نے کئی شاندار معرکے اپنی بلند ہمتی اور مشاقی کے طفیل سر کئے۔ وہ اپنے ایک انوکھے کبڈی میچ کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:

"یہ 1946ء کا واقعہ ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ہمراہ میلہ چراغاں دیکھنے گیا۔ ہم گیارہ دوست تھے۔ شالیمار باغ میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ ہم نے ہجوم سے دور اپنے بیٹھنے کا انتظام کیا اور خوش فعلیوں میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد چودہ پندرہ کالج کی نوجوان لڑکیاں بھی ادھر آ نکلیں' اور ہم سے کچھ فاصلے پر دری بچھا کر بیٹھ گئیں اور تاش کھیلنے لگیں۔ میرے دوستوں نے مجھے کہا کہ میں جا کر لڑکیوں سے تاش مانگ لاؤں۔ میں جرات کر کے ان کے پاس گیا اور مدعا بیان کیا تو وہ مجھے غور سے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگیں اور پھر ایک شوخ لڑکی نے اپنے تھیلے سے ایک تاش نکال کر مجھے دے دی۔ میں اپنے آپ کو فاتح محسوس کرتے ہوئے تاش لے کر ساتھیوں میں آ گیا اور ہم بھی تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد تین لڑکیاں ہمارے پاس آئیں۔ وہ شوخ و چنچل لڑکی جس نے مجھے تاش دی تھی بھی ساتھ تھی اور آ کر انہوں نے ہمیں کبڈی کھیلنے کی دعوت دی۔ ہم بے حد حیران ہوئے مگر ان کی دعوت کو مذاق سمجھتے ہوئے قبول کر لی۔ لڑکیاں چلی گئیں اور اپنی نشست گاہ پر جا کر لباس اتارنے لگیں۔ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ان سب نے کپڑوں کے نیچے نکریں پہن رکھی تھیں۔ ہم بھی لنگوٹ کس کے تیار ہو گئے اور یہ نرالا کبڈی میچ شروع ہو گیا۔ نازک اندام حسیناؤں میں خلاف توقع بلا کی پھرتی تھی اور وہ ہمیں مسلسل نیچا دکھا رہی تھیں۔ ہم بڑی ندامت محسوس کر رہے تھے۔ اگرچہ میں نے خوب جوہر دکھائے اور ان کی ٹیم کو خاصا نقصان پہنچایا لیکن ان کا پلہ بھاری رہا۔ اور ہمیں بے حد خفت اٹھانا پڑی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت لڑکیاں انسان نہ تھیں' بلکہ پریاں (جن عورتیں) تھیں۔ وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے اٹھیں۔ اور ہجوم میں غائب ہو گئیں اور پھر دوبارہ ہم میں سے کسی نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہاں سے ہم تانگوں پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن چلے آئے۔ اس یادگار اور دلفریب کبڈی میچ کے متعلق بڑی دیر تک تبادلہ خیال کرتے رہے۔"

1947ء کے فسادات کا واقعہ ہے کہ ایک سکھ جو تانگے میں بیٹھ کر مختلف اعلانات نشر کیا

کرتا تھا قتل ہو گیا' اور قاتلوں کی نشاندہی چاچے کی گلی میں کی گئی۔ ایس۔ ایچ۔ او (تھانیدار) ہندو تھا۔ وہ اس گلی کے تقریباً ستائیس مسلمانوں کو پکڑ کر تھانے لے گیا' اور وہاں جا کر انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ چاچا بھی ان میں شامل تھا۔ اگلے دو روز کچہری چھٹیوں کی وجہ سے بند تھی۔ لہٰذا ضمانت نہ ہو سکی۔ کرفیو کی وجہ سے کوئی ملاقات بھی نہ آ سکا۔ چاچے گام کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے جیل کے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اسے گھر والوں سے زیادہ اپنے مرغوں کی فکر تھی۔ اس کے غم میں رو رو کر اس کی آنکھیں سوجھ گئیں۔ چوتھے روز اس کے بھائی اور دیگر اہل محلّہ ملاقات کے لئے آئے' تو چاچا پھر بین کرنے لگا۔ ملاقاتیوں اور ساتھی قیدیوں نے بڑی تسلی دی اور اسے گھر سے آیا ہوا کھانا پیش کیا۔ چاچے نے اپنی پلیٹ میں ایک توانا مرغ کی ٹانگ دیکھی تو فوراً" پہچان گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ چاچا کی جیل یاترا اس کے لئے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس کے باپ نے مرغوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نادر موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا اور انہیں گام کی عدم موجودگی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ذبح کر کے تمام قیدیوں کے کھانے کا اہتمام کر دیا۔

کافی عرصہ ہوا۔ گوجرانوالہ میں ایک بہت بڑا سرکس آیا۔ سرکس کا مالک چاچے کا پرانا دوست تھا۔ چاچا ہر شام وہاں چلا جاتا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چاچا ململ کا باریک کرتا اور سرخ لاچا پہنے ہوئے تھا اور اپنے دوستوں کے ساتھ ہاتھی کے پاس کھڑا اسے بسکٹ کھلا رہا تھا۔ ہاتھی اپنی سونڈ میں بسکٹ پکڑتا اور منہ میں ڈال لیتا۔ سینکڑوں تماشائی چاچے کے پاس کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بسکٹ ختم ہو گئے۔ ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر چاچے کے لاچے کو پکڑ لیا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔ لاچا کھل گیا۔ اب ایک طرف سے ہاتھی کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف چاچا اور اس کے دوست لاچا چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ گیسوں کی تیز روشنی میں منظر قابل دید تھا۔ چاچے کے ساتھی اور حاضرین یہ نظارہ دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد لاچا پھٹ گیا۔ آدھا ہاتھی کے پاس رہ گیا اور بقایا لاچا گام باندھ کر واپس لوٹا۔ اس سبکی کے بعد چاچے گام نے کبھی سرکس کی طرف رخ نہیں کیا۔

1958ء میں سارے ملک میں مارشل لاء لگا۔ ضروریات زندگی خاصی مہنگی ہو گئی تھیں۔

چاچا ایک روز فوج کے کیمپ میں گیا اور شکایت کی کہ اشیاء خورد و نوش ناپید ہیں- فوج والے ہر شہری کی شکایت کا ازالہ کرتے تھے- انہوں نے ایک جیپ جو شہر جا رہی تھی' میں چاچے گام کو بٹھایا اور بازار آ گئے- چاچا فوجیوں کے ہمراہ ایک دوکان پر گیا اور لائف بوائے صابن کی دو ٹکیاں خریدیں اور فوجیوں سے اجازت لے کر گھر چلا آیا-

اگلے روز چاچا پھر بازار گیا- تمام دوکاندار چاچے کو غور سے دیکھتے رہے' اور چاچا بڑے ٹھاٹھ سے چلتا ہوا دوکانداروں کو مرعوب کرتا ہوا گزر گیا- پھر کئی مہینے چاچا اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر بیان کر کے داد تحسین وصول کرتا رہا-

ایک پنساری کی دوکان پر چاچا جغرافیہ پر لیکچر دے رہا تھا اور اپنی لمبی چوڑی سیاحت کا تذکرہ کر رہا تھا- کسی بیوقوف آدمی نے جو چاچا کا بھیدی تھا کہہ دیا کہ گام تو صرف فرضی داستانیں سناتا ہے- جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں- اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ چاچا گام آج تک کہیں نہیں گیا- اس پر چاچا سخت برہم ہو گیا اور طعنہ دیا کہ اسے کیا معلوم دنیا کہاں بستی ہے- چاچے نے اپنی تائید میں بتایا کہ وہ یعنی چاچا وہاں تک گیا ہے جہاں یہ بورڈ لگا ہے- "گورنمنٹ دی بس بس-"

شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ اب چاچے کی داستان بھی بس بس ہو جائے-

شیری جیمز

نائس: Nice

فرانس کی "Cote De Azur" کا یہ تفریحی مقام جو (Alps Maritimes) الپس کے ساحلی علاقوں یعنی مشہور عالم انتہائی پرکشش اور دلفریب فرنچ ریویرا کا غیر سرکاری دارالخلافہ مانا جاتا ہے- بحیرہ روم کی شہرہ آفاق Bay of Angles پر واقع ہونے' شمال اور شمال مشرق سے الپس کی ناقابل تسخیر چوٹیوں کے باعث ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی دستبرد سے محفوظ رہا ہے- یہ شہر تیز بہاؤ والے دریائے پیلان (Pillon) کے دونوں جانب آباد ہے-

نائس کی خوشگوار آب و ہوا' خلیج پر اس کا حسین محل وقوع' صنوبر کے گھنے درختوں کے جنگلات اور رنگا رنگ خوشبو دار جڑی بوٹیوں کے درمیان یہ ہنستا مسکراتا اور خوشیاں بکھیرنے والا ٹاؤن فرنچ ریویرا کا نہایت پرکشش اور پرلطف تفریح گاہ بن چکا ہے-

ملکہ وکٹوریا' دی پرنس آف ویلز' کنگ لیو پولڈ آف بلجیم' روس کے شہنشاہ زار اور آغا خاں نے موسم سرما کے لئے یہاں اپنے پسندیدہ گھر بنا رکھے ہیں- اسی جگہ آرٹسٹس' رائیٹرز' موسیقاروں' اداکاروں اور فنکاروں نے بھی اپنی چھٹیاں رنگین اور دلنشیں گزارنے کے لئے ہالی ڈے ہومز حاصل کر رکھے ہیں- جہاں وہ شاہانہ شان و شوکت اور مکمل طمطراق کے ساتھ دن عید اور راتیں شب برات کی طرح مناتے ہیں-

آپ یہاں خوبصورت عمارات اور آراستہ گلیوں سے ہوتے ہوئے ساحل پر آ جاتے ہیں- یہ قوس کی شکل کا سمندر کا کنارا اور ساحل بڑا ہی دلکش اور دیدہ زیب دکھائی دیتا ہے- وہاں کا ہجوم دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی میلہ لگا ہوا ہے- ہر شخص خوش و خرم اور ہالی ڈے موڈ میں نظر آتا ہے-

ماہ نو یعنی ہلال کی شکل کا سنہری ربن کی طرح گہرے نیلے سمندر کے کنارے پھیلا ہوا یہ ساحل دنیا کا خوبصورت ترین ساحل تسلیم کیا جاتا ہے- یہاں لباس کی قید و بند سے آزاد مرد و زن اور ننگی گوریاں نہاتے ہوئے اور تمازت آفتاب کا لطف اٹھاتے ہوئے تماشائیوں اور

شائقین کی مضطرب اور متجسس نظروں کو نظر انداز کر کے جس آزاد خیالی اور بے حیائی کا مظاہرہ کرتی ہیں- وہ بھی قابل دید نظارہ ہوتا ہے-

ساحل سمندر سے تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر کروڑ پتی امراء' یورپ کے رؤسا نے اپنے اپنے ہالیڈے ولاز' فیشن ایبل کاٹیجز اور ڈیلکس عشرت کدے تعمیر کر رکھے ہیں- جہاں ارب پتی سوداگر' شہرہ آفاق صنعتکار' چوٹی کے جہاز ران' بزنس ٹائقون' ہالی ووڈ کے مشہور فلم اسٹارز اور بین الاقوامی شہرت کے حامل سیاستدان' فنکار آرٹسٹ اور عرب کے شیخ اپنی نوخیز اور جواں سال حسین و جمیل سیکٹریوں' دلنواز داشتاؤں اور فتنہ خیز محبوباؤں کی پربہار رفاقت میں زندگی کے خوشگوار لمحات گزارنے کے لئے اس سحر انگیز سر زمین پر حاضری دیتے ہیں-

اس جادو نگری کے ایک نہایت پرکشش اور دلکش ولا میں زہد شکن حسینہ شیری جیمز قیام پذیر ہے- وہ اس پراسرار اور مسحور کن محل نما عمارت میں اکیلی رہتی ہے- اس ولا سے ساحل سمندر کا رنگین اور دلنشین نظارہ' سرسبز اور شاداب پہاڑی چوٹی کے اطراف کی شادابی اور رعنائی اور دور سے ساحل پر چلتے پھرتے' تیرتے اور نہاتے ہوئے لوگوں کا ہجوم اس ولا کی اہمیت اور شاندار لوکیشن یعنی محل وقوع اس کی شان میں اضافے کا موجب بنتی ہے- اس ولا میں داخل ہونے کی غرض سے ساحل سمندر کی طرف سے پچیس سیڑھیاں اوپر کو جاتی ہیں- جو ایک نہایت کشادہ اور سبزہ زار سے ڈھکے ہوئے وسیع و عریض برآمدے میں پہنچا دیتی ہیں- یہ جدید فرانسیسی طرز تعمیر کا شاہکار ولا ہے- جس میں رہائش پذیر لوگوں کی امارت' حسن ذوق اور سوشل اسٹیٹس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے-

ایک دن قبل دوپہر جب شیری جیمز ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہی تھی کہ ایک نوجوان جوڑا جو رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ' بہترین لباس اور مختصر دستی سامان لئے اس عالیشان ولا میں وارد ہوا- لڑکا بہت ہینڈسم' خوش لباس اور سرو قد تھا- جبکہ اس کی ساتھی لڑکی نہایت دلربا' پرکشش' سنہری زلفوں' نیلی آنکھوں اور ساحرانہ حسن و جمال والی نوخیز دوشیزہ تھی- ان دونوں کی چال ڈھال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس ولا کی مقیم شیریں جیمز کے کوئی قریبی عزیز یا دوست ہیں- انہوں نے سیڑھیاں عبور کر کے ولا کے صدر دروازے پر نصب شدہ گھنٹی بجائی- تو اندر سے کسی نے بٹن دبا کر الیکٹرانک دروازہ کھول دیا- اور وہ دونوں عمارت کے اندر داخل ہو گئے- ابھی وہ ایک الٹرا ماڈرن اور شاہانہ اسٹینڈرڈ کے مرصع اور آراستہ

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اس گھر کی مالکن مس شیری جیمز انہیں دیکھ کر ایک دم چونک اٹھی- کیونکہ وہ دونوں مہمان اس کے لئے انجانے اور اجنبی تھے- مس شیری جیمز کی گھبراہٹ واضح تھی- کیونکہ ان لوگوں کا اس کی نجی رہائش گاہ پر اچانک بلا اطلاع اور بلا اجازت آنا اسے بے حد ناگوار گزرا- چنانچہ اس نے سخت حیرت میں ان سے استفسار کیا کہ کون ہو تم لوگ؟ اور ادھر کیوں آئے ہو؟ جس کے جواب میں نوجوان نے نہایت شفقت اور پیار بھرے لہجہ میں کہا-

نووارد: شیری میری بہن- کیا ہو گیا ہے تمہیں- اپنے بھائی فرینک جیمز کو نہیں پہچانتی-

شیری جیمز: میرا کوئی بھائی نہیں- تم جو کوئی بھی ہو- فوراً" یہاں سے چلے جاؤ-

فرینک: تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے شیری- یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو- میں پورے پانچ برسوں بعد تمہیں ملنے آیا ہوں- اور تم اپنے اکلوتے حقیقی بھائی کو پہچاننے سے انکاری ہو- اور یہ تمہاری بھابھی گلوریا ہے- پچھلے سال ہی ہماری شادی ہوئی ہے-

شیری جیمز: دیکھو مسٹر- شرافت سے جاتے ہو یا پھر پولیس کو بلا کر تمہیں یہاں سے بے عزت کر کے نکلوا دوں-

فرینک: ہوش کے ناخن لو شیری- اپنے بھائی سے ایسا توہین آمیز اور ناروا سلوک کرنا کہاں کی شرافت اور انسانیت ہے- تم میرے ماں باپ کی واحد نشانی ہو- میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا- تو کس کے پاس جاؤں گا-

شیری جیمز سخت طیش میں آ کر کہنے لگی- تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم میرے بھائی نہیں ہو- تم کون ہو؟ اور یہاں کس غرض سے آئے ہو- مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں- بہتری اسی میں ہے کہ تم فوراً" یہاں سے دفع ہو جاؤ- ورنہ میں پولیس کو بلا کر تمہیں جیل بھجوا دوں گی-

فرینک: ٹھیک ہے- اگر تم اس قدر بدتمیزی پر اتر آئی ہو- تو بیشک تم پولیس کو بلا لو- میں تمہیں روکوں گا نہیں- مگر اتنا ضرور یاد رہے کہ میں اور تمہاری بھابھی صرف تمہیں ملنے آئے ہیں- اس لئے تمہارے پاس ہی ٹھہریں گے-

شیری جیمز: آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟

فرینک: صرف اپنی بہن کا پیار- یہ مت بھولو کہ یہ گھر میرے ماں باپ کا بھی ہے- اور اس پر میرا حق بھی اتنا ہے جتنا تمہارا-

اتنے میں شیری اپنے ایک دوست پولیس افسر سارجنٹ فرانسس نکولس کو ٹیلیفون کرتی ہے- اور کہتی ہے کہ :

"ہیلو سارجنٹ میرے گھر میں ایک جعلساز اور دھوکے باز بلا اجازت ایک اجنبی عورت کے گھس آیا ہے- اور وہ مجھے پریشان کر رہا ہے- براہ کرم آپ فوراً آ کر اسے میری خلوت میں دخل اندازی کرنے سے روکیں- اور مجھے ان کی ناگوار خاطر موجودگی سے نجات دلائیں-" اس کے جواب میں سارجنٹ فرانسس نکولس جلد آنے کی حامی بھرتا ہے- اور شیری جیمز ریسیور کریڈل پر رکھ دیتی ہے- اس دوران فرینک اور گلوریا ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر پولیس آفیسر کا انتظار کرنے لگتے ہیں- اتنے میں سارجنٹ پہنچ جاتا ہے- اور اندر آ کر فرینک اور اس کی بیوی سے اپنا تعارف کرواتا ہے- پھر شیری جیمز کی طرف دیکھ کر پوچھتا ہے-

سارجنٹ : کیا پرابلم ہے شیری؟

شیری جیمز: یہ "دونوں مان نہ مان میں تیرا مہمان" کے مصداق ایک گھنٹہ قبل میرے ہاں بلا اجازت گھس آئے ہیں- میں انہیں نہیں جانتی- کہ یہ کون ہیں- اور مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں-

سارجنٹ : (فرینک سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے-) ہاں جناب کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کون لوگ ہیں- اور یہاں آنے کا مقصد؟

فرینک : مسٹر سارجنٹ- میں شیری جیمز کا سگا بھائی ہوں- میرا نام فرینک جیمز ہے- اور یہ میری بیوی گلوریا ہے-

شیری جیمز: یہ سراسر جھوٹ ہے- یہ میرا کوئی بھائی نہیں- میرا ایک بھائی فرینک تھا- جو اس وقت اس دنیا میں نہیں رہا-

فرینک : یہ غلط ہے- میں ہی اس کا حقیقی بھائی فرینک جیمز ہوں- اور اس کے سامنے کھڑا ہوں- میں پانچ برسوں کے بعد اسے ملنے آیا ہوں-

سارجنٹ : مسٹر فرینک آپ کہاں رہتے ہیں؟

فرینک : میں پچھلے پانچ برس سے نیروبی کینیا میں گورنمنٹ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ میں انجینئر ہوں- اور اپنی بہن شیری جیمز سے چند روز کے لئے ملنے آیا ہوں- حیرت ہے کہ مجھ سے بچپن سے والہانہ محبت کرنے والی آج مجھے پہچاننے سے بھی انکاری ہیں-

سارجنٹ : اگر آپ آج صبح ہی نیروبی سے آئے ہیں- تو آپ کے پاس سفری دستاویزات تو ہوں گی؟ کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟

فرینک : یقیناً- پھر دونوں میاں بیوی اپنے پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کی ٹکٹیں سارجنٹ فرانسس نکولس کو پکڑا دیتے ہیں-

سارجنٹ دونوں پاسپورٹ اور ٹکٹیں بڑے غور سے دیکھتا ہے- اور ان پر امیگریشن کی مہریں دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا ہے کہ فرینک صحیح آدمی ہے- اور شیری جیمز انہیں پہچاننے میں غلطی کر رہی ہے-

سارجنٹ : مسٹر جیمز کیا آپ کے پاس آپ کا ڈرائیونگ لائسنس، کریڈٹ کارڈ، شناختی کارڈ وغیرہ ہیں-

فرینک : ہاں-

سارجنٹ : کیا میں انہیں بھی دیکھ سکتا ہوں؟

پھر فرینک اور گلوریا یہ ثبوت بھی سارجنٹ کے حوالے کر دیتے ہیں-

سارجنٹ فرانسس نکولس بڑے غور اور تسلی سے ان ڈاکومینٹس اور کاغذات کا معائنہ کرتا ہے- پھر شیری جیمز سے مخاطب ہو کر کہنے لگا- "شیری اچھی طرح سے چھان بین کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسٹر فرینک جیمز تمہارا حقیقی بھائی ہے- اور گلوریا فرینک تمہاری بھابھی- میرا خیال ہے کہ اب اس بارے میں تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے-"

شیری جیمز: نہیں سارجنٹ- ان کے پیش کردہ ڈاکومینٹس اور دستاویز بالکل جھوٹی اور جعلی ہیں- اور یہ شخص اتفاق سے میرے بھائی کا ہم شکل ہے جس کی وجہ سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے-

سارجنٹ فرانسس نکولس : دیکھو شیری ان کے کاغذات ہرگز جعلی نہیں ہو سکتے- میں نے اچھی طرح سے تصدیق کر لی ہے- اب تمہارا اپنی ضد پر ڈٹے رہنا کسی صورت مناسب نہیں-

شیری جیمز: (کچھ یاد کر کے) میرے پاس اپنے مرحوم بھائی کی کچھ تصاویر ہیں- میں انہیں ابھی آپ کو لا کر دکھاتی ہوں-

پھر دوسرے کمرے میں جا کر چند تصاویر لے آتی ہے- اور سارجنٹ سے کہتی ہے-

شیری جیمز: یہ ہیں میرے بھائی کی اصل تصاویر- دیکھیں یہ اس نووارد سے کتنی مختلف ہیں-

سارجنٹ نکولس : (غور سے دیکھ کر) یہ تو ایک ہی آدمی کی تصویروں کے مختلف پوز ہیں- اور وہ شخص اس وقت میرے سامنے موجود ہے-

شیری جیمز: میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا سارجنٹ کہ میرا بھائی مرچکا ہے- وہ ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا- اور میں نے اسے خود اپنی موجودگی میں قبر میں اتارتے ہوئے دیکھا تھا- اور اس کے جسم اور کپڑوں سے برآمد ہونے والی اشیاء میں نے وصول کی تھیں- اس لئے میں کیسے مان لوں کہ یہ میرا بھائی ہے-

فرینک : ہو سکتا ہے شیری تمہیں وہ لاش پہچاننے میں کوئی مغالطہ یا بھول چوک ہو گئی ہو- لیکن میں تو تمہارے سامنے اس وقت زندہ موجود ہوں- اب تمہیں یہ حقیقت ماننے میں کیا عذر مانع ہے؟

سارجنٹ : سوری مائی فرینڈ شیری جیمز- بہتر یہی ہے کہ تم اپنے بھائی سے مفاہمت کر لو- اور اب اس سلسلے میں دوبارہ مجھے پریشان نہ کرنا-

یہ الفاظ کہہ کر سارجنٹ فرانسس نکولس وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے- اور شیری بے حد پریشانی کی حالت میں فرینک سے کہتی ہے-

شیری جیمز: یہ تو تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ تم میرے بھائی نہیں ہو- بلکہ اس کے بمشکل ہونے کے باعث کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو- جس کے لئے تم یہ ڈرامہ رچا رہے ہو- مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو-

فرینک : (مسکراتے ہوئے) میری بہن مجھے سوائے تمہاری محبت کے اور کچھ نہیں چاہئے- تمہاری جائیداد اور دولت تمہیں مبارک- اگر تم چاہو تو اس کے بدلے میں میں تحریری طور پر ماں باپ کی چھوڑی ہوئی وراثت سے بھی دستبردار ہونے کو تیار ہوں- مگر خدا کے واسطے مجھے بہن کے پیار سے محروم نہ رکھو-

اتنے میں مین دروازے کی بیل کی آواز سنائی دی- اور ساتھ ہی ایک بزرگ جوڑا اندر داخل ہوتا ہے- انہیں دیکھ کر شیری جیمز کا پژمردہ چہرہ یکدم کھل اٹھتا ہے- اور وہ دوڑ کر ہیلو انکل کہتے ہوئے اس سے لپٹ جاتی ہے- پھر آنٹی کو اسی گرمجوشی سے گلے مل کر خوش آمدید کہتی ہے- اسی دوران ان کی نظر فرینک پر پڑتی ہے- تو انکل مائیکل فراسٹ سخت

حیرت زدہ اور ہکا بکا ہو کر پکار اٹھتے ہیں-

مائیکل فراسٹ : تم زندہ ہو فرینک میرے بیٹے؟ تو وہ کون تھا- جس کو قبر میں لٹا دیا گیا تھا-

فرینک : (مسرت اور خوشی سے لبریز جذبات کے ساتھ آگے بڑھ کر) ہیلو انکل مائیکل کہہ کر ان سے بغلگیر ہو جاتا ہے- پھر آنٹی گریس فراسٹ سے گلے ملتا ہے- ازاں بعد وہ ان کے ساتھ اپنی بیوی گلوریا کا تعارف کراتا ہے- جس کے بعد وہ دونوں سے ان کے بیٹے رچرڈ فراسٹ اور اس کی بیوی مارتھا اور بیٹی کرسٹینا لیمب کی خیر خیریت دریافت کرتا ہے-

مائیکل فراسٹ : اتنا عرصہ تم کہاں رہے- تم نے تو ہمیں بھلا ہی دیا تھا-

فرینک : نہیں انکل میں آپ لوگوں کو کیسے بھلا سکتا ہوں- ماں باپ کی فوتیدگی کے بعد آپ ہی ہمارے والدین اور سہارا ہیں- میں دراصل پچھلے پانچ سال سے ملازمت کے سلسلہ میں نیروبی میں رہائش پذیر ہوں- آج صبح ہی آیا ہوں- لیکن حیرانگی اور اچنبھے کی بات یہ ہے کہ میری بہن شیری جیمز مجھے خوش آمدید کہنا تو کجا- مجھے پہچاننے سے بھی انکاری ہے-

مائیکل فراسٹ : کیوں شیری- تمہارا بھائی کیا کہہ رہا ہے؟ کیا تم اس سے ناراض ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا اکلوتا بھائی عرصہ دراز کے بعد صحیح سلامت گھر پہنچ گیا ہے-

شیری جیمز: انکل- یہ ہمارا فرینک نہیں ہے- یہ تو اس کا کوئی ہم شکل ہے- جو کسی چکر میں پھنسا کر ہمیں لوٹنا یا برباد کرنا چاہتا ہے-

فرینک : سن لیا انکل- آپ کے آنے سے پہلے شیری نے پولیس سارجنٹ فرانسس نکولس کو بلا لیا تھا- وہ ایک گھنٹہ ادھر رہا- اس نے ہمارے تمام کاغذات اور دستاویزات دیکھ کر ان کی تصدیق کی- اور شیری کو سمجھا بجھا کر گیا تھا کہ یہ تمہارا حقیقی بھائی ہے- اس لئے اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہرگز نہ کرنا- مگر حیرت ہے کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد سے باز نہیں آئی-

شیری : انکل تمہیں تو علم ہے کہ میرا بھائی فرینک ایک حادثہ میں فوت ہو گیا تھا- اور میری آنکھوں کے سامنے اسے سپرد خاک کیا گیا تھا- اور میں نے تو اس کی لاش کو نہ صرف شناخت کیا تھا- بلکہ اس کے جسم پر موجود اشیاء بھی وصول کر لیں تھیں- اب میں کس طرح تسلیم کر لوں کہ وہ معاملہ ایک خواب یا فریب تھا-

مائیکل فراسٹ : لیکن شیری ہو سکتا ہے کہ اس مہلک حادثہ میں مارے جانے والا کوئی اور ہو۔ اور اس کی شناخت صحیح طور پر نہ ہو سکی ہو۔ اور مرنے والا لاوارث ہو۔ اور کسی نے اس کے جسم پر موجود اشیاء کو کلیم ہی نہ کیا ہو۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ فرینک کی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں چند سوالات کر لیتے ہیں۔ جن کے جوابات سے پتہ چل جائے گا کہ فرینک اصلی ہے یا نقلی۔

شیری جیمز: یہ درست فیصلہ ہو گا۔

مائیکل : کیا تمہاری کوئی پھوپھی بھی ہے۔

فرینک : جی ہاں۔ میری ایک پھوپھی باربرا تھی۔ جو برائن ولیمز آف برسلز کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ برائن ولیمز ٹرین کے حادثہ میں مارا گیا تھا۔ جس کے بعد باربرا نے ایک ڈچ لڑکے ڈیوڈ راس کے ساتھ شادی کر کے راٹر ڈیم (Rottar Dam) میں سکونت اختیار کر لی۔ دو سال ہوئے مجھے ایک دوست نے اطلاع دی تھی کہ باربرا کا انتقال ہو گیا ہے۔

گریس فراسٹ : کیا تم نے میرے بیٹے رچرڈ فراسٹ اور مارتھا کی شادی میں شرکت کی تھی؟ اگر کی تھی۔ تو کیا کوئی خاص واقعہ پیش آیا تھا؟

فرینک ہاں میں ان دنوں (او) O لیول میں زیر تعلیم تھا۔ کہ شادی والے دن مارتھا کے باپ کو شدید دل کا دورہ پڑا تھا۔ جس سے اسی رات وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور مارتھا کی ماں مارگریٹ بے ہوش ہو گئی تھی۔

شیری جیمز: میں نے بچپن میں بھائی کے بازو پر دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟

فرینک : ہاں مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میں نے تمہارے ہاتھ سے چاکلیٹ چھین لی تھی۔ پھر قمیض کا بازو اٹھا کر وہ بازو پر زخم کا نشان دکھا دیتا ہے۔

شیری جیمز: میرے بھائی فرینک کے داہنے کندھے پر ڈیڑھ انچ کٹ کا نشان تھا۔

فرینک : ہاں میں ہی تمہارا بھائی ہوں۔ پھر قمیض اتار کر کندھے کا زخم کا نشان دکھاتا ہے۔

فرینک : اگر تمہیں یاد ہو شیری تو ایک دفعہ جب تم آٹھ برس کی تھی۔ تو نائس (Nice) کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی پر سوار ہوتے وقت تمہارا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اور تمہاری پنڈلی پر گہرا زخم آیا تھا۔ جس پر پانچ ٹانکے لگے تھے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ زخم کا نشان

تمہاری داہنی پنڈلی پر اب بھی ہو گا۔

شیری جیمز: ہاں ہے۔

فرینک : کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔

شیری جیمز: اپنی داہنی پنڈلی پر اس زخم کا نشان دکھا دیتی ہے۔

مائیکل فراسٹ : شیری' یہی ہمارا فرینک ہے۔ اور یہ ہر امتحان میں پورا اترا ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے بھائی کو مزید پریشان نہ کرنا۔ اور یاد رکھو۔ دنیا میں بھائی کا رشتہ بڑا اہم اور عظیم ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں میاں بیوی تو گڈ بائی کہہ کر چلے گئے۔ مگر شیری بڑی اداس اور رنجیدہ حالت میں اپنے پلنگ پر دراز ہو کر سوچنے لگی کہ اب فرینک اور گلوریا سے چھٹکارا کس طرح سے حاصل کیا جائے۔ اس دوران گلوریا ولا کے کچن میں جا کر فریج سے کھانے پینے کا سامان ڈھونڈنے لگی۔ جہاں سے اسے مچھلی اور گوشت کے قتلوں کے علاوہ فرنچ فرائیز' بینز (Beans)' بریڈ' مکھن اور پنیر مل گئے۔ چنانچہ گلوریا نے فرائی پین میں تیل ڈال کر آٹو میٹک ککر میں فرائی کر لئے۔ اور ڈائننگ ٹیبل پر بریڈ کے ساتھ چن دیئے۔ اور فرینک اپنی بہن شیری کو کھانے کے لئے بلانے چلا گیا۔ مگر اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا وہ دونوں میاں بیوی کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد گلوریا نے کافی تیار کی۔ اور وہ دونوں ٹی وی لاونج میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھنے لگے۔ اور ساتھ ساتھ کافی سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے۔ شیری اس دوران اپنے بیڈ روم میں ہی مقید رہی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں شیری کے بیڈ روم میں چلے گئے۔ پھر فرینک نے اسے سمجھایا کہ دیکھو نادانی کی باتیں چھوڑو۔ ہم چند روز کے لئے تمہارے پاس آئے ہیں۔ اب غصہ تھوک دو۔ اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر کافی سے دل بہلاؤ۔ اور یقین کرو کہ ہم تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے یا پھر تمہاری دل ازاری کرنے نہیں آئے۔

شیری جیمز نے سوچا کہ اب مصلحت سے کام لینا ہو گا۔ کیونکہ وہ دونوں "مان نہ مان میں تیرا مہمان" کے مصداق وہاں سے جانے والے نہیں ہیں۔ بہتر ہو گا کہ انہیں کسی طرح اپنے دام فریب میں الجھا کر عارضی طور پر سمجھوتہ کر لیا جائے۔ اور پھر کسی مناسب اور موزوں موقعہ کو تلاش کر کے کوئی معقول بہانہ بنا کر ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ کیونکہ شیری جیمز نے مکر و فریب کے جواب میں "جیسے کو تیسا" کے مطابق رویہ اختیار کرنا ہو گا۔ بہرحال یہی پروگرام بنا کر وہ فرینک کے ساتھ ٹی وی لاونج میں چلی آئی۔ جہاں وہ تینوں

کافی دیر تک گپ شپ لگاتے رہے۔ پھر جا کر اپنے اپنے کمروں میں سو گئے۔

شیری جیمز ساری رات سو نہ سکی۔ وہ فرینک اور گلوریا کی اس طرح اچانک آمد اور حیرت انگیز مداخلت کی وجہ سے بے حد پریشان تھی۔ وہ یہ معمہ حل نہ کر سکی کہ فرینک اس کا حقیقی بھائی ہے یا نہیں۔ وہ تو فرینک کی حسرت ناک موت' اس کی تجہیز و تکفین اور اس کی ملکیتی اشیاء کی وصولی نہ بھلا سکتی تھی۔ خاص طور پر جب اس نے خود اپنے بھائی کی میت کی شناخت کی تھی اگر وہ حقیقت تھی؟ تو پھر فرینک کون ہے؟ اور اسے یہ سوانگ رچانے کی ضرورت کیا تھی؟ سارجنٹ فرانسس نکولس تو اس کا دوست تھا۔ اسے تو شیری جیمز نے اپنی مدد کے لئے بلایا تھا' وہ بھی فرینک کے پیش کردہ ڈاکومینٹس سے مطمئن ہو گیا تھا۔ انکل مائیکل فراسٹ اور آنٹی گرکیس کو بھی فرینک نے اپنے برجستہ اور معقول جوابات دے کر انہیں لاجواب کر دیا تھا۔ پھر شیری جیمز نے اپنے ماضی کی یادداشتوں پر مبنی سوالات اور ان کی توجیہہ کے سلسلے میں فرینک کا اپنے جسم پر نشانات دکھا دینا کس قدر حیران کن تھا۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ فرینک بڑے اعتماد اور طمانیت سے ان سب لوگوں کے امتحان میں پورا اترا تھا۔ لیکن ایک خلش اور الجھن شیری کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ اور وہ تھی اس کی چھٹی حس۔ اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں کسی چکر میں پھنس نہ جائے۔ یہ بات اس کے اضطراب اور بے چینی کا باعث بن رہی تھی اور وہ اضمحلال اور افسردگی کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ شیری جیمز کا کوئی مخلص دوست' زیرک اور ہمدرد ساتھی ایسا نہ تھا۔ جو اسے اس بحران اور اڑچن سے گلو خلاصی کرا سکے۔ اسی ادھیڑ بن میں اس نے ساری رات بیقراری میں گزار دی۔ پھر نہ جانے کب اور کس وقت وہ خواب غفلت کی آغوش میں کھو گئی۔

صبح جب بیدار ہوئی تو اسے خیال آیا کہ اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مقامی گرجا گھر کے پادری فادر جوزف روفن کی مدد حاصل کی جائے۔ فادر جوزف روفن بڑا شفیق' ہمدرد اور محسن انسان تھے۔ دوسرے وہ فرینک جیمز کو بڑی اچھی طرح نہ صرف جانتے تھے۔ بلکہ انہوں نے ہی فرینک کے جنازہ اور تدفین کی آخری رسومات ادا کی تھیں۔ شیری جیمز کے ولا سے گرجا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ لہٰذا اس نے مختصراً ناشتہ کرنے کے بعد فادر جوزف روفن سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس وقت فرینک اور اس کی بیوی اسے کہیں نظر نہ آئے۔ اور وہ حیران ہوئی کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ لیکن ان کا تھوڑا سا سامان وہاں موجود

تھا۔ پھر وہ اپنی گاڑی اور مکان کی چابیاں لے کر باہر جانے لگی۔ تو چابیاں غائب تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک ان کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے فرینک وہ چابیاں حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ لے گیا ہو گا۔ جب وہ ایک گھنٹہ تک نہ آئے۔ تو شیری جیمز نے ولا اور کار کی ڈپلوکیٹ چابیاں اپنی سیف سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیں۔ اور باہر چلی گئی۔ اس دوران اس نے حیرت سے دیکھا کہ اس کی سرخ کیڈیلک کار فرینک چلا کر کہیں سے واپس آ رہا تھا۔ فرینک نے ولا کے گیراج کے باہر کار روک لی۔ اور گلوریا فرنٹ سیٹ سے اتر کر پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور فرینک نے شیری کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ تو اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس کے مسلسل اصرار پر بیٹھ گئی۔ شیری جیمز نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ تو گئی۔ مگر چونکہ وہ فادر جوزف روفن کے پاس فرینک کو لیجا کر اس کی اصلیت کا پول کھولنا چاہتی تھی۔ اور یہ ہی وہ موقعہ تھا۔ جسے وہ کسی صورت ہاتھ سے گنوانا نہ چاہتی تھی۔ اس لئے بغیر کسی تمہید کے اس نے فرینک کو مقامی گرجا گھر چلنے کی تلقین کر دی۔ اسٹیرنگ پر اس وقت فرینک بیٹھا تھا۔ بہرحال فرینک سمجھ گیا کہ شیری جیمز گرجا گھر اسے کیوں لیجانا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے بڑی سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے مقامی چرچ کے مین دروازے پر پہنچا دیا۔

شیری جیمز: کیا تم چرچ کے اندر نہیں چلو گے۔

فرینک: ضرور چلیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ فادر جوزف روفن سے بھی ملاقات ہو جائے۔ ان سے ملے بھی خاصا عرصہ گزر چکا ہے۔

پھر وہ تینوں گرجا گھر کے مین ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی نظر پادری جوزف روفن پر پڑتی ہے۔ جو بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بہت بڑی تصویر اور مقدس صلیب کے نیچے عبادت میں محو تھے۔ اس وقت سرمن ہال میں پڑی ہوئی کرسیوں پر وہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور فادر جوزف روفن کے فارغ ہونے تک خود بھی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ کوئی بیس منٹ میں فارغ ہو کر فادر جوزف روفن مڑ کر ڈائس سے اتر کر ہال میں آتے ہیں۔ تو ان کی نظر ان تینوں پر پڑتی ہے۔ وہ فرینک کو خاص طور پر دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ اور بڑی حیرت سے فرینک سے کہتے ہیں۔

فادر جوزف روفن: یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے یا فریب۔

فرینک: مجھے دیکھ کر آپ کی حیرانگی درست ہے۔ میری یہاں موجودگی نہ تو جادو کوئی

کرشمہ ہے اور نہ ہی کوئی فریب نظر- میں فرینک جیمز زندہ و سلامت آپ کے سامنے موجود ہیں-

پادری جوزف روفن : تو پھر میں نے جنازہ کس کا پڑھایا تھا اور آخری رسوم کس کی ادا کی تھیں- کیوں شیری یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ہے-

شیری جیمز: فادر جوزف- یہ شخص میرے مرحوم بھائی کا بمشکل ہے- یہ کل خدا جانے میرے گھر پر کس نیت سے آیا تھا- اور اپنے آپ کو اصل فرینک جیمز ثابت کرنا چاہتا ہے-

فرینک : معزز فادر- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کل سے اپنے بارے میں بارہا یقین دہانی کروا چکا ہوں- پولیس سارجنٹ' انکل مائیکل فراسٹ' آنٹی گریس فراسٹ اور شیری کے لاتعداد سوالات کے نہ صرف تسلی بخش جواب دے چکا ہوں- بلکہ ان نشانیوں اور زخموں کو دکھا کر انہیں پوری طرح قائل بھی کر چکا ہوں- حیرت اس بات پر ہے کہ سارجنٹ فرانسس نکولس اور انکل مائیکل فراسٹ اور ان کی بیوی بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ میں ہی اصل فرینک جیمز ہوں- مگر شیری جیمز "مرغے کی ایک ٹانگ" کے مصداق مجھے اپنا بھائی سمجھنے کی بجائے کوئی فریبی یا جعلساز خیال کرتی ہے- بتائیں اب میں کیا کر سکتا ہوں-

فادر جوزف روفن : کیوں شیری جیمز- کیا یہ درست ہے کہ سارجنٹ اور انکل مائیکل اسے اصل فرینک تسلیم کر چکے ہیں- اور اس نے وہ تمام نشانیاں دکھا دیں تھیں- جس کا تم لوگوں نے دیکھنے کا تقاضا کیا تھا-

شیری جیمز: یہ درست ہے فادر- لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے اپنے مرحوم بھائی فرینک کی لاش کو انہی آنکھوں سے شناخت کیا تھا- اور اس کے جسم پر موجود وہ تمام اشیاء بھی پولیس سے وصول کیں تھیں- اور پھر اپنے سامنے اسے قبر میں اتارا تھا- اس حالات میں کیسے مان لوں کہ مردہ زندہ ہو گیا ہے- اور باقی سارا کچھ جھوٹ تھا-

فادر جوزف : لیکن شیری لاش پہچاننے میں غلطی بھی تو ہو سکتی تھی-

شیری جیمز: وہ تو ٹھیک ہے- لیکن جو چیزیں اس میت کے جسم سے برآمد ہوئی تھیں- مثلاً جیبی گھڑی معہ چین' بٹوہ' رنگ' سوٹ اور ٹائی کو بھی تو میں پہچانتی تھی- وہ یقیناً میرے بھائی کی ہی تھیں- جو اب میرے پاس ہیں- بتائیں فادر- کیا وہ چیزیں حقیقت میں مکمل

ثبوت نہیں تھیں کہ وہ لاش میرے بھائی فرینک کی ہی تھی- اب یہ کہتے ہیں کہ اسے اپنا حقیقی بھائی مان لوں- وہ کیسے؟

فادر جوزف : بعض اوقات آنکھوں دیکھی باتیں بھی غلط ثابت ہو جاتی ہیں- لیکن یہ زیادہ تر حالات اور واقعات پر منحصر ہوتا ہے- ہر چیز کو بار بار پرکھنے اور جانچنے سے بھی اصلیت کا پتہ چل جاتا ہے- آزمائش البتہ ضروری ہے- پھر فرینک کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں-

فادر جوزف : مسٹر فرینک مجھے یاد کر کے بتاؤ- کیا تم ادھر چرچ میں کبھی کبھار آتے رہے ہو؟

فرینک جیمز: جی ہاں فادر میں اپنی والدہ ایلزبتھ جیمز کے ساتھ کئی دفعہ بچپن میں آیا ہوں-

فادر جوزف : کیا تمہیں چرچ کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ یاد ہے؟

فرینک جیمز: یس فادر- ایک دن اتوار کو صبح میں اپنی ماں کے ساتھ آپ کی تقریر (سرمن) بڑے غور سے سن رہا تھا کہ ایک عورت نے اٹھ کر آپ سے کسی معاملہ کی وضاحت چاہی- ابھی وہ اپنی بات کر رہی تھی کہ یکدم گر پڑی اور چند لمحوں بعد وہ عورت اس جہان فانی سے کوچ کر گئی-

فادر جوزف روفن : ہاں فرینک یہ درست ہے- میں وہ واقعہ کبھی بھول نہیں پایا-

فرینک : ایک اور دلچسپ واقعہ بھی مجھے یاد آیا ہے فادر- شاید آپ کو یاد ہو- وہ کچھ ایسا تھا کہ ایک دن ایسٹر کے روز بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ آپ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے تھے- اور سامعین بھی دونوں ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے آپ کے ساتھ رو رو کر آمین کہتے جا رہے تھے- اس روز میں بھی بڑے انہماک اور محویت کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھائے کچھ پڑھ رہا تھا- دعا ختم ہو گئی تو پھر بھی میں مصروف عمل رہا- تو آپ کو میری معصومیت کی دعا بڑی بھلی لگی- تو آپ نے مجھے اپنے پاس بلا کر بڑی شاباش دی- اور مجھ سے پوچھا کہ تم دونوں ہاتھ اٹھائے کیا پڑھ رہے تھے؟ تو میں نے جواب دیا کہ فادر میں کچھ پڑھ نہیں رہا تھا- بلکہ ایک مکھی بار بار میرے ہاتھوں میں داخل ہو کر اڑتی رہی تھی- اور میں یہ گن رہا تھا کہ وہ کتنی مرتبہ میرے ہاتھوں میں آئی اور اڑی تھی- اس پر آپ بے اختیار ہنس دیئے تھے-

فادر جوزف : تمہارا یہ معصومانہ اور دلچسپ واقعہ میں کئی مریدوں اور دوستوں کو سنا چکا

ہوں- پھر شیری کو مخاطب کرتے ہیں-

خداوند یسوع مسیح کی قسم- یہ ہی تمہارا بھائی فرینک ہے- تم نے خدا جانے کس کی میت کو شناخت کر کے دفنا دیا تھا-

شیری جیمز فادر جوزف روفن کے یہ الفاظ سن کر بڑی مایوس ہوئی- وہ گرجا گھر سے باہر آنے لگی- تو فادر جوزف نے شیری کو کہا کہ تم فرینک کی ایک اور آزمائش کر سکتی ہو-

شیری جیمز: وہ کیا؟

فادر جوزف : میں جانتا ہوں کہ فرینک بڑا پھرتیلا اور مشاق ڈرائیور ہے- تم اسے یہاں کے ریس کورس میدان کے راونڈ ٹریک پر لے جاؤ- وہ پانچ میل کا راونڈ ہے- فرینک یہ فاصلہ صرف تین منٹ اور پندرہ سیکنڈ میں طے کرتا ہے- اگر اس نے ایسا کر لیا- تو وہ تمہارا بھائی فرینک ہو گا- ورنہ نہیں-

فرینک : یہ درست ہے فادر کہ میں پانچ میل کا فاصلہ تین منٹ پندرہ سیکنڈ میں طے کیا کرتا تھا- مگر اب میں نے اپنی سپیڈ بڑھا لی ہے- اور اب یہ راونڈ پورے تین منٹوں میں مکمل کر لیتا ہوں-

فادر جوزف : تم شیری- فرینک کے ساتھ جاؤ- اور کار میں بیٹھ کر اس کی تجربہ کار اور مشاق ڈرائیونگ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ پانچ میل کا سفر تین منٹ میں طے کرتے دیکھو- اگر وہ ایسا کر جائے تو پاس ورنہ اس پر اعتبار نہ کرنا- چنانچہ اس طرح وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلنے لگے- تو فرینک نے اپنے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ لیا- تو شیری فوراً" پکار اٹھی کہ یہ تو میرے بھائی کا سگریٹ کیس ہے- میں اسے اچھی طرح سے پہچانتی ہوں-" اتنے میں فرینک نے اپنی اندرونی جیب سے ایک قیمتی سگریٹ لائیٹر لے کر جلایا- تو ہلکی موسیقی کے ساتھ وہ جلنے لگا- اور اس نے سگریٹ سلگا لیا- تو شیری پھر بلند آواز میں کہنے لگی کہ "یہ سگریٹ لائیٹر بھی میرے بھائی فرینک کا ہے- تمہیں کہاں سے ملا؟" جس کا اس نے جواب دیا-

فرینک : یہ سگریٹ کیس اور لائیٹر دونوں میرے اپنے ہیں- اور میں تمہارا بھائی ہوں- عجیب بات ہے کہ تم ان چیزوں کو پہچان لیتی ہو- جو میری ہیں- مگر مجھے پہچاننے سے انکاری ہو-

شیری جیمز اس وقت گہری سوچ میں غرق تھی- فرینک اسے سیٹ بیلٹ باندھنے پر

اصرار کر رہا تھا- اور وہ کار سے اتر جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھ رہی تھی- اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ فرینک کسی بہانے گاڑی فل اسپیڈ میں لا کر اسے دھکا دے کا باہر نہ پھینک دے- سیٹ بیلٹ باندھ لینے سے اگرچہ اسے باہر گرایا نہ جا سکتا تھا- مگر کار ایکسیڈنٹ میں مروایا جانا تو ممکن تھا- لیکن ایسی صورت میں فرینک اور گلوریا کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا- لہٰذا اس کشمکش میں اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی- اور پھر شیری جیمز کی سرخ کیڈلک ریس کورس کے میدان کی چوڑی مگر بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہوا سے باتیں کرنے لگی- شیری جیمز نے خوف سے آنکھیں موند لیں- کار کی رفتار اس قدر تیز' پہیوں کے چیخنے کا بے ہنگم شور اور گھومتی ہوئی سڑک پر چلتی ہوئی کار کا ایک جانب سے اٹھ کر چلنے سے اس کا بیلنس خراب ہو گیا- تو صورت حال خاصی ہولناک دکھائی دینے لگی- شیری جیمز اب بے تحاشا گھبراہٹ میں چیخنے چلانے لگی- اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ اس کا آخری وقت آ چکا ہے- یہ تین منٹ اسے تین گھنٹوں سے بھی کٹھن اور دشوار دکھائی دینے لگے- اب وہ فرینک کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنی سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگنے لگی مگر فرینک کا دھیان تو ڈرائیونگ پر مرکوز تھا- وہ تو اپنے وقت کے مطابق یہ مذکورہ مسافت طے کر کے نقطہ آغاز پر پہنچنے کا متمنی تھا- اس لئے دیگر مسائل اور معاملات پر توجہ دینا اس کے لئے ممکن نہ تھا- ادھر گلوریا بھی اس ناقابل برداشت سفر کی صعوبت سے اکتا چکی تھی- کیڈلک کے اندر ایک خوفناک زلزلے کی کیفیت طاری تھی- یہ ہیجان خیز اور دہشت انگیز طوفانی منظر قیامت صغریٰ برپا ہونے کے مترادف تھا- خدا خدا کر کے یہ انوکھا اور بے حد خطرناک سفر اپنے اختتام کو پہنچا- فرینک اپنے وعدے اور دعوے کے مطابق تین منٹ کے مقررہ وقت میں یہ پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے نقطہ آغاز پر پہنچ چکا تھا- شیری جیمز اور گلوریا کی حالت ناگفتہ بہ تھی- وہ لمبے لمبے سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل حالت میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں- اور فرینک ان کے پاس کھڑا اپنی کامیابی اور فتح پر نازاں اور فرحاں مسکرا رہا تھا- یہاں سے فارغ ہو کر فرینک انہیں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے معروف ریسٹورانٹ میں لنچ کرانے لے گیا- لنچ بڑا پر تکلف اور عمدہ تھا- آج پہلی مرتبہ شیری جیمز ان کی کمپنی میں بلا چون و چرا کھانا کھا رہی تھی- اسے غالباً اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہر جگہ فرینک کے خلاف اس کی محاذ آرائی ناکام ہو چکی تھی- ادھر فرینک اپنے ہر دعوے اور استدلال میں سرخرو ہو چکا تھا- لنچ کے بعد وہ تینوں واپس ولا لوٹ آئے- شیری اور گلوریا تو اپنے اپنے بیڈ رومز میں

آرام کرنے چلی گئیں۔ اور فرینک دن بھر کی کارگزاری پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لونج کے صوفے پر دراز ہو گیا۔ اب فرینک کو یقین ہو گیا تھا کہ شیری نے مکمل طور پر تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پچھلے دو روز کس قدر کٹھن اور صبر آزما تھے۔ فرینک کو البتہ اپنی کامیابی اور کامرانی پر جائز طور پر ناز تھا۔

اگلا روز سہتا" خاصا پرسکون اور ٹینشن فری تھا۔ شیری جیمز کا رویہ کافی حد تک بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ فرینک اور گلوریا بھی اس بدلے ہوئے حالات سے بہت مطمئن تھے۔ آج شیری جیمز نے خود کچن میں جا کر سب کے لئے ناشتہ تیار کیا تھا۔ اور تینوں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کے بڑے مزے سے ناشتہ کیا۔ اس دوران بڑے خوشگوار موڈ میں باہمی دلچسپی کے معاملات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ پھر فرینک نے شیری جیمز کو اپنے کسی خاص دوست سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جس کو شیری اچھی طرح سے جانتی تھی۔ شیری کو بھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے بخوشی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور ان کی واپسی کے پروگرام کے متعلق البتہ ضرور استفسار کیا۔ جس کے جواب میں فرینک نے بتایا کہ وہ بعد دوپہر تقریباً چار بجے واپس ولا پہنچ جائیں گے۔ جس پر شیری نے اطمینان کا اظہار کیا۔

اس طرح فرینک اور گلوریا تو اپنے کسی دوست سے ملنے چلے گئے۔ اور شیری جیمز بازار سے گھر کے لئے ضروری سودا سلف لینے چلی گئی۔ شاپنگ ہال سے اشیاء فروخت خرید کرنے کے بعد اس نے ایک سیلف سروس ریسٹوران میں ہلکا سا لنچ کیا۔ اور پھر گھر چلی آئی۔ ساڑھے تین بجے وہ فرینک اور گلوریا کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ٹھیک چار بجے شیری نے اپنی بیرونی کھڑکی کے شیشوں سے فرینک اور گلوریا کو بانہوں میں بانہیں ڈالے ولا کی طرف آتے دیکھا۔ تو شیری نے اپنے پرس سے اپنا ریوالور نکال کر صدر دروازے کا نشانہ لے لیا۔ پھر جونہی دروازے کا پٹ کھلا۔ شیری کے ریوالور سے دو گولیاں یکے بعد دیگرے فائر ہو گئیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازے میں فرینک اور گلوریا کی بجائے پولیس سارجنٹ فرانسس نکولس نمودار ہوا۔ اس کا مقدر اچھا تھا کہ اس کا پاؤں سلپ ہونے کی وجہ سے وہ دونوں گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ گیا تھا اب وہ ولا کے اندر آ چکا تھا اور شیری جیمز اس کو اچانک دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی۔ پھر سارجنٹ فرانسس نکولس شیری جیمز کے پاس آ کر کہنے لگا۔

سارجنٹ : یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تمہار ٹارگٹ میں ہرگز نہیں تھا۔ یہ کوئی اور تھا۔ جسے تم مارنا چاہتی ہو۔ اور وہ یقیناً تمہارا بھائی فرینک ہی ہو سکتا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر تم اسے کیوں مارنا چاہتی ہو؟

شیری جیمز: اس نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اور ہر وقت میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ وہ میرا بھائی نہیں ہے۔ وہ تو کوئی فراڈیا ہے۔ خدا جانے وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے۔ ہر کوئی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اسے میرا بھائی قرار دے دیتا ہے۔ اب دوسروں کے کہنے اور تصدیق کرنے سے تو وہ میرا بھائی نہیں بن جاتا۔ پھر روتے ہوئے کہتی ہے کہ اب میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں رہا کہ میں اسے قتل کر دوں۔

سارجنٹ : دیکھو شیری تم جو سوچ رہی ہو۔ وہ تمہیں تباہ و برباد کر دے گا۔ اور تمہاری بقایا ساری عمر جیل کی کال کوٹھریوں میں گزرے گی۔ میری ایک بات غور سے سن لو کہ اگر فرینک اور اس کی بیوی کو کوئی نقصان پہنچا۔ تو میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ اب میں تمہیں آخری وارننگ دیتا ہوں کہ تم آگ سے مت کھیلو۔

شیری جیمز: تو پھر ہی تم ہی بتاؤ۔ سارجنٹ کہ اس مشکل سے کیسے نجات حاصل کروں۔

سارجنٹ : تم کسی طرح پیار و محبت سے فرینک کو شراب یا وائن پلا کر ایک شیشے کے گلاس یا جار پر اس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر لو۔ پھر وہ گلاس یا جار مجھے بھیج دو۔ میں لیبارٹری سے چیک کروا لیتا ہوں کہ وہ نشان تمہارے بھائی کے ہیں۔ یا کسی اور کے۔ یاد رکھو کہ یہ آخری موقعہ ہے فرینک کی شناخت کا۔ اگر یہ مرحلہ چوک گیا۔ تو پھر مجھے دوش نہ دینا۔

شیری جیمز: اوکے سارجنٹ بڑی مہربانی۔ میں آج ہی اس کے انگلیوں کے نشانات حاصل کر کے تمہیں وہ شیشے کے گلاس پیش کر دوں گی۔

سارجنٹ : شیری میں دوبارہ تمہیں وارن کرتا ہوں کہ تم پھر کبھی ایسی اوچھی اور گھٹیا حرکت نہ کرنا۔ یہ کہہ کر وہ ولا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد فرینک اور گلوریا داخل ہوتے ہیں۔ اور فرینک شیری جیمز سے پوچھتا ہے کہ یہ پولیس سارجنٹ ادھر کیسے آیا تھا۔

شیری جیمز: ایسے ہی ملنے۔ اور پوچھ رہا تھا کہ یہاں سب لوگ خیریت سے ہیں۔ پھر شیری جیمز ان دونوں کو ولا کی خوبصورت اور آراستہ بار میں لے جا کر شراب پیش کرتی ہے۔ اور وہ اس شراب ناب سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں کہ فرینک کا شیشے کا گلاس خالی ہو جاتا ہے۔ شیری جیمز تو اسی تاک میں بیٹھی تھی کہ کب گلاس خالی ہو۔ اور وہ اسے اچک کر لے جائے۔ شیری نے بیشک گلاس اٹھا کر بھاگ کر اس کمرے سے نکلنے کی کوشش کی۔ تاکہ اس گلاس پر موجود فرینک کے فنگر پرنٹس کا معائنہ ہو سکے۔ مگر اس کا پاؤں اچانک کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ اور وہ بڑی عجلت اور سرعت سے فرش پر گر پڑی۔ اور اس کے ساتھ میں پکڑا ہوا گلاس چور چور ہو کر ادھر ادھر بکھر گیا۔ شیری جیمز ابھی فرش پر ہی پڑی تھی کہ فرینک نے آگے بڑھ کر اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اور کہنے لگا۔

فرینک: معلوم نہیں شیری جو کام مجھے کہہ کر تم بڑی آسانی سے کر سکتی ہو۔ وہ تم اتنی تکلیف اٹھا کر کیوں کرنا پسند کرتی ہو۔ اگر تم میری انگلیوں کے نشانات حاصل کرنا چاہتی ہو۔ تو لاؤ دوسرا گلاس میں اس پر اپنے فنگر پرنٹس دے دیتا ہوں۔ تم جہاں چاہو لے جا کر چیک کروا کر تسلی کر لو۔ چنانچہ شیری جیمز ایک اور شیشے کا گلاس لے آتی ہے۔ اور فرینک اس پر اپنے فنگر پرنٹس کا پورا امپریشن دے دیتا ہے۔ اور شیری جیمز بڑے اطمینان سے وہ گلاس لے کر بڑی احتیاط سے سارجنٹ فرانسس نکولس کو پہنچا دیتی ہے۔

اگلے روز سارجنٹ فرانسس ادھر سے گزرتے ہوئے شیری جیمز کو یہ پیغام دیتا ہے کہ شیری جو گلاس تم دے گئی تھی۔ اس کا اچھی طرح سے معائنہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے۔ یہ فنگر پرنٹس تمہارے بھائی فرینک ہی کے ہیں۔ یہ آخری امتحان بھی فرینک کے حق میں درست ثابت ہوا۔ لہٰذا اس معاملہ میں اب کوئی شبہ نہ رہ جانا چاہئے کہ فرینک ہی تمہارا حقیقی بھائی ہے۔

سارجنٹ کے یہ الفاظ شیری جیمز کے دماغ پر بم بن کر گرے۔ اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ فرینک نے اس قدر وثوق اور یقین کے ساتھ جو اپنے ہاتھ کے فنگر پرنٹس اسے دیئے تھے۔ اسے کیسے مکمل اطمینان تھا کہ لیبارٹری کا نتیجہ اس کے حق میں ہی ہو گا۔ اب ایک طرف اس کے دوست سارجنٹ فرانسس کی وارننگ تھی۔ اور دوسری طرف فرینک اسے ایک قوی الجثہ اژدھا کی صورت میں اس کے سامنے کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

آج شیری جیمز سخت طیش اور غصے کی حالت میں فرینک سے اس کی اصلیت جاننے کے لئے حتمی طور پر کمربستہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ یہ سربستہ راز افشا کر کے ہی دم لے گی۔ کئی دنوں سے فرینک نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شیری جیمز کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ وہ ہمہ وقت دہشت زدہ حالت میں زندگی گزارنے کی وجہ سے بے حد مضمحل اور لاغر نظر آنے لگی تھی۔ اب وہ خود مسلسل خوف و ہراس سے عاجز آ کر فرینک جیسے خون آشام بھیڑیئے سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار تھی۔ شیری جیمز کے لئے مزید انتظار کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس معرکہ آرائی کے لئے وہ اپنے کمرے کے ایک پوشیدہ دراز سے اپنا بھرا ہوا ریوالور ہاتھ میں لے کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی جہاں اس وقت فرینک اور گلوریا بیٹھے ٹیلیویژن دیکھنے میں محو تھے۔ شیری جیمز کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر فرینک اور گلوریا یکدم چونک گئے۔ اتنے میں شیری کی انتہائی غصیلی آواز سنائی دی۔

شیری جیمز: آج میں تمہارا یہ ڈرامہ ختم کرنے آئی ہوں۔ سچ بتا دو کہ تم کون ہے؟ اور یہاں کس غرض سے آئے ہو؟

فرینک: تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کون ہوں۔ شیری تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ افسوس کہ ابھی تک تم اپنے آپ کو فریب دے رہی ہو۔ ہوش کے ناخن لو۔

شیری جیمز: بکواس مت کرو یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ تم فرینک نہیں ہو۔ تم میرے بھائی کے ہمشکل ہونے کے باعث یہ شرمناک کھیل رہے ہو۔

فرینک اس دوران شیری کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر شیری اسے وہیں رکنے کا حکم دیتی ہے۔ اور ریوالور فرینک کی جانب تان کر سے خبردار کرتی ہے کہ اگر تم نے فوراً" اپنی اصلیت ظاہر نہ کی۔ تو میں تمہیں جہنم رسید کر دوں گی۔

فرینک: یہ تم کیسے یقین سے کہہ سکتی ہو کہ میں فرینک نہیں ہوں؟

شیری جیمز: وہ اس لئے کہ میں نے خود اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ وہ مجھ سے یہ ساری جائیداد چھین لینا چاہتا تھا۔

فرینک: تو اپنے بھائی کا قتل تم نے خود کیا تھا؟

شیری جیمز: ہاں۔

پھر آگے بڑھتا ہے۔ اور شیری ریوالور سے اس پر فائر کر دیتی ہے۔ مگر فائر خالی جاتا

ہے- اور وہ ہنس کر کہتا ہے- احمق لڑکی اپنا ریوالور فرش پر پھینک دو- اس میں گولیاں نہیں ہیں- اور ریوالور چھین کر زور سے تھپڑ اس کے دائیں گال پر مارتا ہے- اور شیری فرش پر گر پڑتی ہے- پھر ایک جگہ ٹیلیفون کر کے کہتا ہے-

ہیلو- آرتھر- میں سی آئی ڈی کا انسپکٹر مارک سمپسن بول رہا ہوں- اور کہا کہ میں نے ملزم شیری جیمز کا اقبالی بیان حاصل کر لیا ہے- آپ فوراً" یہاں آ کر اسے اپنی حراست میں لے لیں-

تھوڑی دیر بعد- سارجنٹ فرانسس نکولس اپنے دو ماتحت پولیس افسروں کے ساتھ اس ولا میں آ کر شیری جیمز کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لے جاتا ہے- اس طرح اس گم شدہ قتل کا سراغ مل جاتا ہے-

○

سفید ہاتھی

ہاتھی جب کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے صرف بھورے رنگ کا دیکھا ہے- سفید ہاتھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا- ہو سکتا ہے دنیا کے کسی جنگل میں سفید ہاتھی بھی پائے جاتے ہوں' مگر ہمارا مطالعہ اور تحقیق اس بات کی مکمل تردید کرتی ہے- ہم نے چڑیا گھروں اور مختلف سرکسوں میں بیسیوں ہاتھی دیکھے ہیں- انگریزی فلموں میں بھی ان کا دیدار کیا ہے- ہاتھیوں کی سینکڑوں تصاویر بھی نظر سے گزری ہیں- مگر سب ایک ہی رنگ کے پائے ہیں- سفید ہاتھی کہیں بھی نظر نہیں آیا- اس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ سفید ہاتھی ہوتا ضرور ہے کیونکہ ہمارے علماء مفکر' ادیب اور صحافی حضرات بارہا سفید ہاتھیوں کا تذکرہ کر چکے ہیں اور وہ کبھی غلط بیانی نہیں کر سکتے- تاہم سفید ہاتھی ہمارے لئے بہت عرصہ اچھا خاصا معمہ بنا رہا-

پرانے زمانے میں برصغیر کے بڑے بڑے بادشاہ اور راجے مہاراجے ہاتھیوں کی فوج رکھا کرتے تھے اور سینکڑوں ملازمین ان کی دیکھ بھال پر مامور تھے- بادشاہ اور راجے مہاراجے خود ہاتھیوں پر قیمتی جواہرات سے مرصع شاندار ہودوں میں بیٹھ کر جلوس کی صورت میں باہر نکلا کرتے اور جنگیں بھی انہیں پر بیٹھ کر لڑتے تھے- ہاتھی پر بیٹھنے کے کئی فائدے ہوتے تھے- مثلاً جنگ کے دوران حریف کی تلوار ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی- اس طرح وہ دشمن کے حملوں سے محفوظ بھی رہتے تھے اور ہاتھی اپنے پاؤں سے دشمنوں کو کچل دیا کرتا تھا- دوسرے بہت دور سے دشمن کی نقل و حرکت کو بھی دیکھ سکتے تھے- تیسرے احساس برتری کا تقاضا بھی پورا ہوتا تھا- کمزور دل دشمن تو ویسے ہی ہاتھی کی جسامت دیکھ کر گھبرا جاتا- صرف ہاتھیوں کی سہولت کے لئے بادشاہ اور مہاراجے اپنے محلات اور قلعوں کے دروازے بہت اونچے اور کشادہ بنواتے تھے- تاکہ انہیں گزرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہو- سنا ہے ان کے پاس سفید ہاتھی بھی ہوا کرتے تھے-

سفید ہاتھی فطرۃ امن پسند ہوتا ہے- اس لئے وہ جنگ و جدل میں شمولیت سے ہمیشہ پرہیز کرتا ہے- کہتے ہیں کہ مشہور عالم مغل شہنشاہ اکبر نے ایک میراثی گویئے کو خوش ہو کر ایک سفید ہاتھی انعام میں دیا تھا- میراثی خوشی سے جھومتا اسے اپنے گھر لے آیا- پھر سوچنے لگا کہ اس گوہر نایاب کو کہاں رکھے- اس غریب کے پاس تو اپنے رہنے کے لئے بھی جگہ کافی نہ تھی- پھر وہ اپنی تمام پونجی اس سفید ہاتھی کو ایک ہی دن میں کھلا کر قلاش ہو گیا اور اس سے گلو خلاصی کرانے کی ترکیبیں سوچنے لگا- ایک طرف تو شاہی فرمان کی تعمیل لازم تھی- دوسری طرف اس کی اپنی کسمپرسی- اگلے روز ہاتھی کے گلے میں ڈھولک باندھ کر کھلا چھوڑ دیا تاکہ اپنی روزی کا بندوبست وہ خود ہی کرے-

عام ہاتھیوں کو سدھایا جاتا ہے' مگر سفید ہاتھی پیدائشی طور پر سب آداب و رموز سے واقف ہوتا ہے- وہ اس قدر نڈر اور بے باک ہوتا ہے کہ جو چاہے کر سکتا ہے- وہ بڑے جان جوکھوں کے کام کر گزرتا ہے اور مشکل ترین مراحل کو آسانی سے طے کر کے اپنا مطلب نکال لیتا ہے- عام ہاتھیوں سے کہیں زیادہ ذہین اور ہوشیار ہوتا ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا- اتنا مکار ہوتا ہے کہ آج تک کوئی اس کی اصلیت کو نہیں پہچان سکا- سفید ہاتھی کی سونڈ اور دم نہیں ہوتی اور نہ ہی عام ہاتھیوں کی طرح لمبا چوڑا حدود اربعہ رکھتا ہے لیکن بوجھ کے لحاظ سے وہ کہیں زیادہ وزنی ہوتا ہے- اس کی توند بظاہر بالکل معمولی سی نظر آتی ہے' مگر اس کی خوراک اور دیگر ضروریات کوئی مشکل ہی سے پوری کر سکتا ہے- مثل مشہور ہے- "زندہ ہاتھی لاکھ کا' مرا سوا لاکھ کا-" مگر یہ مثل سفید ہاتھی پر صادق نہیں آتی' کیونکہ مرنے کے بعد اس کی حیثیت ایک کوڑی کی بھی نہیں رہتی- اس کے کھانے کے دانت تو بہت تیز ہوتے ہیں مگر دکھانے کے دانت سرے سے ہی غائب ہوتے ہیں- سفید ہاتھی کے گزرنے کے لئے اونچے اور کشادہ دروازوں کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی- بلکہ وہ تو تنگ و تاریک سرنگوں سے بھی آسانی سے گزر جاتا ہے- ہاتھی ہمیشہ اپنی سونڈ سے تعظیم بجا لاتا ہے مگر سفید ہاتھی کسی کا احترام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا- وہ ہمیشہ اپنی ہی تکریم کے متعلق متفکر ہوتا ہے اس لئے اس کو سونڈ کی غیر موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوتا- امریکہ اور یورپ کے کالے اور گورے میں جتنا نسلی امتیاز ہوتا ہے' اتنا ہی فرق عام ہاتھی اور سفید ہاتھی میں ہوتا ہے-

سنا ہے کہ سفید ہاتھی دنیا میں سب سے زیادہ پاکستان میں پائے جاتے ہیں کیونکہ یہاں کا پرسکون ماحول اور رنگین فضا ان کے لئے نہایت سازگار ہے- یہاں کی خوبصورت چراگاہیں سفید ہاتھیوں کے لئے ایک خاص قسم کی کشش اور جاذبیت رکھتی ہیں- صحت افزا آب و ہوا' سرسبز و شاداب وادیاں' سدا بہار لہلہاتی کھیتیاں' دل کش قدرتی مناظر' عمدہ اور وافر خوراک سفید ہاتھیوں کی بود و باش اور نشوونما کے لئے بے مثال ہیں- حکومت پاکستان بھی ماضی میں ان کی فلاح و بہبود اور افزائش میں گہری دلچسپی لیتی رہی ہے اور ملک کے سالانہ بجٹ کا بیشتر حصہ ان پر خرچ ہوتا رہا ہے- بعض سرکاری و نیم سرکاری ادارے تو ان سفید ہاتھیوں کے چنگل میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کی منشا کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے- تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ملکی معیشت بھی ان کے رحم و کرم پر ہے- غریب عوام ان سے بری طرح خائف رہتے ہیں کیونکہ سفید ہاتھی ان کا تروتازہ خون پینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور انہیں ہمیشہ قربانی کا بکرا سمجھ کر پیٹ کا ایندھن بناتے ہیں-

قبل ازیں جب سفید ہاتھیوں کی بہتات ہو گئی تھی اور وہ ہر معاملے میں آڑے آنے لگے تو بعض شوریدہ سر سفید ہاتھیوں کو بیرون ملک چراگاہوں میں بھیج دیا گیا- اگرچہ ایسا کرنے سے سرکاری خزانے پر ان کا بوجھ بدستور رہا- تاہم ملکی ہریالی ان کی ہولناکی اور بھوک کا شکار ہونے سے بچ گئی- ہمارے سفید ہاتھیوں کی خوراک بھی عام ہاتھیوں سے بالکل علیحدہ ہے- وہ بڑے بڑے ڈیم' گرڈ سٹیشن' ریل گاڑیاں' دس بارہ منزلہ عمارات' کشادہ پل' شیطان کی آنت جتنی لمبی سڑکیں' نہریں اور اسی طرح کی سینکڑوں اشیاء دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے- لوہا' سیمنٹ' بجری' کول تار' ٹیلی فون اور بجلی کے تار' ریلوے لائنیں' پتھر اور نہ جانے کیا کیا ان کی مرغوب ترین غذائیں ہیں-

سفید ہتھنی اپنے نر کے مقابلے میں کہیں زیادہ مکار' تند خو اور تباہ کن ثابت ہوئی ہے- وہ نہایت حریص اور لالچی ہوتی ہے- اس کی آنکھوں کی ابدی بھوک کبھی نہیں مٹتی- اپنے نر سے بہتر شکاری مانی جاتی ہے- اس کا ذہنی رجحان یورپ کی سفید ہتھنیوں کی طرح جدید فیشن اور اس کے لوازمات کی طرف مائل ہے- وہ ہر جائز اور ناجائز حربے استعمال کر کے اپنی نفسانی خواہشات اور خطرناک جذبات کی تسکین کرتی ہے- عام ہاتھی اپنے مہاوت کی تعظیم اور فرمانبرداری کرتا ہے مگر سفید ہاتھی صرف اپنی مادہ کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے اور اس

کی ناز برداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ سفید ہاتھی کی وسیع تباہ کاریاں اور لوٹ کھسوٹ کے پس پردہ اس کی چہیتی مادہ کی نت نئی اور انوکھی فرمائشیں کار فرما ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنی آبرو تک قربان کر کے پورا کرنا اپنا جزو ایمان خیال کرتا ہے۔

سفید ہاتھی کے شکار کرنے کے طریقے بھی عام ہاتھیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے شکار کی گھات میں چھپ کر نہیں بیٹھتا اور نہ ہی اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے بلکہ وہ اپنی ذہانت اور شاطرانہ چالوں سے ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ شکار خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے سامنے آگرتا ہے اور وہ بڑے آرام سے دبوچ لیتا ہے۔ بعض سفید ہاتھی بڑے مسکین اور معصوم صورت دکھائی دیتے ہیں اور وہ بگلا بھگت کی طرح اپنے شکار پر اپنی پارسائی اور خدا ترسی کا ایسا رعب طاری کرتے ہیں کہ وہ بے چارہ اندھے اعتماد میں ہی اس کا لقمہ بن جاتا ہے۔ سفید ہاتھی اپنے شکار کو کسی دوسرے ہاتھی یا جانور کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتا۔ مگر خود دوسروں کے کئے ہوئے شکار سے بھی حصہ لے لیتا ہے۔

بوڑھے اور تجربہ کار سفید ہاتھی تو اپنی علیحدہ منصوبہ بندی کرتے ہیں اور پھر اسے بڑی عیاری اور چالاکی سے عملی جامہ پہناتے ہیں۔ بڑی بڑی صنعتیں، تجارتی ادارے، سرکاری محکمے، ٹھیکیدار اور زمیندار ان کی دسترس سے باہر نہیں ہوتے۔ ان کا حوصلہ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ مارشل لاء کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

عام ہاتھی سرکس میں کرتب دکھاتا ہے اور وہ کرتب بھی معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں، مگر سفید ہاتھی ہر وقت اور ہر جگہ ایسے ایسے کمال کے کرتب کرتا ہے کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا ہے۔ ان کے انوکھے اور نرالے کرتب سمجھنا جوئے شیر لانے سے کسی صورت میں کم نہیں۔ سفید ہاتھی کے کرتبوں میں جدت بھی ہوتی ہے اور انفرادیت بھی۔ سفید ہاتھی جادو، ہپناٹزم اور ہاتھ کی صفائی دکھانے میں بڑا ماہر ہوتا ہے اور تماشائیوں کو مسحور کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اپنے فن اور کرشموں کی بدولت معاشرے میں وہ بلند مقام بھی حاصل کر لیتا ہے جو کسی دوسرے ہاتھی کو نصیب ہی نہیں ہوتا۔ اگر سفید ہاتھی چاہے (بشرطیکہ اس کا ذاتی مفاد ہو) تو بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیتا ہے اور برسوں کے الجھے ہوئے پیچیدہ مسائل کو منٹوں میں حل کر دیتا ہے۔ اگر اس کا موڈ نہ ہو تو اہم قومی اور ملکی مفادات کے منصوبوں کو ایسے غائب کرتا ہے کہ کوئی ان کا سراغ تک نہیں پا سکتا۔ سانپ کی مادہ کے

متعلق مشہور ہے کہ وہ کثیر تعداد میں بچوں کو جنم دیتی ہے اور پھر انہیں خود ہی بڑی بے دردی سے ہڑپ کر جاتی ہے۔ سفید ہاتھی بھی اپنے ہاتھ سے تکمیل شدہ بیشتر منصوبوں اور سکیموں کو حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے اور کوئی اس سے باز پرس کا مجاز نہیں ہوتا۔ پاکستانی سفید ہاتھی کو چونکہ عمدہ اور پسندیدہ خوراک کی وافر مقدار کسی تردد اور مشقت کے بغیر میسر آ جاتی ہے، اس لئے وہ دوسرے ہم نسلوں کی نسبت زیادہ آرام طلب ہوتا ہے۔ وہ ایئرکنڈیشنڈ کچھاروں میں رہتا ہے جو دنیا بھر کی نعمتوں اور آسائشوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ سفید ہاتھی کو اس کی ضرورت اور سہولت کی تمام چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

ایوب خانی دور سفید ہاتھیوں کے لئے سب سے زیادہ سازگار ثابت ہوا اور انہیں کھل کر اپنی من مانی وحشیانہ کارروائیاں کرنے کے خاطر خواہ مواقع میسر آئے۔ ان کی آزادانہ تخریبی سرگرمیاں باہم عروج پر پہنچ گئیں۔ سرعام مقتل گاہیں قائم ہوئیں جہاں وہ بے گناہ غریب عوام اور ملکی معیشت کا گاڑھا خون نچوڑ کر پیتے رہے اور اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

سفید ہاتھیوں کی ایک اعلیٰ نسل بھی پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ وہ بڑی منہ زور اور خود سر ہے۔ وہ دوسرے ہاتھیوں کو ہاتھی ہی نہیں سمجھتی۔ سفید ہاتھیوں میں ان کا مقام وہی ہے جو ہندوؤں میں برہمن پنڈت کا۔ دوسرے ہاتھیوں کو کمتر اور اچھوت خیال کرتے اور انہیں اپنے برابر بٹھانا ذاتی توہین سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ انہیں نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ تمام چراگاہوں میں ان کا طوطی بولتا ہے۔ یہ نسل خاص طور پر اپنے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتی اور نہ کسی دوسرے ہاتھی کو اپنی مرضی اور منشاء کے خلاف دم مارنے دیتی ہے۔ یہ نسل چونکہ بڑی کینہ پرور، کم ظرف اور مغرور ہوتی ہے، اس لئے اپنی جابرانہ حاکمیت اور بالادستی کی راہ میں رکاوٹ بنتی دیکھے تو اسے کچل دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مطلق العنان بادشاہ تصور کرتی ہے۔ یہی وہ ہاتھی ہیں جن کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہوتا ہے۔

1969ء میں جب دوسری دفعہ مارشل لاء نافذ ہوا تو اس وقت پورے جنگل میں سفید ہاتھیوں کا چوپٹ راج تھا۔ جب جنگل کے لئے خود ساختہ محافظ اعلیٰ نے دیکھا کہ سفید ہاتھیوں کی خون آشام سرگرمیوں اور جنگل دشمن کارروائیوں نے غریب عوام اور دوسرے جانوروں کا جینا حرام کر رکھا ہے تو اس نے تین سو سے زائد مست سفید ہاتھیوں کو جنگل بدر کر دیا۔

پچھلے کئی برس سے جنگل کی ہر چراگاہ سے ہاتھیوں نے پورے جوش و خروش سے یہ مطالبہ شروع کر رکھا ہے کہ ان کے اپنے منتخب نمائندے ہی صرف ان پر حکومت کرنے کے مجاز ہیں اور وہ کسی دوسرے ہاتھی کی حکمرانی تسلیم نہیں کر سکتے۔ جب محمد شاہ رنگیلے کے جانشین نگران اعلیٰ نے جنگل کے حالات بگڑے دیکھے تو اس نے تمام ہاتھیوں کو اپنی پسند کے نمائندے منتخب کرنے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ محافظ اعلیٰ کو یقین تھا کہ ہاتھی چونکہ اتحاد اور تنظیم کے اصولوں سے مکمل طور پر بے بہرہ ہیں وہ حصول اقتدار کی خاطر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے اور وہ مسند حکومت پر براجمان رہ کر تماشا دیکھے گا۔ اس کا حق نمائندگی دینے کا وعدہ بھی محض آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھا' مگر اس کی توقع کے خلاف جب ہاتھیوں نے اپنے نمائندے کثیر تعداد میں منتخب کر لئے تو وہ انہیں مختلف حیلے بہانوں سے ٹالنے لگا اور حکومت ان کے سپرد کرنے کی بجائے سازشیں کرنے لگا اور ہاتھیوں کے نمائندوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے لگا۔

اس دوران جب سفید ہاتھیوں کی نئی نسل نے دیکھا کہ نمائندوں اور محافظ اعلیٰ میں اقتدار کی جنگ شروع ہو چکی ہے تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی روایتی مکاری سے محافظ اعلیٰ کے ہمدرد بن کر سامنے آ گئے اور اسے شیشے میں اتارنے لگے۔ تربیت یافتہ سفید ہاتھیوں نے ایک طرف تو محافظ اعلیٰ کا اعتماد حاصل کر لیا' دوسری طرف عیار اور مشاق سفید ہتھنیوں نے اپنے حسن و تدبر اور ناز و ادا سے محافظ اعلیٰ اور اس کے مشیروں کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لیا۔ وہ ان کے حسن جہاں سوز اور عشوہ طرازیوں سے ایسے گھائل ہوئے کہ اپنی عقل و خرد ہی گنوا بیٹھے۔ ان مہ وشوں کا سنہری جال اتنا مضبوط تھا کہ اسیران عشرت کدہ بے دست و پا ہو کر رہ گئے۔ ہتھنیوں نے نے نہ صرف محافظ اعلیٰ اور اس کے ساتھیوں کو نشہ آور اشیاء کا گرویدہ بنا لیا تھا' بلکہ انہیں اپنے دل فریب حسن اور قیامت خیز جسمانی رعنائیوں سے پوری طرح سرشار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمران ٹولے والے عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں کھو کر جنگل کی حکمرانی اور عدل و انصاف سے بے نیاز ہو گئے۔ سفید ہتھنیوں نے پھر ان مفلوج حکمرانوں کی کمزوری کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے جنگل ہی کو اپنی فریب کاریوں اور ہوسناکیوں کا نشانہ بنا لیا اور اس کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ نگران اعلیٰ اور اس کے مشیروں کی مدہوشی اور بدمستی کا

یہ عالم تھا کہ جب غیر ملکی جانی دشمن ہاتھیوں نے ملک کی سب سے بڑی چراگاہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا' تو انہیں اپنی اندر سبھا میں کچھڑے اڑانے سے اتنی فراغت بھی نہ مل سکی کہ وہ ان کینہ پرور ہاتھیوں سے نبرد آزما ہو سکیں جنہوں نے ان کے وطن عزیز میں آگ لگا دی تھی۔

سیاسی سوجھ بوجھ اور جوڑ توڑ میں بھی سفید ہاتھی کو ملکہ حاصل ہے۔ وہ اپنے حریفوں پر ایسے ایسے نرالے حربے استعمال کرتا ہے کہ مخالف اسے سمجھنے سے پہلے ہی چت ہو جاتا ہے۔ سفید ہاتھی خلوص' اصول' ملکی مفادات اور قومی و ملی اتحاد کا ازلی دشمن ہے۔ معمولی اور غیر اہم باتوں پر اکثر چنگھاڑتا رہتا ہے اور اپنی سازشوں اور تخریبی کاروائیوں پر پردہ ڈال لیتا ہے۔ بیشتر سفید ہاتھی بیرونی جنگلات کے رہنے والے سفید ہاتھیوں کے آلہ کار ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں جنگل کے ایک حصے میں چند مست ہاتھیوں کی ہولناک تباہ کاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ انہوں نے غیر ملکی جانی دشمن ہاتھیوں سے ساز باز کر کے مادر وطن کی دوسری سرسبز و شاداب حسین چراگاہوں کو بھی نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا اور ان کی اس شرمناک کارروائی کی وجہ سے لاکھوں معصوم ہاتھیوں کی قیمتی جانیں تلف ہوئیں۔ اربوں روپوں کا نقصان ہوا' اور جنگل کی سب سے بڑی اور گنجان آباد چراگاہ پر دشمن ہاتھیوں نے طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کر لیا۔

نئے محافظ اعلیٰ نے جنگل کی قیادت ایسے حالات میں سنبھالی جب جنگل مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ خود سر اور مست ہاتھیوں کی سرگرمیوں کا عروج تھا۔ بیرون ملکوں کے ہاتھی بقایا جنگل کو بھی نیست و نابود کرنے کا مکمل ارادہ کر چکے تھے۔ الغرض ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ایسے الم ناک حالات میں اقتدار سنبھالنا بہت بڑی آزمائش تھی۔ نئے نگران اعلیٰ نے مختلف شعبوں سے پرانے گھاگ سفید ہاتھیوں کو فوری طور پر برطرف کر کے ان کی جگہ اپنے معتمد خاص ہاتھیوں کو مقرر کر دیا۔ ان میں سے بیشتر اگرچہ کم عمر' ناتجربہ کار اور رموز سلطنت سے انجان تھے مگر وہ محب جنگل ہاتھیوں کے لطیف جذبات اور نازک احساسات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں معصوم ہاتھیوں پر ڈھائے گئے مظالم اور کی گئی زیادتیوں کا بھی پورا احساس تھا۔ انہوں نے انتخابات کے موقع پر کئے ہوئے وعدوں کے مطابق جنگل کی ان برائیوں' زیادتیوں اور بے انصافیوں کی بیخ کنی شروع کر دی۔ بڑے بڑے عیار' شاطر اور

بااثر سفید ہاتھی جو ماضی میں ارباب بست و کشاد سے مل کر جنگل کے انصاف اور قانون کی حاکمیت کا مذاق اڑاتے رہے تھے اور جنہوں نے غریب اور سادہ لوح ہاتھیوں کو نشانہ ہوس بنا رکھا تھا' بھی نئے حکمرانوں کے عتاب سے نہ بچ سکے۔ ان کی بالادستی' مطلق العنانی اور جبر و استبداد کی روش خاک میں ملا دی گئی اور انہیں اپنی چیرہ دستیوں کے سبب نہایت عبرت ناک انجام دیکھنا پڑا۔

جنگل چونکہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو چکا تھا اور غریب ہاتھی پیہم زیادتیوں اور بے انصافیوں کو برداشت کرتے کرتے عاجز آ چکے تھے' ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ فوری طور پر اپنی پریشانیوں اور تکالیف کا ازالہ چاہتے تھے جو کسی صورت میں بھی ممکن نہ تھا۔ حکمرانوں کے مفاد پرست مخالفوں نے اس صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جنگل کے مظلوم اور مفلوک الحال ہاتھیوں میں بددلی اور مایوسی پھیلانی شروع کر دی۔ غیر ذمہ دار افواہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ناکارہ اور کام چور ہاتھی جو خود محنت سے گھبراتے تھے اور بیٹھے بٹھائے من و سلویٰ حاصل کرنے کے متمنی تھے' اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے نئے نئے مطالبات لے کر غول کی صورت میں حکمرانوں کے پاس آئے دن جانے لگے۔ ان میں سے چند تخریب کار ہاتھیوں نے جنگل کی خوبصورت بیلوں' پھولوں اور کونپلوں کو پامال کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی جنگل کے گیدڑ' لومڑ اور بھیڑیئے بھی باہر نکلنے لگے جس نے بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا کو مزید ہوا دی۔

نئے نگران اعلیٰ اور اس کے ساتھیوں نے صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کی اور مشکلات اور پریشانیوں کا مکمل خاتمہ کرنے کے لئے مہلت مانگی مگر جنگل دشمن اور تخریب کار سفید ہاتھی جو اس مادر وطن کو سرے سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے' اپنی حرکات سے باز کیسے رہ سکتے تھے۔ حکمرانوں کی کمزور اور نرم پالیسی نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے۔ کئی مرتبہ نظم و نسق معطل ہو کر رہ گیا اور جنگل کی فضا مزید ابتر ہو گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیرونی ہاتھیوں کی سازش پیچھے کار فرما ہے اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ اس کا نتیجہ محض تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں نکلے گا' نادان ہاتھی اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کسی ہاتھی کو مادر وطن کی بہبود اور ملی اتحاد کی اہمیت کا احساس نہیں رہا۔ وہ اپنے منتخب نمائندوں کے احکامات سے روگرانی اور انحراف کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض انتہائی سمجھدار اور زیرک ہاتھی جن کی حب الوطنی ایک مسلمہ امر ہے حکمرانوں کی بعض پالیسیوں کو قومی نقطہ نظر سے مفاد عامہ کے منافی خیال کرتے ہیں اور ان میں مناسب رد و بدل کے خواہاں ہیں مگر حکومت ان کی تنقید کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ ایسی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے' جس کے نتائج تباہ کن اور مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں جب جنگل کے باسی ہی اسے جلا کر خاکستر کرنے پر تل گئے ہوں تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہو گا؟ ایک موہوم سی امید ہے کہ شاید رب لم یزل کی طرف سے کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔

○

میرا یار بنا دولہا

پندرہ دفعہ رشتہ طے نہ پانے' تین جگہ منگنی قرار پا کر اچانک ٹوٹ جانے اور زائد المعیاد ہو جانے کے بعد آج میرا جگری یار مبارک علی دولہا بننے والا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اب کے بغیر منگنی قرار پائے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ غالباً سابقہ پیہم ناکامیوں کی وجہ سے یہ معاملہ صیغہ راز میں رکھا گیا تھا۔ شادی کا دعوت نامہ میرے سامنے پڑا تھا۔ میری آنکھوں کو اس رنگین خوبصورت کارڈ کی زرین عبادت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مبارک علی اور شادی' آگ اور پانی' پھول اور کانٹے' دن اور رات' طوفان اور دریا' انسان اور شیطان' نیکی اور بدی کی طرح دو متضاد چیزیں تھیں۔ نہ جانے اس دفعہ کون شامت کا مارا' قسمت کا ہارا اور بے کس بیچارا اپنے جگر کا ٹکڑا مبارک علی کو دینے پر رضامند ہو گیا تھا۔ اگر اسے میرے لنگوٹیے یار کی جملہ صفات کا پتہ چل جاتا تو وہ یقیناً اپنی دختر بد اختر کو کسی مزار یا خانقاہ پر بطور چڑھاوا چڑھا دیتا مگر مبارک علی سے اس کی شادی ہرگز کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ سنا ہے مرد اور عورت کا جوڑا آسمانوں پر ہی طے پا جاتا ہے مگر میرا پیارا دوست تو راندہ افلاک تھا۔ اس لئے یہ جوڑ کسی آسمانی دستاویز میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو خالصتاً" اسی زمین کی ایجاد تھی۔

مبارک علی میرے ساتھ پانچویں جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک ایم اے اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں پڑھتا رہا۔ مگر میٹرک کا امتحان دینے سے قبل ہی پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے منہ موڑ لیا۔ اس کے باپ اور بڑے بھائی نے اسے تعلیم جاری رکھنے پر بہت زور دیا مگر وہ نہ مانا۔ میں نے بی اے کر کے گوجرانوالہ کو خیرباد کہہ دیا اور لاہور سیکرٹریٹ میں ملازمت اختیار کر لی۔

مبارک علی کا باپ شیخ رحمت علی کباڑی بازار میں دوکان کرتا تھا اور اس کا بڑا بھائی شیخ ریاست علی آٹو موبائل کا ماہر انجینئر تھا۔ وہ اکثر پرانی کاریں خرید کر اور مرمت کر کے فروخت کر دیتا تھا جس س اسے معقول آمدنی ہو جاتی تھی یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں کے

پاس وہ اپنی کاریں فروخت کرتا تھا' ان سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے تھے۔

مبارک علی ذہین' شریر اور خوش مزاج لڑکا تھا۔ وہ ہمیں سارا دن لطیفے سنا سنا کر ہنساتا رہتا۔ اس کی صحبت میں کوئی لڑکا بھی غمگین یا پریشان نہ رہ سکتا تھا۔ وہ فی البدیہہ فقرے چست کر کے مزاح پیدا کرنے کا ماہر تھا۔ ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے میں نے اسے قصاب کی دوکان پر گائے کا گوشت خریدتے دیکھا تو میں رک گیا اور قریب جا کر پوچھا---- "کیوں بے کباڑی کی اولاد اب تم نے گائے کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔" اس نے بڑی متانت سے جواب دیا---- "نہیں تو بڑی اوجری خریدنے آیا ہوں..... اس کا اوور کوٹ بنواؤں گا۔"

مبارک علی تھا بڑا کنجوس۔ میں نے چھ برس کی مسلسل رفاقت میں اسے کبھی ایک پیسہ بھی خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ وہ لنڈے بازار کا شہزادہ تھا۔ اس کا لباس ہمیشہ وہاں سے ہی فٹ ہو کر آتا تھا۔ ویسے بھی کباڑی کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی لنڈا بازار سے محبت اور وابستگی قدرتی امر تھا۔

ایک دفعہ ہم اکٹھے نماز جمعہ ادا کرنے جامع مسجد میں گئے۔ اس وقت مولوی صاحب پل صراط کا ذکر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ قیامت کے روز ہر آدمی کو پل صراط پر سے گزرنا پڑے گا' جو کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہو گا۔ مبارک علی یہ سن کر اٹھ بیٹھا اور مجھے کہنے لگا---- "چل یار چلیں۔ یہ سب بہانے نہ گزارنے کے لئے ہیں۔ ورنہ پل صراط تین فٹ چوڑی بھی بن سکتی تھی۔"

مبارک علی کی ظرافت اور شرارتوں کے سینکڑوں واقعات ہیں جن سے ہم تمام دوست لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنے محلے کے تمام لوگوں اور خاص طور پر دوکانداروں کا گہرا دوست تھا۔ جب کسی دوکاندار کو کسی کام کے سلسلے میں کہیں باہر جانا ہوتا تو وہ اپنی جگہ مبارک علی کو بٹھا جاتا اور وہ دوکاندار کے آنے تک بڑی خوش اسلوبی اور ذوق و شوق سے دوکانداری کے فرائض انجام دیتا۔ اس کی اس صفت کی بدولت تین چار جگہ اس کی منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور اسے گھر والوں اور دیگر بزرگوں سے گالیاں سننا پڑیں۔ ایک روز چند حضرات لڑکی والوں کی طرف سے رشتے کے سلسلے میں مبارک علی کو دیکھنے آئے تو وہ اس وقت غلیظ بنیان اور نیکر پہنے گلی میں خربوزے بیچ رہا تھا اور آواز دے رہا تھا---- "چلو شہد سے میٹھے دو آنے سیر خربوزے"---- اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ رشتے کے

لئے آئے ہیں۔ لہٰذا اس نے مہمانوں کے ساتھ بڑی اوٹ پٹانگ گفتگو کی۔ مہمان تو مایوس ہو کر واپس چلے گئے' مگر اگلے روز بزرگوں نے مبارک علی کی خوب سرزنش کی۔

دوسری مرتبہ کوئی پارٹی آئی' تو وہ دھوتی باندھے دودھ دہی کی دوکان پر بیٹھا لسی بنا کر گاہکوں کو پلا رہا تھا۔ لڑکی والے اسے اس حالت میں دیکھ کر بہت نادم ہوئے۔ مبارک علی نے البتہ انہیں مفت لسی پلا کر اپنے آپ کو حاتم طائی کا اصلی پوتا ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ انہوں نے واپس جا کر اس بزرگ سے شکوہ کیا۔ جس نے انہیں اس رشتے کا پتہ دیا تھا۔ وہ بزرگ بھی سخت حیران ہوئے منگنی بھی نہ ہو سکی اور مبارک علی کی خاصی مرمت بھی ہوئی۔ تیسری دفعہ جو حضرات اسے دیکھنے آئے' انہوں نے مبارک علی کو اس وقت بازار میں بیٹھا چند بے فکرے لوگوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے پایا۔ مبارک علی کے جو عزیز بزرگ انہیں ہمراہ لائے تھے' انہیں بڑی خفت اٹھانا پڑی۔ مبارک علی اس طرح ان قابل فخر کارناموں کی وجہ سے بارہا کوئی معقول رشتہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

غالباً 1947ء کے شروع کا ذکر ہے کہ ایک ہندو جوتشی ہمارے گھر آیا تھا۔ اس نے ہاتھ وغیرہ دیکھ کر قسمت کا حال بتایا تھا۔ مبارک علی بھی اتفاق سے اس دن ہمارے گھر میں موجود تھا۔ اس کا ہاتھ دیکھ کر جوتشی نے بتایا تھا کہ اس کے ہاتھ پر علم' سمندر پار سفر اور جورو کی لکیریں نہیں ہیں۔ اور جب ان تین جگہوں پر جہاں اس کے بزرگ نے رشتے اپنی حکمت عملی اور خاندانی شرافت کے بل بوتے پر طے کیے تھے' وہ مختلف وجوہات کی بنا پر ختم ہو گئے تو مجھے وہی جوتشی یاد آنے لگا۔

مبارک علی کی طے شدہ منگنیوں کا عبرت ناک انجام بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ مثلاً ایک جگہ منگنی اس لئے توڑنا پڑی کہ لڑکی والے مبارک علی کو گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ دوسری جگہ ناطہ اس لئے ختم ہوا کہ لڑکی والوں کی منشاء کے مطابق مبارک علی کے والدین ایک بھاری رقم بطور حق مہر اور ماہوار خرچ ادا کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور تیسری دفعہ معلوم نہیں کس کمبخت نے انہیں یہ بتا دیا کہ لڑکے کو چوری کی عادت ہے اور وہ شہر کی مسجدوں سے ٹونٹیاں اتار کر بیچ کھاتا ہے۔ مبارک کے والدین نے انہیں بہت سمجھایا کہ بچپن میں صرف ایک مرتبہ اس سے ایسی غلطی سرزد ہو گئی تھی' اب بالکل ٹھیک ہے مگر ان کی تشفی نہ ہوئی اور انہوں نے منگنی توڑ کر ہی دم لیا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ مبارک علی کو مورد الزام ٹھہرانا سراسر زیادتی ہے۔ وہ غریب اس صورت حال میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب کسی شریف انسان کو اس کی ڈھلتی جوانی پر رحم آ گیا اور اس نے اپنی دختر عزیز سلمیٰ کی شادی کرنے کی حامی بھر لی اور اس طرح اس نابکار جوتشی کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مبارک علی سے مجھے دلی ہمدردی اور قلبی لگاؤ تھا۔ میں اسے دولہا بنتے دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شادی کے دعوت نامے کے مطابق میں نے دفتر سے دو روز کی چھٹی لے لی تھی اور اسی وقت گھر سے چل پڑا۔ صبح 6 بجے والی بس میں سوار ہو کر عازم گوجرانوالہ ہوا۔ ابھی مشکل سے ہی شاہدرہ ہی گزرے ہوں گے کہ بس کا کنٹرول خراب ہو گیا اور ڈرائیور کی جدوجہد کے باوجود بس ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ بس چونکہ اس وقت زیادہ رفتار میں نہ تھی' اس لئے چند ایک سواریوں کو معمولی چوٹیں لگیں۔ ڈرائیور نے بس کا معائنہ کر کے اعلان کیا کہ ٹائی راڈ کھل جانے سے بس اب مزید سفر نہ کر سکے گی۔ ڈرائیور کی مایوسی دیکھ کر میں اپنا سامان لے کر سڑک پر چلا آیا اور دوسری بس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں دوسری بس میں بیٹھا سفر کر رہا تھا۔ جب گاڑی گوجرانوالہ سے ابھی پانچ چھ میل دور تھی تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی بارش اتنی شدید تھی کہ راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجبوراً ڈرائیور کو بس ایک جگہ سڑک کے کنارے کھڑی کرنا پڑی۔ کوئی بیس منٹ بعد بارش ہلکی ہوئی تو ہم پھر چل پڑے۔

جب میں اڈے پر اترا تو اس وقت بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں ایک ٹانگے میں بیٹھ گیا۔ راستے میں بارش پھر تیز ہو گئی۔ تمام شہر زیر آب تھا۔ بعض بعض جگہوں پر تو گھٹنوں تک پانی چڑھ گیا تھا۔ راستے میں بچے بارش کے پانی میں نہا رہے تھے اور راہگیروں پر پانی اور کیچڑ اچھال رہے تھے۔ میں بھی ان کے ستم کا نشانہ تین جگہوں پر بنا۔ خدا خدا کر کے تانگہ جب مبارک علی کے مکان والی گلی کے سامنے پہنچا تو کوچوان نے مجھے وہیں سڑک پر اتار دیا۔ وہاں اس وقت دو دو فٹ پانی چل رہا تھا۔ میں پانی اور کیچڑ سے تو پہلے ہی لت پت تھا۔ اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر اور یاعلی مدد کا نعرہ لگا کر گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میرا پاؤں ایک ٹوٹی ہوئی گندی نالی میں پڑا اور میں ٹھوکر کھا کر گرا اور گلی میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ گندا پانی میرے اوپر سے گزرنے لگا اور میں غوطے پہ غوطہ کھانے لگا۔ وہ تو بھلا ہو راہگیروں کا جنہوں نے بھاگ کر مجھ غریب کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ اس دوران پانی میرے پیٹ میں بھی جا چکا تھا۔ انہی لوگوں نے پانی سے میرا اٹیچی کیس ڈھونڈا۔ اس میں بھی

پانی داخل ہو کر میرے تمام کپڑوں کا ستیاناس کر چکا تھا اور وہ خاصا وزنی ہو گیا تھا۔

میں اپنے حواس مجتمع کر کے تین فٹ پانی میں سے گزر کر مبارک علی کے دولت کدہ پر جا پہنچا۔ اس وقت مبارک علی' اس کا والد اور چند مہمان لنگوٹ باندھے مکان سے باہر پانی نکال رہے تھے۔ وہ شادی کے گھر کی بجائے سیلاب زدہ مکان دکھائی دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کر مبارک علی بہت خوش ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ سب سے پہلے میں نے غسل کیا اور مبارک علی کی ایک بخشیش کردہ دھوتی پہن کر چارپائی پر جا بیٹھا۔ پھر بارش تھمنے اور پانی اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ گلی میں گرنے کی وجہ سے مجھے جسم پر کئی جگہ معمولی خراشیں آئی تھیں۔ ان پر ٹنکچر آئیوڈین لگایا۔ دس منٹ بعد معلوم نہیں مبارک علی میرے لئے کہاں سے چائے لے آیا۔ کیونکہ ان کے گھر میں چولہا جلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے چائے پی تو جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی اور پانی اترنے لگا۔ اس وقت گیارہ بجے کا عمل تھا۔

گھر سے چلنے سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات میرے دماغ میں گھوم رہے تھے اور میں خدشہ محسوس کرنے لگا کہ کہیں اس نامراد جوتشی کی لغو پیش گوئی درست ہی ثابت نہ ہو جائے۔ میں بہت متفکر ہو رہا تھا کہ مبارک علی ایک پتلون اور قمیض لے کر آیا اور مجھے کہنے لگا کہ جلدی سے پہن کر تیار ہو جاؤ۔ اس نے یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا کہ پانی سڑک اور گلی سے اتر گیا ہے۔ میں جلدی سے کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔

بارات لڑکی والوں کے گھر گیارہ بجے پہنچنا تھی مگر ایک بج گیا تھا اور ابھی تک مجھے وہ لوگ نظر نہیں آئے تھے جنہیں بارات میں شامل ہونا تھا۔ مبارک علی کے والد بھی غائب تھے اور چچا بھی۔ بڑے بھائی بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ دولہا ابھی تیار نہیں ہوا تھا۔ بینڈ نہ باجا۔ پھولوں کے ہار بھی کہیں نہ تھے۔ الغرض شادی بیاہ کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو میں نے مبارک علی سے پوچھا۔۔۔۔ "کیوں بے کباڑی کی اولاد کہاں ہیں تمہارے باراتی؟ آج تمہاری شادی بھی ہے یا ویسے ہی کوئی چکمہ دیا ہے؟"

مبارک علی نے بڑی افسردگی سے جواب دیا۔۔۔۔ "کیا کروں یار! سارے رشتہ دار روٹھے بیٹھے ہیں۔ والد صاحب اور بھائی جان انہیں منانے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔۔۔۔ "ناراضگی کی آخر وجہ کیا ہے؟"

"کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔ چچا نیاز علی اس لئے ناراض ہے کہ دس سال پیشتر اس کی

بیوی کے ماموں زاد بھائی کے سالے کی شادی پر ہم لوگ نہ جا سکے تھے"۔۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔۔ "ماموں فضل دین اس وجہ سے روٹھے ہوئے ہیں کہ سات برس قبل ان کے پوتے کے ختنے پر والد صاحب نے صرف دو روپے کیوں دیئے تھے۔ پھوپھی فاطمہ اس وجہ سے نہیں آئی کہ ہم نے اس کے لڑکے اور لڑکی کے سسرال والوں کو معہ اہل و عیال کیوں مدعو نہیں کیا۔ بڑی خالہ ہاجرہ اس لئے غصے میں ہے کہ پچھلی عید پر اس نے اپنا مکان بنانے کے لئے ہم سے جو قرضہ مانگا تھا وہ میرے والد صاحب نہیں دے سکے تھے اور چھوٹی خالہ زرینہ اس وجہ سے روٹھی بیٹھی ہے کہ ہم نے بڑی خالہ کو شادی کا دعوت نامہ کیوں بھیجا ہے۔۔۔۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ آج سے پہلے کسی ایک رشتہ دار نے بھی اپنی ناراضگی ظاہر نہیں کی تھی بلکہ کل رات تک ہمارے گھر کی ہر تقریب میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ آج اچانک عین روانگی کے وقت ان سب کو دورہ پڑ گیا ہے۔"

کچھ دیر بعد مبارک علی کی بہنوں نے اسے نیا لباس پہنایا۔ ماں نے بیٹے کے ماتھے پر خوبصورت طلائی سہرا سجایا۔ بھابھی نے آنکھوں میں کاجل اور کپڑوں پر عطر لگایا۔ عورتوں نے شادی کا گیت گایا۔ ایک شاعر دوست نے سہرے کی شان میں قصیدہ سنایا۔ ایک ہیجڑے نے اپنا نرالا اور مضحکہ خیز رقص دکھایا۔ بچوں نے دولہا کو دیکھ کر خوب شور مچایا۔ اتنے میں کوئی بینڈ باجا لے آیا۔ کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب انتظار کی گھڑیاں ٹوٹ گئیں اور مبارک علی کے والد اور بڑے بھائی روٹھے ہوئے رشتہ داروں کا جلوس لے کر گھر میں داخل ہوئے اور بارات کی روانگی کا باقاعدہ فرمان جاری کر دیا گیا۔

بارات چلنے لگی تو بھانڈ آ گئے اور بلند آواز سے کہنے لگے۔۔۔۔ "جیوے شیخ رحمت علی دی آل اولاد' لکھ لکھ مبارکاں۔ علی دے صدقے' خیر ہووے' سانوں اک سو دا پایا چپ کر کے دے دیو۔ نئیں تے اگلے گھر دس آواں گے جے منڈے نے خضاب دا کوٹ کیتا ہویا اے۔"

مبارک علی کا بھائی یہ سن کر غصے میں آ گیا اور بھانڈوں کو باہر نکالنے لگا اور دھکے دینے لگا۔ بھانڈ نے کہا۔۔۔۔ "مولا خوش رکھے۔ ایس گے دی وجہ توں پندرہ رشتے اگے گوائے جے۔ ہن فیر جواب لین دا ارادہ اے؟" ریاست علی بھانڈوں کو گالیاں دینے لگا تو اس کے باپ نے اسے منع کیا اور جیب سے دس روپے نکال کر انہیں دیئے۔ بھانڈ کہنے لگا۔۔۔۔ "جمان سارا لنڈا بازار ڈھو کے گھر لے آندا جے۔ تے ساڈی واری کنجوسی کر دے او۔ اساں

تے سو ای لینا اے۔ نئیں تے منڈے دا بے رحمی والیاں کولوں چالان کروا دیاں گے۔" ناچار انہوں نے دس روپے اور دے کر جان چھڑائی۔

دو بجے مبارک علی کی بارات پوری آن بان کے ساتھ گھر سے چلی۔ چچا نیاز علی اور ماموں فضل دین دونوں نے دولہا پر سے پیسے لٹانے شروع کر دیئے۔ محلے کے بچے جو پہلے ہی اس ارادے سے اکٹھے ہوئے تھے' پیسوں پر ٹوٹ پڑے۔ برسات کی وجہ سے کیچڑ کی بہتات تو تھی ہی۔ بچوں نے پیسے ڈھونڈتے وقت اپنے ہاتھ بھر لئے اور پھر تمام براتیوں کے کپڑوں سے ہاتھ صاف کئے۔ سڑک پر پہنچ کر دولہا کو عورتوں اور بہنوں کے ساتھ ایک قبل از مسیح ماڈل کی فورڈ کار پر بٹھایا جسے اس کے بھائی نے غالباً وزن کے حساب سے مبلغ ساڑھے پانچ سو روپیہ کے عوض خریدا تھا۔ کار کیا تھی' دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا۔ ہارن کے سوا اس کا ہر حصہ اور پرزہ آواز دیتا تھا۔ جب وہ چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ٹینک مشین گن فائر کرتا جا رہا ہو۔ کار کے پیچھے بارات چلنے لگی۔ کار کی آواز نے بارود کے گولے چلانے کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور بارات کی شان و شوکت کو دوبالا کر دیا۔

چند کتوں نے البتہ راستے میں باراتیوں کو قدرے پریشان ضرور کیا تھا کیونکہ اس کار کو دیکھ کر وہ مچل اٹھے اور دل و جان سے اس پر فدا ہو گئے۔ وہ اپنے دلی جذبات کو چھپانے میں جب ناکام رہے تو انہوں نے اپنی محبوبہ کے ساتھ ساتھ بھاگنا شروع کر دیا۔ بار بار کار کو سونگھتے اور بھونک بھونک کر اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے رہے۔ جب چند باراتیوں نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہا تو انہوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ہم دولہا بیاہنے کی بجائے کسی چور کا کھوج لگانے جا رہے ہیں۔ بہرحال اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ باراتیوں کی رفتار میں تیزی آ گئی اور ہم منزل مقصود پر اندازے سے کافی پہلے پہنچ گئے۔

جب ہم لڑکی والوں کے گھر پہنچے تو اس وقت ساڑھے تین بج رہے تھے۔ کوئی چار بجے نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حق مہر کے تعین کرنے پر فریقین میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ دولہا کے والد شرعی حق مہر مبلغ بتیس روپے آٹھ آنے مقرر کروانا چاہتے تھے جب کہ لڑکی والے پانچ ہزار لکھانے پر مصر تھے۔ دونوں فریق اپنی اپنی بولی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے چند بزرگوں نے مداخلت کر کے ایک ہزار روپیہ پر تصفیہ کروا دیا۔ اس کے بعد دلہن کے لئے ماہوار خرچ کی بات چل نکلی۔ لڑکی والے دو سو روپیہ ماہوار لکھانا چاہتے تھے جب لڑکے

والے سرے سے ہی خرچ لکھ کر دینے کو تیار نہ تھے۔ یہ معاملہ اچھے خاصے تنازعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ مبارک علی کے والد نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ اگر مولوی صاحب (مبارک علی کے ہونے والے سسر) نے اس معاملہ کو اپنے وقار کا مسئلہ ہی بنائے رکھا تو بارات واپس جائے گی۔ ادھر مولوی نبی بخش نے بھی لڑکی کا نکاح کر دینے سے انکار کر دیا اور ہم لوگ اٹھ کر چلنے لگے۔ وہاں موجود بزرگوں نے ایک مرتبہ پھر فریقین کو سمجھایا اور اس بدمزگی کو دور کرنے کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ جیب خرچ مقرر کرنے پر زور دیا جسے فریقین نے کچھ پس و پیش کے بعد تسلیم کر لیا۔ اس بحث اور کھینچا تانی میں چھ بج گئے۔ پھر دلہن کے ماموں لڑکی سے اجازت لینے چلے گئے۔

اس دوران مبارک علی کے بڑے بھائی ریاست علی کو اس کی بیوی اور بہنوں نے دلہن کے گھر بلا بھیجا۔ وہ وہاں گئے تو انہوں نے اپنی عورتوں کو بہت پریشان اور مضمحل پایا۔ وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ مولوی نبی بخش صاحب ان کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں۔ انہوں نے لڑکی کوئی اور دکھائی تھی مگر اب نکاح کسی ادھیڑ عمر بیوہ عورت سے کروا رہے تھے۔ ریاست علی سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی عورتوں کو وہاں سے چلے آنے کو کہا۔ باہر مردانہ میں آ کر اس نے اپنے والد کو یہ راز بتایا تو وہ سیخ پا ہو گئے اور طیش میں آ کر بلند آواز میں اعلان کیا کہ یہ نکاح نہیں ہو گا' برات واپس جائے گی۔ حاضرین سخت حیران ہوئے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ ان کے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ وہاں جوتے' تھپڑ' مکے اور زبانیں چلنے لگیں۔ ہم لوگ بڑے بے آبرو ہو کر مشکل سے بچتے بچاتے وہاں سے بھاگے۔ مبارک کا سب سے برا حال تھا۔ دلہن ساتھ لانے کی بجائے وہ اپنے سہرے اور لباس کے چیتھڑے' سوجا ہوا چہرہ اور جسم پر ایک زخم لایا تھا۔ اس طرح یہ شادی اس منحوس جوتشی کی پیشین گوئی کے مطابق ہوتے ہوتے رہ گئی۔

○

اداوحی الدین شو

ایک شام چند دوستوں کی شہر سے غیر حاضری کی وجہ سے ہماری تاش کی محفل منعقد نہ ہو سکی اور مجھے خلاف معمول جلدی گھر لوٹنا پڑا اور ٹیلیویژن دیکھنے لگا۔ اس وقت ایک صابن کا اشتہار دکھایا جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک خوبصورت لیڈی اناؤنسر سامنے آئی اور آنکھیں جھپکتے ہوئے بڑے شیریں انداز میں کہنے لگی ____ "خواتین و حضرات! آپ کی خدمت میں ادا وحی الدین۔"

اناؤنسر کی تصویر غائب ہوتے ہی ایک بانکا نوجوان جس نے صوفہ کلاتھ کی رنگین پتلون اور پردہ کلاتھ کا کوٹ جو سلمہ ستاروں سے مرصع تھا' زیب تن کئے ہوئے حاضر ہوا اور آتے ہی جھک کر تین مرتبہ بڑی ادا سے کورنش بجا لایا۔ پھر سیدھا ہو کر مائک تھاما اور حاضرین کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہنے لگا---- "اختر شیرانی کی شاعری اور ان کے فن کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ایک پروفیسر صاحب بتا رہے تھے کہ زندگی بھر اختر کو یہ آرزو رہی کہ ان کی محبوبہ اپنے لمبے اور گھنے بالوں سے شراب کے قطرے ٹپکائے اور وہ انہیں پیالے میں جمع کر کے پی جائیں۔"

کسی شریر طالب علم نے بات کاٹتے ہوئے کہا---- "پروفیسر صاحب۔ بالوں میں جوئیں بھی تو ہو سکتی ہیں۔ کیا اختر صاحب انہیں بھی شراب کے ساتھ اپنے حلق میں اتار لیتے؟"

پروفیسر صاحب نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا---- "اختر صاحب کو اپنی محبوبہ سے یہ آرزو تھی۔ تمہاری محبوبہ سے نہیں۔"

"اسی قسم کے ایک پروفیسر صاحب آج ہمارے ہاں تشریف فرما ہیں جو حاضر خوابی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان سے ملئے (پھر بلند پرجوش آواز میں) جناب پروفیسر چوچک سلہریا صاحب۔"

ایک ادھیڑ عمر کے پروفیسر صاحب تالیوں کے شور میں داخل ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا حلیہ مضحکہ خیز ہے۔ ہاتھ میں چھڑی' سر پر پرانی بد رنگ ترکی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ انگرکھا نما سلکی شیروانی جس پر جابجا پان کی پیک کے داغ پڑے ہیں۔ اٹھائیس انچ چوڑی موری کا پائیجامہ اور چاندنی کا جوتا جس کی چمک دمک گرد کی نظر ہو چکی ہے۔ بغیر خط کے خشخشی داڑھی بتا رہی ہے جیسے کئی دنوں سے شیو نہ کی ہو۔ چہرے پر انہوں نے موٹے شیشوں کی بد وضع عینک لگا رکھی ہے۔ مجموعی تاثر کے لحاظ سے وہ کسی قدیم یتیم خانے کے سیکرٹری معلوم ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب چار خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ جاتے ہیں اور ادا وحی الدین ان سے پوچھتے ہیں:

ادا: "آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟"

پروفیسر: "کوریا میں۔"

ادا: "تعلیم کہاں حاصل کی تھی؟"

پروفیسر: "منچوریا میں۔"

ادا: "شادی کہاں کی تھی؟"

پروفیسر: "الجیریا میں۔"

ادا: "کس سے؟"

پروفیسر: "ایک گجریا سے۔"

ادا: "آپ کی بیوی کا نام کیا ہے؟"

پروفیسر: "ثریا۔"

ادا: "آپ مرنا کہاں چاہیں گے؟"

پروفیسر: "نائجیریا میں۔"

ادا: "کون سا ملک زیادہ پسند آیا؟"

پروفیسر: "آسٹریا۔"

ادا: "آپ کا تعلق کس نسل سے ہے؟"

پروفیسر: "آریا سے۔"

ادا : "آپ نے کہیں ملازمت کی ہے؟"

پروفیسر: "ہاں بلغاریا میں۔"

ادا : "کس محکمہ میں؟"

پروفیسر: "بحریا میں۔"

ادا : "آپ ملک کے لئے کس قسم کی طرز حکومت پسند کرتے ہیں؟"

پروفیسر: "جمہوریا۔"

ادا : "آپ کس لیڈر کو زیادہ پسند کرتے ہی؟"

پروفیسر: "راج گوپال اچاریا۔"

ادا : "آپ کی پسند کا ایکٹر کون ہے؟"

پروفیسر: "ای بلیموریا۔"

ادا : "کون سی ایکٹریس زیادہ پسند ہے؟"

پروفیسر: "گلوریا۔"

ادا : "شکر کون سی زیادہ اچھی لگتی ہے؟"

پروفیسر: "کملا جھریا۔"

ادا : "آپ تیل کون سا استعمال کرتے ہیں؟"

پروفیسر: "توریا۔"

ادا : "کس آدمی کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

پروفیسر: "لاہوریا۔"

ادا : "لاہور کی آپ کو کون سی چیز زیادہ پسند ہے؟"

پروفیسر: "پل دو موریا۔"

ادا : "آپ کون سا کپڑا پسند کرتے ہیں؟"

پروفیسر: "ڈوریا۔"

ادا : "آج کل کیا شغل ہے؟"

پروفیسر: "ایک کیفے ٹیریا چلا رہا ہوں۔"

ادا : "آپ کو کون سا ساز بجانا آتا ہے؟"

پروفیسر: "بانسریا۔"

ادا : "آپ کون سا رنگ پسند کرتے ہیں؟"

پروفیسر: "لہریا۔"

ادا : "آپ چارپائی پر سوتے ہیں یا پلنگ پر؟"

پروفیسر: "بوریا۔"

ادا : "آپ کہاں کہاں پڑھاتے رہے ہیں؟"

پروفیسر: "ایک سال سائبیریا میں اور سات سال اسکندریہ میں۔"

ادا : "وہاں آپ کیا پڑھاتے رہے ہیں؟"

پروفیسر: "جغرافیہ۔"

ادا : "آپ کوئی اخبار بھی تو نکالتے رہے ہیں؟"

پروفیسر: "اخبار خود تو نہیں نکالا۔ البتہ "کبریا" کا اداریہ لکھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سلسلہ قادریا کے متعلق بھی بہت کچھ لکھتا رہا ہوں۔"

ادا : "پروفیسر صاحب۔ وقف یعنی Trust کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟"

پروفیسر: "یہ تو صدقہ جاریا کی ہی ایک قسم ہے۔"

ادا : "آپ کا کلام چند مرتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ خوب لکھتے ہیں؟"

پروفیسر: "شکریا۔"

(حاضرین اس پر تالیاں بجا بجا کر داد دیتے ہیں)

ادا : "اچھا پروفیسر صاحب۔ آپ کو حکمت یعنی یونانی طب سے کبھی واسطہ پڑا ہے یا نہیں؟"

پروفیسر: "نہیں صاحب۔ میں تو ملیریا اور لیکوریا کے علاوہ کسی اور بیماری کو نہیں جانتا۔"

پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے ادا وحی الدین کہتے ہیں :

"پروفیسر صاحب۔ آج میرے یہاں ایک ایسے مہمان تشریف فرما ہیں جن کا حکمت کی دنیا میں بہت چرچا ہے۔ آپ بھی ان سے ملئے (پھر بلند آواز میں) شفاء الملک حکیم حاذق الحاج میاں نورالدین بھاگڑی صاحب---- ادا وحی الدین اور حاضرین تالیاں بجا کر نووارد مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔ حکیم صاحب دوسری کرسی پر براجمان ہو جاتے ہیں اور ادا وحی

الدین سوالات شروع کر دیتے ہیں۔

ادا: "آپ کے خاندان نے حکمت کی دنیا میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ آپ خود بھی بڑے نامی گرامی حکیم ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاکستان میں حکمت کب اور کیسے شروع ہوئی؟"

حکیم: "ادا صاحب! میرے دادا میاں اللہ رکھا کے پردادا میاں علم دین حکیم لقمان کے منشی تھے۔ حکیم لقمان خود ان پڑھ تھے اس لئے ان کے تمام نسخہ جات میاں علم دین ہی لکھتے تھے۔ وہ نسوار کھانے کے بہت عادی تھے۔ ایک مرتبہ ان کی نسوار ختم ہو گئی۔ نشہ پورا نہ ہونے کے باعث انہیں بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تو حکیم لقمان نے ناراض ہو کر انہیں ملازمت سے جواب دے دیا۔ چنانچہ تمام نسخہ جات ساتھ لے کر وطن لوٹ آئے اور یہاں آ کر یونانی طب کی بنیاد ڈالی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے کام سنبھال لیا اور سلسلہ اب تک جاری ہے۔"

ادا: "آپ کے خاندان سے باہر حکمت کیسے شروع ہوئی؟"

حکیم: "میرے پڑدادا میاں خیر دین بہت بڑے حکیم تھے۔ انہوں نے میرے دادا میاں اللہ رکھا کو اپنے ساتھ حکمت سکھانے کی غرض سے کام شروع کروایا۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ انہوں نے جلد ہی تمام نسخہ جات حفظ کر لئے۔ انہیں ایک بری علت پڑ گئی تھی۔ یعنی جوا کھیلنے لگے اور جوئے میں لائبریری کی تمام نادر کتب ہار گئے۔ پھر جیتنے والے سے یہ نایاب کتب حکیم اجمل خان نے خرید لیں۔ انہوں نے ان کتابوں کو پڑھ کر خود حکمت شروع کر دی۔ اس طرح حکمت ہمارے خاندان سے باہر چلی گئی۔"

ادا: "کیا آپ یونانی طب میں ایلوپیتھی یعنی انگریزی ادویات بھی استعمال کرتے ہیں؟"

حکیم: "جی ہاں۔ ہم بیشتر انگریزی ادویات پیش کر مریضوں کو دیتے ہیں۔"

ادا: "کیا یہ مریضوں کے ساتھ دھوکا نہیں؟"

حکیم: "دھوکا کیسا۔ مریض جلدی آرام چاہتا ہے اور یہ یونانی طب میں ممکن نہیں۔ اس لئے فوری اثر والی اسپرو قسم کی چیزیں دے دیتے ہیں۔"

ادا: "کیا آپ ایلوپیتھی کی ادویات کی خصوصیات اور طریقہ استعمال سے واقف ہیں؟"

حکیم: "کیوں نہیں۔ یہ تو روزانہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بتایا جاتا ہے اور بچہ بچہ جانتا

ہے۔ میں تو خاص طور پر وہی ادویات استعمال کرتا ہوں جن کا اشتہار ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر آتا ہے۔"

ادا: "کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو ہر آدمی جو بیمار پرسی کے لئے آتا ہے کوئی نہ کوئی نسخہ ضرور تجویز کرتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ایسے نسخے استعمال کرنے چاہئیں؟"

حکیم: "نہیں صاحب یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا.....

"ایک آدمی کی گائے بیمار ہو گئی۔ اس نے ایک دوست سے پوچھا۔ 'بھائی تمہاری گائے بیمار ہوئی تھی تو تم نے اسے کون سی دوا دی تھی؟' اس نے جواب دیا---- 'مٹی کا تیل'---- پہلے شخص نے اپنی بیمار گائے کو مٹی کا تیل پلایا تو گائے مر گئی۔ وہ دوسرے شخص کے پاس گیا اور اسے کہنے لگا۔ 'میں نے اپنی گائے کو مٹی کا تیل دیا تھا تو میری گائے مر گئی۔' دوسرا شخص کہنے لگا---- 'میری بھی گائے مر گئی تھی'---- پہلا شخص حیرانگی سے پوچھنے لگا تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟---- دوسرا شخص کہنے لگا۔ 'اجی تم نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ میں نے گائے کو کون سی دوا دی تھی۔ وہ میں نے بتا دی تھی۔'"

ادا: "آپ لوگوں کے متعلق یعنی میرا مطلب ہے حکیموں کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ ان کا واسطہ کسی نہ کسی طرح قبرستان سے ضرور ہوتا ہے۔ کیا آپ بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں؟"

حکیم: "ادا صاحب۔ شفاء اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ حکیم یا ڈاکٹر تو محض اس کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر کسی مریض کے دن پورے ہو چکے ہوں تو اس میں ان کا کیا قصور۔"

ادا: "نیم حکیم خطرہ جان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

حکیم: "یہ ضرب المثل سو فیصدی درست ہے۔ اکثر اناڑی اور خود ساختہ حکیم سادہ لوح مریضوں کو ایسی چیزیں دے دیتے ہیں جن سے ان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ایسے معالجوں سے احتیاط ضروری ہے۔"

ادا: "آپ بتا سکتے ہیں کہ اب تک آپ نے کتنے لوگوں کو قبرستان پہنچایا ہے؟"

حکیم: "یہی کوئی ڈیڑھ دو سو کے قریب ہوں گے لیکن میں عرض کر دوں کہ وہ وہی لوگ تھے جو اپنی زندگی سے بیزار تھے اور انہیں جینے کی کوئی تمنا نہ تھی۔"

ادا : "کیا کسی مریض نے آپ کی دوائی استعمال کرنے سے پہلے کسی قسم کی وصیت آپ کی موجودگی میں کی تھی؟"

حکیم : "یوں تو کئی ایسے ہوں گے مگر ایک مریض نے خاص طور پر اپنے لواحقین سے کہا تھا کہ وہ (مریض) میری دوا کھانے لگا ہے۔ اس لئے اس کی جیب میں سے تمام پیسے نکال لئے جائیں اور میاں جی کے پاؤں کی طرف دفن کیا جائے۔ پھر اس نے سہمے ہوئے انداز میں مجھے مخاطب کر کے کہا---- 'آؤ حکیم جی۔ ہم دونوں یہ دوا پی لیں۔ میں نے حیرانگی سے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ 'یہ وہی دوا معلوم ہوتی ہے جو آپ نے مرحوم میاں جی کو دی تھی اور جس کے کھاتے ہی ان کا انتقال ہوا تھا۔"

ادا : (پروفیسر صاحب سے مخاطب ہو کر) "آپ پنجابی فلمیں تو دیکھتے ہی ہوں گے؟"

پروفیسر: "صرف دو دیکھی تھیں۔ بھریا میلہ اور سانوریا۔"

ادا : "حکیم صاحب پنجابی فلموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

حکیم : "اجی لعنت بھیجو پنجابی فلموں پر۔ حکیموں کا وہ مذاق اڑاتے ہیں کہ آدمی شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ آخر بے ہودگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

پھر ادا صاحب کھڑے ہوتے ہوئے اعلان کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں پنجابی فلموں کی ایک مشہور اداکارہ آئی ہوئی ہیں۔ ان سے ملئے (پھر بلند آواز میں)

مس تسمہ۔

ایک چنچل مصنوعی بالوں کی سٹائلش وگ لگائے' بھڑکیلا لباس پہنے بڑے ناز و ادا سے چلتی ہوئی سامنے آتی ہے اور اپنا دایاں ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر بڑے دلاویز انداز میں تسلیم بجا لاتی ہے اور تیسری کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر دائیں ہاتھ سے بالوں کو چھو کر اطمینان کر لیتی ہے کہ ان کی ترتیب اور آرائش درست اور قائم ہے۔ ادا وحی الدین مخاطب ہوتے ہیں :

ادا : "مس تسمہ! آپ پنجابی فلموں کی نامور ہیروئن ہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے فلم لائن کیوں کر اختیار کی تھی؟"

تسمہ : "سکول کے زمانے میں جب مختلف ایکٹرسوں کو زرق برق لباس پہنے فلموں میں سرعام کھلم کھلا محبت کرتے اور انہیں البیلی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ناچتے گاتے دیکھتی تھی

تو مجھے ان پر رشک آتا تھا۔ چنانچہ اس رنگین اور دل فریب زندگی نے میرے ارمانوں میں ہلچل مچا دی اور میں نے فلموں میں کام کرنے کا تہیہ کر لیا۔"

ادا : "کیا آپ کے والدین اس معاملہ میں رکاوٹ نہیں بنے؟"

تسمہ : "شروع میں تو انہوں نے بڑی مخالفت کی تھی۔ پھر میرے والہانہ شوق اور ہٹ دھری کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔"

ادا : "شروع شروع میں تو آپ کو فلموں میں کام حاصل کرنے کے لئے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہو گا؟"

تسمہ : "مشکل کس کام میں نہیں ہوتی۔ اچھی شکل و صورت اور دلکش آواز نے میری بہت سی مشکلیں اگرچہ آسان بنا دی تھیں' پھر بھی کافی جدوجہد کے بعد چند معمولی رول ہی مل سکے۔ پھر ایک نامور اداکار مہربان ہو گیا۔ اس کی وساطت سے کچھ اچھے کنٹریکٹ مل گئے۔ میں نے بڑی محنت سے اپنے رولز کو پرفارم کیا۔ میری فلمیں ہٹ گئیں تو دوسرے پروڈیوسروں نے بھی اپنی فلموں میں مجھے کاسٹ کر لیا۔"

ادا : "آپ کی پہلی فلم کون سی تھی؟"

تسمہ : "حقہ پانی" میں میرا معمولی رول تھا مگر "اپنی جتی اپنا سر" میری پہلی ریگولر فلم تھی جس میں بطور ہیروئن میں نے کام کیا تھا۔ یہ فلم بہت کامیاب ہوئی۔"

ادا : "کیا آپ اپنی فلموں کے مکالمے یاد بھی کرتی ہیں؟"

تسمہ : "شروع شروع میں تو نہ صرف مکالمے یاد کرتی تھی بلکہ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر ان رٹے ہوئے مکالموں کی گھنٹوں ریہرسل بھی کرتی تھی۔"

ادا : "کیا اب بھی مکالمے یاد کرتی ہیں؟"

تسمہ : "جی نہیں۔ اب تو یہ میرا معمول بن چکا ہے۔ وہی مکالمے تو میں بیسیوں فلموں میں ادا کر چکی ہوں۔ اس لئے مجھے یاد کرنے یا پھر ان کی ریہرسل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔"

ادا : "کیا آپ نے ڈانس کی تربیت حاصل کی ہوئی ہے؟"

تسمہ : "ڈانس کی ٹریننگ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ صرف اچھل کود کا ڈھنگ معلوم ہونا چاہئے تو کام چل سکتا ہے۔ میں بچپن میں سہیلیوں کے ساتھ رسہ پھلانگتی تھی۔ اس لئے

مجھے ڈانس کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔"

ادا: "آپ اس وقت کتنی فلموں میں کام کر رہی ہیں؟"

تسمہ: "میری زیر تکمیل فلموں کی تعداد تو تقریباً پینتالیس ہے مگر چھ فلمیں ایک ماہ تک ریلیز ہو جائیں گی۔"

ادا: "ریلیز ہونے والی فلموں کے نام کیا ہیں؟"

تسمہ: "دھڑن تختہ' جوٹھ زمانے دی' تیل تے الو' تائی سکینہ' ڈولی لٹ اور ویر تے خصم۔"

ادا: "آپ کو اپنی کونسی فلمیں زیادہ پسند ہیں؟"

تسمہ: "چور اچکا چوہدری' تیلی تے کولہو اور تاجو نائی زیادہ پسند ہیں؟"

ادا: "ایک فلم کا آپ کتنا معاوضہ لیتی ہیں؟"

تسمہ: "یہی کوئی ساٹھ ہزار روپے۔"

ادا: "آپ نے کسی اردو فلم میں کام کیا ہے؟"

تسمہ: "غم اور محبت میں کام کیا تھا مگر بری طرح فلاپ ہو گئی تھی۔ دوبارہ موقع ہی نہیں ملا۔"

ادا: "آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی؟"

تسمہ: "ابھی تو میں نے حج بھی نہیں کیا۔"

ادا: "گویا حج کرنے کے بعد کسی معلم سے شادی کریں گی؟"

تسمہ: "جی شادی تو میں اپنے ملک میں ہی کروں گی۔"

ادا: "آپ نے عمرہ تو پچھلے سال کیا تھا؟"

تسمہ: "کھوٹا سکہ کی شوٹنگ کے لئے لندن' پیرس اور بیروت گئی تھی۔ واپسی پر عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔"

ادا: "پچھلے دنوں ملکی اخبارات میں ایک بہت بڑی شخصیت کے ساتھ آپ کو منسوب کیا گیا تھا۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے؟"

تسمہ: "یہ بالکل جھوٹ اور سراسر بہتان ہے۔ میرے چند رقیبوں نے میری شہرت کو نقصان پہنچانے کے لئے ایسا کیا تھا۔"

ادا: "آپ نے کبھی محبت کی ہے؟"

تسمہ: "جی مجھے اپنے فن اور ذات سے محبت ہے۔"

ادا: "اچھا مس تسمہ' آپ ہمیں اپنی کسی مشہور فلم کے ڈائیلاگ سنائیں۔ جو آپ کو بہت پسند ہوں۔"

تسمہ تھوڑا سا شرما کر اور قدرے لجا کر اپنی فلم "وینو گجر" کے مکالمے سناتی ہے اور حاضرین تالیاں پیٹ کر داد دیتے ہیں۔

ادا: "آپ خود گانا بھی گا لیتی ہیں؟"

تسمہ: "جی صرف غسل خانے کی حد تک۔ یا پھر چھوٹے بہن بھائیوں کو پیسے دے کر سناتی ہوں۔"

ادا: "ہم مفت سننے کے لئے تیار ہیں۔ اور وعدہ رہا۔ خواہ گانا کیسا ہی ہو' داد بھی دیں گے۔"

تسمہ: "معاف کرنا۔ اس وقت گلا خراب ہے۔"

ادا وحی الدین اٹھتے ہیں اور مائک میں کہتے ہیں---- "اس محفل میں آج میں نے گانے کے لئے مس نا نمہ کو بلایا ہے۔ وہ راگ گلوٹیا میں ایک غزل پیش کریں گی۔"

مس نا نمہ گانا گاتی ہے اور حاضرین دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ جس کا مطلب ادا وحی الدین سمجھ جاتے ہیں۔ اور وہ مس نا نمہ کو ایک گیت سنانے کو کہتے ہیں۔ گیت کے بعد حاضرین کے اصرار پر مس نا نمہ اپنا ہی گایا ہوا ایک مشہور فلمی گانا گاتی ہے۔ گانا ختم ہونے پر تماشائی تالیاں بجا بجا کر مس نا نمہ کو رخصت کرتے ہیں۔

ادا وحی الدین مائک لئے اٹھتے ہیں اور ایک لطیفہ سناتے ہیں۔ جو کچھ یوں ہے۔

ایک ریٹائرڈ کرنل شام کو مال روڈ پر جا رہے تھے۔ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی ان کے پاس آئی اور بڑی دلکشی سے آداب بجا لائی۔ کرنل صاحب نے سلام کا جواب تو دیا مگر وہ سوچنے لگے کہ یہ لڑکی کون ہے۔ انہیں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی کرنل صاحب کی الجھن کو بھانپ گئی اور پوچھنے لگی---- "آپ نے مجھے غالباً پہچانا نہیں۔"

کرنل صاحب اپنی خفت چھپاتے ہوئے فوراً" بولے---- "کیوں نہیں پہچانا۔"

لڑکی نے کہا---- "تو پھر بتائیں میں کون ہوں؟"

"بیٹی نرگس ہے۔" کرنل نے کہا۔

"نہیں انکل۔" لڑکی بولی۔

"ہاں ہاں یاد آ گیا بھئی۔" کرنل نے ذہن پر زور دے کر کہا---- "بیٹی شگفتہ ہے۔"

"نہیں پہچانا انکل۔" لڑکی نے کہا---- "اور سوچیں۔"

"اب پتہ چل گیا۔" کرنل نے وثوق سے کہا---- "بیٹی رخسانہ ہے۔"

"انکل میں مسعود ہوں۔" کرنل کو جواب ملا۔ "ملک احمد یار کا لڑکا۔"

ادا وحی الدین کہتے ہیں---- "آج اسی قسم کے ایک پاکستانی ہپی کو میں نے دعوت دی ہے۔ آپ بھی ان سے ملئے..... جناب آغا حسن صاحب۔"

تالیوں کی گونج میں ایک کلین شیو نوجوان لڑکی نما لڑکا۔ شوخ سرخ رنگ کی قمیض۔ جامن رنگ کی بیل باٹم ٹائپ پتلون۔ زرد رنگ کی پھولدار کریپ کا مفلر اور گہرے نیلے رنگ کی سلمی ستاروں والی واسکٹ پہنے داخل ہوتا ہے۔ چہرے پر میک اپ واضع ہے۔ الٹرا ماڈرن لڑکیوں کی طرح بال شانوں پر بکھرے ہیں۔ ادا صاحب کے اشارے پر چوتھی خالی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور ادا وحی الدین سوال کرتے ہیں:

ادا: "آغا صاحب جب آپ شروع شروع میں اس حلیے اور لباس میں عوام کے سامنے جاتے ہوں گے تو تمام لوگوں کی نگاہوں اور توجہ کا مرکز یقیناً بنتے ہوں گے۔ اس وقت آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟"

آغا: "جیسا آپ اس ڈریس میں محسوس کرتے تھے؟"

ادا: "لیکن آپ نے تو لڑکیوں کا لباس پہن رکھا ہے اور حلیہ بھی ماشاء اللہ صنف نازک جیسا ہے؟"

آغا: "آپ بھی تو سپین کے بل فائٹر کا ڈریس پہنے ہوئے ہیں اور چہرے بشرے سے بینڈ ماسٹر لگتے ہیں۔"

ادا: "کیا آپ کے ماں باپ اس لباس اور وضع قطع کو پسند کرتے ہیں؟"

آغا: "I Don't Care وہ پسند کریں نہ کریں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس لئے بلا خوف و خطر اسے اپنایا ہے۔"

ادا: "کیا کبھی ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ کسی نے آپ کو غلطی سے لڑکی سمجھ لیا ہو؟"

آغا: "کئی مرتبہ ایسا چانس ہوا ہے۔ ایک دو دفعہ تو چند کالج بوائز نے مجھے چھیڑا بھی تھا۔"

ادا: "پھر آپ کا ردعمل کیا تھا؟"

آغا: "میں صرف مسکرا دیا اور وہ شرمندہ ہو گئے۔"

ادا: "آپ کو حجامت بنوائے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

آغا: "دو سال سے زائد عرصہ ہوا ہے۔"

ادا: "کیا آپ کا تعلق ہپیوں کی بین الاقوامی تنظیم سے بھی ہے؟"

آغا: "میں نے ممبرشپ کے لئے لیٹر بھیج رکھا ہے مگر ابھی تک کوئی ریپلائی موصول نہیں ہوا۔"

ادا: "آپ ہپی کیسے بنے؟"

آغا: "میں ان کھوکھلی حدود اور مصنوعی روایات کو لائیک نہیں کرتا جو انسان نے سوسائٹی میں ایجاد کی ہیں۔ انسان تو پیدا ہی آزاد ہوتا ہے اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو جی چاہے کرے۔ چنانچہ ان بندشوں اور تفریقوں کا میں قائل نہیں ہوں۔ لہٰذا ہپی بن گیا۔"

ادا: "مذہب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

آغا: "میں مذہب اور ملت کو نہیں مانتا۔ کوئی آدمی اس لئے مسلمان ہے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا۔ عیسائی اس وجہ سے ہے کہ کرسچین فیملی میں جنم لیا۔ یہ سب غلط اور فرسودہ باتیں ہیں۔" This is all Farce-

ادا: "آپ کوئی نہ کوئی نشہ بھی تو کرتے ہوں گے؟"

آغا: "ادا صاحب۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ میں مذہب اور سوسائٹی کی Narrow Mindeness کا مخالف ہوں۔ یہ میرا رائٹ (حق) ہے جو چاہے کروں۔"

ادا: "جنسی آزادی اور اخلاقی بے راہروی کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

آغا: "It Is A Natural Urge اور تخلیق انسانیت کی بنیاد ہے۔ اس لئے میں جنسی آزادی کا زبردست سپورٹر ہوں۔ اخلاقی بے راہروی کا نام تو معاشرے کے ان ٹھیکیداروں نے دیا ہے جو مذہب اور اخلاق کے نام پر لوگوں سے فراڈ کرتے ہیں۔"

ادا: "برا نہ مانیں- میں آپ کے متعلق نہیں بلکہ اکثر بیبیوں کے متعلق وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ نشہ پورا کرنے کی غرض سے چوری ہیرا پھیری' یہاں تک کہ بھیگ مانگنے اور آبرو تک بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرتے- اس کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟"

آغا: "یہ درست ہے- مگر وہ اپنے قول اور فعل کے خود ذمہ دار ہیں- میں کسی کے پرسنل معاملات میں دخل اندازی بہرحال جائز نہیں سمجھتا-"

ادا: "آپ کو سب سے زیادہ کونسی چیز پسند ہے؟"

آغا: "اپنا ڈریس-"

ادا: "سب سے قابل نفرت آپ کسے خیال کرتے ہیں؟"

آغا: "مولویوں کو-"

ادا: "آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

آغا: "لو اور میرج سب فراڈ چیزیں ہیں- میں ان پر یقین ہی نہیں رکھتا-"

ادا: "آپ کس قسم کی تصانیف پڑھنا پسند کرتے ہیں؟"

آغا: "Crime (جرائم) Mystr (پراسرار کہانیاں) اور Sex (جنس)_"

ادا صاحب مائک ہاتھ میں لئے اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں---- "مزاح انسان کی زندگی کا لازمی جزو ہے- میں نے آج ملک کی ایک معروف شخصیت کو بلایا ہے- ان سے لطف اندوز ملاقات کریں.....

"جناب رضوان اسلمی صاحب-" (تالیاں)

ایک مختصر سا نوجوان مائیکرو فون پر آ کر کہتا ہے---- "میں آج آپ کو ملک کے ایسے نوجوان کے متعلق لکھا ہوا گانا سناؤں گا جو تبدیلی جنس کا شیدائی ہے-" پھر پیی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے- "آپ میرا مطلب سمجھ ہی گئے ہوں گے-" پھر وہ بڑی سریلی آواز میں گاتا ہے-

پڑی چہرے پہ ہے پھٹکار دیکھو
نئی تہذیب کے شاہکار دیکھو
کہیں زلفوں کو پالا جا رہا ہے
منڈھا کے مونچھیں سالا جا رہا ہے

خدا جانے یہ خانم ہے کہ خاں ہے
حیا سوزی کا چلتا کارواں ہے
ڈبویا اس نے غیرت کا سفینہ
کدھر کو جا رہا ہے یہ کمینہ

بغاوت کا ہے یہ مینار دیکھو
نئی تہذیب کے شاہکار دیکھو
یہ بیل باٹم' یہ میک اپ کا سہارا
یہ نسوانی اداؤں کا نظارا
یہ زلفوں کا الجھنا گال کے ساتھ
یہ کولہوں کا مٹکنا چال کے ساتھ
جہاں میں آبرو کے پاؤں ڈولے
کوئی بے راہروی پہ خاک بولے

ہماری نسل کے معمار دیکھو
نئی تہذیب کے شاہکار دیکھو
نحوست چہرے پہ چھاتی ہوئی ہے
حمیت تجھ سے گھبرائی ہوئی ہے
کہاں تک چرس کے بل پر چلے گا
اسی ذلت سے آخر تو مرے گا
تجھے راکٹ کچھ ایسا لڑ گیا ہے
تیرا جذبہ حیاء کا مر گیا ہے
کبھی شیشے میں منہ سرکار دیکھو
نئی تہذیب کے شاہکار دیکھو.....

گانا ختم کر کے اسلمی یہ لطیفہ سناتا ہے:

ایک آدمی دوسرے سے پوچھتا ہے---- "آپ کے پیٹ میں تکلیف تھی- کس چیز

سے آرام آیا تھا؟" دوسرے آدمی نے جواب دیا--- "بس پرہیزی غذا کھانے سے ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

پہلے آدمی سے پوچھا--- "پرہیزی غذا کیا تھی؟"

دوسرے آدمی نے جواب دیا--- "چھ انڈے فرائی۔ ایک پاؤ بالائی' پچاس باداموں کی سردائی۔ آدھ سیر رس ملائی۔ آدھ پاؤ بادیا خطائی کا ناشتہ' اور چار مرغ روسٹ' دو درجن نوسٹ اور ایک سیر حلوہ اخروٹ دوپہر کو کھاتا تھا۔ رات کو صرف ایک سیر گوشت کے کباب' آدھ سیر عناب اور ایک بوتل دیسی شراب پر گزارہ کرتا رہا۔ ایک ہفتہ میں اس خوراک سے ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

دوسرا لطیفہ یہ سنایا:

سحری کے وقت ایک بوڑھا دیہاتی چارپائی پر لیٹے ہوئے بری طرح کھانس رہا تھا۔ اور جب کھانسنے سے تھوڑا سا وقفہ ملتا تو اس دوران اپنے پوتے کو حقہ لانے کو کہتا۔ ایک روز پوتے نے حقہ لانے میں تاخیر کی تو اس کی رٹ اور تیز ہو گئی اور شدید کھانسی کے دوران حقہ' حقہ' حقہ چلانے لگا۔ اتنے میں بوڑھے دیہاتی کا بیٹا آ گیا اور باپ کی حالت زار دیکھ کر کہنے لگا--- "میاں جی۔ آپ حقے کے اتنے دیوانے ہیں۔ کبھی اللہ اللہ بھی کر لیا کرو۔"

بوڑھے نے کہا--- "بیٹا۔ جنہیں وقت پر حقہ نہیں ملتا۔ انہوں نے نماز خاک پڑھنی ہے۔"

اس کے بعد وہ حاضرین کے سامنے جھکتا ہے اور تعظیم بجا لاتا ہے۔ پھر آرام سے باہر چلا جاتا ہے۔

پھر ادا وحی الدین مائک لئے سامنے آتے ہیں اور اپنے ایک عزیز دوست مجید گوہر کا کلام سنانے کا اعلان کرتے ہیں اور بلند آواز سے کہتے ہیں:

"ذرا ٹھیکہ لگانا۔"

ٹھیکے کی مدھ بھری آواز کے ساتھ پھر یہ گیت ادا وحی الدین بڑے پیارے انداز میں سناتے ہیں۔

میرے وطن کی لاج

کون رکھے گا آج
میرے وطن کی لاج

محنت سے منہ موڑ لیا ہے
مشکل میں جی چھوڑ دیا ہے
قوم سے ناطہ توڑ کے تم نے
غیر سے رشتہ جوڑ لیا ہے

جھوٹوں کے سرتاج
کون رکھے گا آج
میرے وطن کی لاج

کر کے ملاوٹ نفع کمایا
کم تولا' کیا ہاتھ دکھایا
عشرت میں پھر ڈوب کے تم نے
تگنی کا ہے ناچ نچایا

پبلک کو کرتا ہے ڈاج
کون رکھے گا آج
میرے وطن کی لاج

راس نہ آئی تجھے آزادی
کرتا ہے نفرت کی منادی
آدھا دیش گنوا کے تو نے
ساری قوم کی ناک کٹا دی

بن گیا خود محتاج
کون رکھے گا آج
میرے وطن کی لاج

صوفی جو ایمان کو بیچے
مفتی جو قرآن کو بیچے

لیڈر وہ جو سب سے بڑھ کر
عزت' قوم اور آن کو بیچے

یہ ہے لیڈر کی معراج
کون رکھے گا آج
میرے وطن کی لاج

پرش دکھی ہے بیاکل ناری
دھن والے ہیں سب بھکاری
چور اچکے بنے پجاری
چپ سادھے ہیں کرشن مراری
کیسا کلجگ ہے مہاراج
کون رکھے گا آج
میرے وطن کی لاج

گانا ختم ہوتے ہی اداوجی الدین جھک کر کورنش بجا لاتے ہیں۔ اور سکرین پر مہمانوں' فنکاروں اور دیگر شعبوں کے انچارج اور معاونین کے نام آ جاتے ہیں جنہوں نے اس شاندار پروگرام کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔ پھر انگریزی میں خبریں شروع ہو گئیں۔

○

کلن اینڈ منا

شہر کی مشہور شاہراہ کے وسط میں دو کمروں پر مشتمل مشہور و معروف سراغرسان ادارے میسرز کلن اینڈ منا کا دفتر واقع ہے۔ دفتر کے صدر دروازہ پر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں ہے جس پر جلی حروف میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے۔

کلن اینڈ منا

امپورٹرز۔ ایکسپورٹرز اینڈ ڈیٹیکٹیو ایجنٹس Detective Agents

ایک وسیع و عریض کمرے میں جو بطور دفتر استعمال کیا جاتا ہے۔ دو میزیں' چند کرسیاں' کتابوں کی دو الماریاں' ایک فائل ریک' ٹائپ رائٹر اور ٹیپ ریکارڈ رکھے ہیں۔ میزوں پر دو ٹیلیفون' چند کتابیں اور فائلیں پڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک میز کے سامنے لحیم و شحیم ادھیڑ عمر کا ذہین شخص کلن براجمان ہے۔ دوسری میز کے اس طرف ایک بھاری بھرکم شخص منا بیٹھا ہے۔ منے کے چہرے سے فکر اور پریشانی ہویدا ہے اور وہ اپنے ساتھی کلن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

منا: یار کلن میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جو پولیس کے عمل دخل میں ہو۔ مجھے ڈر لگتا ہے پولیس والے کہیں ہمیں پھر نہ کسی چکر میں دھر لیں۔

کلن: منے تمہیں ہزار مرتبہ سمجھایا ہے کہ ایسی بے ہودہ اور منحوس باتیں منہ سے نہ نکالا کرو۔

منا: لیکن ہمیں اپنی پچھلی غلطیوں سے سبق ضرور حاصل کرنا چاہئے۔ تم اگر اس وقت میری بات مان لیتے تو ہمیں تین سال قید بامشقت تو نہ کاٹنی پڑتی۔

کلن: وہ بھی تو تمہاری حماقتوں کا نتیجہ تھا۔ اگر تمہاری موٹی کھوپڑی میں ذرا بھی سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو تم کوئی بہانہ بنا کر تھانیدار کو ٹال دیتے مگر اقبال جرم ہرگز نہ کرتے۔

منا: لیکن کلن میں کیا کرتا۔ تھانیدار نے ایمان سے میری پتلون میں چوہے چھوڑ دیئے

تھے- ان ظالم کے بچوں نے میری ٹانگوں کو کاٹ کاٹ کر قیمہ بنا دیا تھا- پھر وہ ایسی کھجلی کرتے تھے کہ خدا قسم میری جان ہی نکل رہی تھی-

کلن : اگر تمہارا سیر ڈیڑھ سیر گوشت کم ہو جاتا- تو کیا فرق پڑتا- ذرا سی تکلیف برداشت کر لیتے تو تم مرتو نہیں چلے تھے-

منا : (سر کو خفت سے کھجاتے ہوئے) کلن میں نے سنا ہے کہ ہاتھی جیسا موٹا اور تنو مند جانور ایک چیونٹی کے کاٹنے میں مرجاتا ہے- مجھے تو چوہا کاٹ رہا تھا-

کلن : (غصے سے جمائی لیتے ہوئے) پھر تم مرکیوں نہ گئے؟

منا : میں اکیلا نہیں مرنا چاہتا پھر جس کو اللہ بچانے والا ہو' اسے کون مار سکتا ہے؟ یہ بھی تو سوچو کہ میں مرگیا ہوتا تو تمہارے ساتھ جیل کون جاتا-

کلن . (مسکراتے ہوئے) ارے الو کی دم کبھی عقل سے بھی کام لے لیا کرو-

منا : اچھا بابا- اس دفعہ معاف کر دو- آئندہ احتیاط برتوں گا- (مسکراتے ہوئے) یار ایک چرس بھرا سگریٹ تو عنایت کرو-

کلن : لعنت ہو تم پر- میرے پاس سگریٹ ہوتا تو میں بار بار جمائیاں کیوں لیتا-

(منا ایش ٹرے کی طرف لپکتا ہے- سگریٹ کا کوئی بچا کھچا ٹکڑا تلاش کرنے لگتا ہے- مگر مایوس ہو کر اپنی کرسی پر آبیٹھتا ہے)-

منا : (فکر مند لہجے میں) جرائم کی تفتیش کرنا تو پولیس کا کام ہے- کلن! اس طرح ہم پولیس کے معاملے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑائیں گے- میری مانو تو باز آجاؤ- اس کا انجام اچھا نہ ہو گا-

کلن : عقل کے اندھے ٹانگ اڑانے کا مطلب کیا ہے؟ ہم تو پولیس کی امداد کریں گے اور مجرموں کو پکڑنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے-

منا : کلن بعض ملزم میں نے سنا ہے بے حد خطرناک ہوتے ہیں- وہ ہمیں جان سے بھی مار سکتے ہیں-

کلن : منے تو اتنا بزدل کیوں ہے؟ موت تو ایک دن آنی ہی ہے-

منا : لیکن میں کسی مجرم کے ہاتھوں نہیں مرنا چاہتا- یہ تو حرام موت ہو گی-

کلن : تم کیسے مرنا چاہتے ہو؟

منا : مرغ روسٹ' بریانی اور کسٹر وغیرہ کھا کر-

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے- کلن ریسیور اٹھا کر ہیلو کہتا ہے)-

کلن : جی ہاں میں کلن اینڈ منا ڈیٹیکٹیو ایجنسی سے بول رہا ہوں- فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟..... جی کیا کہا- کوئی آپ کو جان سے مار دینا چاہتا ہے؟ وہ کون بدبخت ہے؟..... کیوں نہیں ہم آپ کی جان کی حفاظت کر سکتے ہیں..... بہتر ہو گا آپ یہاں تشریف لے آئیں- معاملہ طے ہو جائے گا..... کیا کہا آپ نہیں آسکتے؟ اچھا ہم آجاتے ہیں.....

ہماری فیس؟ آپ سے مناسب فیس ہی لیں گے..... آپ پانچ ہزار دے دیں..... اجی صاحب- جان کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے- پھر ہم بھی تو اپنی جان کی بازی لگا کر آپ کی زندگی بچائیں گے- جی بہت اچھا- میں ابھی حاضر ہوا- ذرا اپنا پتہ لکھا دیں-

شیخ مفرور احمد- بلاک نمبر 10

کوٹھی نمبر 420- بوچڑ کالونی

(ٹیلی فون بند کر کے کلن اٹھ کھڑا ہوتا ہے- منے کو دفتر میں بیٹھے رہنے کی تلقین کر کے باہر چلا جاتا ہے- تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی کالی شیروانی' چوڑی دار پاجامہ' جناح کیپ پہنے' ہاتھ میں چھڑی لئے داخل ہوتا ہے اور اپنا تعارف کراتا ہے)-

اجنبی : مجھے سیٹھ داؤد کہتے ہیں- منا : تشریف رکھیں سیٹھ صاحب زہے نصیب- آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی- فرمایئے- بندہ کیا خدمت کر سکتا ہے؟

سیٹھ : کل رات سوتے میں کسی نے میری دوسری بیگم کو قتل کر دیا ہے-

منا : توبہ' توبہ' قتل! قسم لے لیں- میں نے قتل نہیں کیا- میں تو آپ کی بیگم کو جانتا تک نہیں-

سیٹھ : میرا مطلب ہے کہ آپ پتہ چلائیں- اس کو کس نے قتل کیا ہے-

منا : یقیناً کسی قاتل کی کارگزاری لگتی ہے-

سیٹھ : وہ تو میں بھی جانتا ہوں- لیکن قتل کیوں ہوا؟

منا : آپ کی بیگم بد زبان ہو گی-

سیٹھ : نہیں تو-

منا : بد طینت ہو گی-

سیٹھ : یہ جھوٹ ہے-

منا : بد اخلاق ہو گی-

سیٹھ : ہرگز نہیں۔

منا : بد کردار ہو گی۔

سیٹھ : یہ سراسر بہتان ہے۔

منا : پھر کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی ہی۔ ورنہ بلا وجہ کون قتل کرتا ہے۔

سیٹھ : یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں اور آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ قاتلوں کا کھوج لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے۔

منا : یہ تو پولیس کا کام ہے۔ ہم کیوں اس معاملے میں دخل دیں؟

سیٹھ : آپ نے ڈیٹیکٹیو ایجنسی کیوں قائم کر رکھی ہے؟

منا : اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بے رحم قاتلوں سے خواہ مخواہ دشمنی مول لیتے پھریں۔

سیٹھ : تو پھر اپنا بوریا بستر گول کریں۔ لوگوں کا وقت کیوں برباد کرتے ہیں۔

منا : آپ براہ کرم یہاں سے تشریف لے جائیں۔

(سیٹھ باہر چلا جاتا ہے۔ کلن دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ کلن منے کا بگڑا ہوا موڈ دیکھتے ہوئے پوچھتا ہے)

کلن : منے وہ آدمی جو ابھی ابھی گیا ہے، کیسے آیا تھا؟

منا : وہ اپنی مقتولہ بیوی کے قاتل کا کھوج لگوانے آیا تھا۔

کلن : تم نے اسے کیا جواب دیا؟

منا : یہی کہ یہ پولیس والوں کا کام ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

کلن : تیرا ستیاناس، روزی کے دشمن، تمہاری حماقت سے اچھا خاصا گاہک ہاتھ سے نکل گیا۔

منا : کلن ذرا سوچو تو ہم کسی خطرناک مجرم کو کیسے تلاش کر سکتے ہیں اور پھر اس کی دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔

کلن : بزدل گینڈے۔ مجھے پہلے ہی یہ خدشہ تھا کہ میری غیر حاضری میں تم کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور کرو گے۔

منا : (ندامت سے) دراصل نشہ ٹوٹنے سے دماغ جواب دے گیا تھا۔ (معذرت طلب لہجے میں).....

..... آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اچھا کلن یہ بتاؤ۔ تم جہاں گئے تھے۔ وہاں سے فیس ملی یا نہیں؟

کلن : فیس کیسے ملتی۔ میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی وہ آدمی قتل کر دیا گیا تھا اور پولیس مصروف تفتیش تھی۔

منا : چلو یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر معاملہ طے پا جاتا تو ہم بھی آج اس کی حفاظت کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے۔

کلن : بکواس بند کرو۔ ہاتھی کے بچے! مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ تمہاری بزدلی کی بدولت ہم ضرور فاقوں مریں گے۔

منا : "مایوس نہ ہو کلن۔ اللہ تعالیٰ روزی دینے والا ہے۔ کوئی نہ کوئی آسامی بھیج ہی دے گا۔"

(ایک گھنی مونچھوں والا گبھرو نوجوان داخل ہوتا ہے۔ اور بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر کلن سے مخاطب ہوتا ہے)۔

نوجوان : کیا آپ کا ادارہ سراغرسانی کرتا ہے؟

کلن : جی ہاں۔ ہم نے تو اس لائن میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

نوجوان : آپ کس قسم کی سراغرسانی کرتے ہیں؟

کلن : ہر قسم کی۔ چور، اچکے، ڈاکو، قاتل، رہزن، نوسرباز، پاکٹ مار اور چڑی مار، سبھی کو پکڑانے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ ہم لوگ منٹوں میں انہیں Detect کر لیتے ہیں اور پھر ان کا وہ حشر کرتے ہیں کہ انسانیت لرز جاتی ہے۔

نوجوان : کیا آپ نے کہیں سے سراغرسانی کی تربیت حاصل کی ہے؟

منا : مختلف جیلوں میں تین برس گزار کر کافی تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔

نوجوان : جی کیا کہا، جیل میں؟.....

کلن : (نوجوان کی بات کاٹتے ہوئے) ان کا مطلب یہ ہے کہ مسٹر منا تین برس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ اس دوران ملزموں کی ذہنی کیفیت، عادات و اطوار کو اچھی طرح سٹڈی کر چکے ہیں۔ پھر استعفیٰ دے کر یہ کام شروع کر دیا۔

نوجوان : (مسکراتے ہوئے) اچھا اب سمجھا۔ یہ امپورٹر اور ایکسپورٹر کا کیا مطلب ہے؟

منا : اگر کوئی مجرم جرم کر کے بھاگ جائے تو ہم اسے پکڑ کر یہاں لے آتے ہیں اور

اگر کوئی فرار ہونا چاہے تو ہم اس کے فرار ہونے میں مدد دیتے ہیں۔

نوجوان : اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

کلن : نہیں صاحب' ہمارا مطلب ہے کہ اگر کوئی ڈاکو' قاتل' خطرناک مجرم یا غنڈہ زندگی سے فرار چاہے تو ہم اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے۔

نوجوان : بھئی آپ تو بڑے دلچسپ لوگ ہیں۔

کلن : میاں صاحب اپنا تو کاروبار ہی ایسا ہے۔ پھر ہم ہر کام ایک خاص سلیقے اور ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ حکمت عملی سے کام نہ لیں تو مجرموں کا پتہ کیسے چلا سکتے ہیں۔

نوجوان : مسٹر کلن اگر کسی خطرناک قاتل یا غنڈے سے کسی شریف آدمی کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو تو کیا اس صورت میں آپ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیتے ہیں؟

کلن : کیوں نہیں۔ آج ہی ایک صاحب شیخ مفرور احمد آف بوچڑ کالونی کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ مگر افسوس کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کوئی سفاک درندہ انہیں قتل کر کے فرار ہو گیا۔

نوجوان : تو آپ اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟

کلن : ہم اپنی ایجنسی کی نیک نامی اور اچھی شہرت کے پیش نظر اس نامعلوم قاتل کو تلاش کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھا کر ہی دم لیں گے۔ یہ ہمارا اصول ہے۔ ہم اپنے موکلوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

منا : قاتل ہم سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔ ہم اسے ایسا عبرت ناک سبق دیں گے کہ اس کی اگلی پشتیں بھی پناہ مانگیں گی۔

(نوجوان اپنی جیب سے پستول نکال کر کلن اور منا کی طرف تان دیتا ہے اور کہتا ہے)۔

نوجوان : خبردار' اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ میرے پستول کی گولیاں تمہارے سینے کو چھلنی کر دیں گی۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے۔ میں ہی شیخ مفرور احمد کا قاتل ہوں۔ اگر تم لوگوں نے میرے معاملے میں کوئی دخل اندازی کی تو میں تم جیسے اچکوں کو راستے سے ہٹانا خوب جانتا ہوں۔

(کلن اور منا کانپنے لگتے ہیں)

منا : (کانپتے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑ کر) قاتل صاحب۔ ہمارے باپ کی بھی توبہ' جو

ہم آپ کے معاملے میں دخل دیں۔ آپ ہمارے علاوہ جسے چاہیں خوشی سے قتل کریں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ ایک دفعہ معاف کر دو۔ ہم یہ کاروبار ہی چھوڑ دیں گے۔

کلن : بھائی صاحب' میں نے تو ویسے ہی آپ کو گاہک سمجھتے ہوئے ایسا کہہ دیا تھا' وگرنہ شیخ مفرور احمد مقتول سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ نے برا مانا ہے تو معافی چاہتا ہوں۔

قاتل نوجوان : کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے میرے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گا۔

(قاتل دفتر سے باہر نکل جاتا ہے۔ کلن اور منا اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر منا لمبا سانس لے کر کہتا ہے)۔

منا : کلن دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ یہ کاروبار بے حد خطرناک ہے۔ آج بڑی مشکل سے جان بچی ہے۔ اب بھی میری بات مان لو۔ یہ دھندا چھوڑ دو۔

کلن : پہاڑی بکرے۔ تمہیں حوصلہ ہارنے کے علاوہ کچھ اور بھی آتا ہے؟

منا : پسینہ آتا ہے اور تجھ پر رحم!

کلن : بکواس بند کرو۔

منا : اگر تم یہی چاہتے ہو کہ ہماری لاوارث لاشوں کا پوسٹ مارٹم کسی سرکاری ہسپتال میں ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنی مرضی کر لو۔

کلن : منے کچھ اپنی قسمت ہی ایسی ہے۔ اب تک جو بھی ترکیب استعمال کی ہے۔ وہ الٹی پڑی ہے۔

(کلن سوچنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اٹھتا اور منے کو کہتا ہے)۔

کلن : منے میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ تم دفتر میں ہی بیٹھنا۔

(دس منٹ بعد ایک بوڑھی عورت دفتر میں داخل ہو کر پوچھتی ہے)۔

بڑھیا : بیٹا۔ یہ ملزموں کے کھوج لگوانے کا دفتر ہے؟

منا : (خوشی سے) ہاں اماں جی۔ بیٹھئے۔ تشریف رکھئے۔

بڑھیا : میں لٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ (زار و قطار روتے ہوئے)۔ خدارا میری مدد کریں۔

منا : (خود بھی رونے لگتا ہے اور روتے ہوئے پوچھتا ہے)۔ کیوں اماں کیا ہوا؟

بڑھیا : چار غنڈے اور دو نقاب پوش کل رات میری جوان پوتی کو اٹھا کر لے گئے

ہیں۔

منا: (غصے سے) کون تھے وہ بدمعاش کمینے؟ میں ان کی کھال ادھیڑ دوں گا۔

بڑھیا: میں انہیں نہیں جانتی۔

منا: آپ مجھے ان ظالم درندوں کا حلیہ تو بتائیں۔ پھر دیکھیں میرا کمال۔

بڑھیا: بیٹا! انہوں نے اپنے چہرے کپڑوں سے ڈھانپ رکھے تھے۔

منا: کیا وہ خالی ہاتھ تھے؟

بڑھیا: نہیں ان میں سے دو کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

منا: پستول ولائتی تھے یا درے کے؟

بڑھیا: درے کے معلوم ہوتے تھے۔

منا: اس کا مطلب ہے' ملزم قبائلی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بال بڑے تھے یا چھوٹے؟

بڑھیا: ان کے بال عورتوں جیسے تھے۔

منا: سمجھ گیا۔ کپڑے کیسے پہنے ہوئے تھے؟

بڑھیا: پتلونیں صوفہ کلاتھ کی تھیں اور بشرٹیں پردہ کلاتھ کی۔

منا: شاباش! ان کا تعلق یقیناً بیبی خاندان سے ہے۔ وہ کون سی زبان بولتے تھے؟

بڑھیا: انگریزی اور اردو۔

منا: ویری گڈ۔ اس کا مطلب ہے وہ اینگلو پاکستانی تھے کوئی اور نشانی بتائیں۔

بڑھیا: اغوا سے پہلے ایک غنڈے نے میری پوتی نازلی کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی شکل مشہور ایکٹریس فردوس سے ملتی ہے۔

منا: ہوں! تو فلم لائن سے بھی ان کا کوئی نہ کوئی واسطہ ضرور ہے۔ دیکھو اماں! آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم آپ کی نازلی ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور ملزموں کو سخت سزا دلوائیں گے۔

(کلن داخل ہوتا ہے۔ منا' کلن کو تفصیل سے بڑھیا کی ساری روئداد غم سنا دیتا ہے۔ کلن بوڑھی عورت سے مخاطب ہوتا ہے)۔

کلن: (ہمدردانہ لہجہ میں) اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ہم بہت جلد ملزموں کا پتہ لگا کر آپ کی پوتی برآمد کر لیں گے۔

بڑھیا: اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا۔

کلن: لیکن اس کی فیس لگے گی۔

بڑھیا: کتنی فیس ہو گی بھلا؟

کلن: یہی ایک ہزار روپیہ۔

منا: کلن یہ بہت زیادتی ہے۔ بڑی اماں! آپ سے ہم صرف تین سو روپیہ فیس لے لیں گے۔

کلن: ارے دماغ خراب ہے تیرا۔ ہم تین سو میں کیسے یہ کام کر سکتے ہیں؟ اس سے کہیں زیادہ تو خرچ آ جائے گا۔

منا: کوئی بات نہیں کلن۔ اس نیک کام میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے گا۔

بڑھیا: اچھا بیٹا بہت مہربانی۔ میں نازلی کی بازیابی کے بعد تمہیں تین سو روپے دے دوں گی۔

کلن: لیکن فیس تو ہم پہلے وصول کرتے ہیں۔

بڑھیا: میں اس وقت نہیں دے سکتی کیونکہ نقد روپے اور زیورات تو بنک کے لاکر میں رکھے ہیں۔

کلن: تو وہاں سے نکلوا کے دے دو۔

بڑھیا: لاکر کی چابی نازلی کے پاس ہے۔

کلن: تو ہمیں چیک ہی دے دیں۔

بڑھیا: چیک پر دستخط بھی وہی کرتی ہے۔

منا: کوئی پرواہ نہیں۔ ہم بغیر فیس کے ہی تمہارا کام کریں گے۔ بڑی اماں۔ غم نہ کریں۔

کلن: اے حاتم طائی کی اولاد۔ ہم فیس لئے بغیر کیس کی تفتیش کیسے کر سکتے ہیں اور جو اس پر اخراجات اٹھیں گے وہ تمہارا باپ ادا کرے گا؟

بڑھیا: آپ میری معصوم نازلی کو ایک مرتبہ ان ظالموں کے پنجے سے چھڑا دیں۔ میں آپ کی رقم ضرور دے دوں گی۔

منا: کیا حرج ہے کلن۔ ہم نازلی کی بازیابی کے بعد تفتیش کر لیں گے۔ اماں' آپ جائیں۔ آپ کی نازلی جلد ہی گھر پہنچ جائے گی۔

(بڑھیا رخصت ہوتی ہے۔ چند روز بعد کلن اپنے دفتر میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہوتا ہے کہ یک دم وہ خوشی سے اچھل پڑتا ہے اور منے سے مخاطب ہوتا ہے)۔

کلن : ادھر آ منے۔ دیکھ اخبار میں کیا مزیدار خبر چھپی ہے۔

منا : (بڑے اشتیاق سے کرسی قریب کرتے ہوئے) کیا خبر ہے کلن؟

کلن : لکھا ہے کہ شہر کے متعدد رئیس اور اہل ثروت لوگوں کو کسی نامعلوم گروہ کی طرف سے ایسے دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں ایک ہفتہ کے اندر اندر مقررہ رقوم مختلف اوقات اور جگہوں پر ادا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مطلوبہ رقوم کی عدم ادائیگی کی صورت میں جان سے مار دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ پولیس اس معاملے میں سرگرم عمل ہے۔ ابھی تک مجرموں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ شہر میں ان دھمکی آمیز خطوط کی وجہ سے خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ امراء بہت پریشان ہیں۔

منا : کلن یہ تو بہت برا ہوا۔

کلن : بس ذرا انتظار کرو پیارے۔ پھر دیکھنا میرا کمال' دولت کے ڈھیر نہ لگا دوں تو میرا نام کلن نہیں۔

منا : (خوشی سے) وہ کیسے میں سمجھا نہیں۔

کلن : بھئی تمہاری موٹی کھوپڑی میں اتنی سی بات بھی نہیں آتی۔ معاملہ بالکل سیدھا سادا ہے۔ وہ لوگ جنہیں یہ دھمکی آمیز خطوط ملے ہیں' وہ پولیس کے علاوہ ہماری مدد بھی حاصل کرنا چاہیں گے' اس طرح ہم ان سے بھاری رقمیں وصول کر کے ان کی حفاظت کا بندوبست کریں گے۔

منا : (بے حد پریشان ہو کر توبہ کرو کلن توبہ۔ کیوں اپنی زندگی سے تو عاجز آیا ہوا ہے۔

کلن : تو فکر نہ کر منے۔ بس تیل دیکھ اور تیل کی دھار دیکھ۔

منا : دیکھ کلن' پہلے تیری بات مان کر جیل جانا پڑا تھا۔ اب تجھ پر بھروسہ کر کے اگلے جہان ہی جانا ہو گا۔

کلن : سمندری کچھوے۔ تو کبھی کالی زبان کو تالا بھی لگائے گا یا نہیں؟

منا : اچھا بابا۔ اچھا میں نہیں بولتا۔ تیرا جو جی چاہے کر۔

(اگلے روز ایک دراز قد پریشان حال رئیس دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کلن سے اجازت لے کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے)۔

رئیس : مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔

منا : (خوشی سے دیوانہ ہو کر) کیا آپ کو بھی دھمکی آمیز چٹھی ملی ہے؟

کلن : ہمیں آپ کی مدد کر کے یقیناً خوشی ہو گی۔ فرمائیے کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

رئیس : (ایک نیلا لفافہ کلن کی طرف بڑھاتے ہوئے)۔ مجھے یہ دھمکی آمیز چٹھی موصول ہوئی ہے۔ مجھ سے کچھ نامعلوم جرائم پیشہ لوگوں نے بیس ہزار روپے طلب کئے ہیں۔ رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں جان سے مار دینے کی دھمکی دی ہے۔

کلن : میں نے کل ہی اخبار میں پڑھا تھا کہ چند بدمعاشوں نے ایسے ذلیل خطوط لکھ کر عوام کا سکون برباد کر دیا ہے۔ کتنا ظلم ہے۔ بہرحال آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم آپ کی حفاظت کا پورا پورا اہتمام کر دیں گے۔

رئیس : مجھے اپنی حفاظت سے زیادہ ان سماج دشمن عناصر کو کیفر کردار تک پہنچانے کی فکر ہے۔

کلن : یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہم اس کا بھی جلد ہی بندوبست کر دیں گے۔

رئیس : آپ کتنے عرصہ سے سراغرسانی کا کام کر رہے ہیں؟

کلن : پچھلے سات برسوں سے۔ ویسے سراغرسانی کا شوق تو ہمیں بچپن سے ہے۔

منا : ہم سراغرسانی کی تمام فلمیں دیکھتے ہیں اور اس موضوع کے بیشتر انگلش اور امریکن رسالے بھی پڑھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے جتنا تجربہ شاید ہی کسی کو ہو۔

رئیس : کیا آپ نے حکومت سے سراغرسانی کا لائسنس بھی حاصل کیا ہوا ہے؟

کلن : کیوں نہیں صاحب۔ لائسنس حاصل کرنے کے بغیر ہم سراغرسانی کیسے کر سکتے ہیں۔

رئیس : کیا میں آپ کا لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟

کلن : بڑے شوق سے (اپنے میز کی دراز سے ایک فائل نکال کر اس میں حکومت سے حاصل کردہ لائسنس دکھاتا ہے)۔

رئیس : (لائسنس کو غور سے دیکھ کر) کیا آپ کے ادارے نے اس سے قبل بھی کسی خطرناک مجرم کا کھوج لگایا ہے؟

کلن : کوئی ایک ہو تو عرض کریں۔ سینکڑوں مجرموں کو ہم ان کے عبرت ناک انجام

تک پہنچا چکے ہیں- ہم نے سالہا سال کے مفرور اشتہاری ملزموں کو دور دراز علاقوں سے گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کیا ہے- کئی ایسے قاتلوں کو Trace کیا ہے جن کے مقدمات پولیس نے مایوس ہو کر داخل دفتر کر دیئے تھے اور پھر انہیں قانون کے حوالے کر کے تختہ دار تک پہنچایا ہے-

منا : ایک انتہائی خطرناک قاتل جو جنس تبدیل کر کے عورت بن گیا تھا ہم نے اسے بھی سات سال بعد ایک گمنام گاؤں سے گرفتار کیا تھا- اسے بھی پھانسی دے دی گئی تھی-

کلن : پچھلی جنگ کے دوران تو ہم نے تقریباً ایک سو تیس کے قریب بھارتی جاسوسوں کو اس وقت گرفتار کیا تھا' جب وہ تخریبی کاروائیوں پر عمل کرنے والے تھے-

منا : چار سفاک قاتل اور سات بھارتی جاسوس جو ہمیں دھوکا دے کر فرار ہونا چاہتے تھے' ہمارے ہاتھوں ملک عدم کو سدھار گئے تھے-

رئیس : بس بس مجھے یقین آ گیا ہے کہ آپ ماہر سراغرساں ہیں- آپ صرف اتنا بتا دیں کہ آپ حیدر آباد جیل سے کب رہا ہوئے تھے؟

(اس حیرت انگیز انکشاف پر کلن اور منا دونوں یکدم بوکھلا اٹھتے ہیں اور سکتے کی حالت میں اس اجنبی رئیس گاہک کو شناخت کرنے لگتے ہیں)-

منا : اوئی (پھر کلن کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں) یہ کوئی ہمارا بھیدی معلوم ہوتا ہے- نہ جانے ہمارے متعلق اور کیا کیا جانتا ہو-

کلن : (سخت گھبراہٹ کے عالم میں) معاف کرنا آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے-

رئیس : آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں مسٹر کلن- میں شمس الدین انسپکٹر پولیس سی- آئی- اے ہوں اور آپ جیسے بدمعاشوں اور جعلسازوں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہوں- اب تمہاری نوسربازی اور مکاری نہیں چلے گی- میں تم دونوں کو جعلسازی فریب دہی اور دھمکی آمیز خطوط لکھنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں-

(منا رونے لگتا ہے اور خوف سے کانپتے ہوئے انسپکٹر پولیس کے پاؤں پڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہتا ہے)-

منا : میں بے قصور ہوں خان صاحب- ایمان سے میں نے کلن کو ہمیشہ ایسا کرنے سے منع کیا ہے- مگر وہ مجھے بھی دھوکا دیتا رہا- خان صاحب خدا کے لئے مجھ پر رحم کھائیں- میں یتیم اور بے سہارا ہوں- جیل کی کوٹھڑی میں میرا انتقال ہو جائے گا- خدا کی قسم- ایک دفعہ

معاف کر دو- میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کلن سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا اور آپ کو بھی کبھی دوبارہ نظر نہیں آؤں گا-

(پھر روتے روتے منے کی گھگھی بندھ جاتی ہے)-

انسپکٹر رحم کھانے کی بجائے دونوں کو ہتھکڑی پہنا دیتا ہے- پچھلے کمرے کی تلاشی لینے پر نیلے لفافوں کا ایک بنڈل اور لیٹر فارموں کا پیڈ بھی برآمد ہو جاتا ہے- جن پر دھمکی آمیز خطوط لکھے گئے تھے- پھر ان دونوں کو لے جا کر انسپکٹر پولیس حوالات میں بند کر دیتا ہے-

○

اور ریل چلتی رہی

ایک سادہ لوح بزرگ لاہور ریلوے سٹیشن کے انکوائری آفس کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر بابو سے مؤدبانہ پوچھنے لگے:

"کراچی سے اگلی گاڑی کب آئے گی؟"

"تین بجے۔" بابو نے جواب دیا۔

"پشاور سے کتنے بجے پہنچے گی؟"

"چار بجے۔"

"کوئٹہ سے گاڑی آنے کا وقت کیا ہے؟"

"ساڑھے چار بجے۔"

"لائل پور سے گاڑی آنے کا ٹائم کیا ہے؟"

"پانچ بج کر بیس منٹ۔"

"نارووال سے کب آئے گی؟"

"چھ بج کر انتالیس منٹ پر۔"

"کوئی اور گاڑی اس دوران تو نہیں آ رہی؟"

"آدھ گھنٹے بعد ایک مال گاڑی آ رہی ہے۔"

اتنی معلومات حاصل کر کے وہ بزرگ کھڑکی چھوڑ کر جانے لگے تو ریلوے بابو نے سوال کیا--- "کیا آپ کے ہاں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہے جو ہر طرف سے مہمان آنے والے ہیں؟"

"نہیں جناب۔" وہ بزرگ حیرت سے بولے--- "میں نے ریلوے لائن کے اس پار پیشاب کرنے جانا ہے۔"

اس بزرگ نے حفظ ماتقدم کے طور پر ریل گاڑیوں کے اوقات تو اس لئے پوچھ لئے

تھے کہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاڑیوں کی آمدورفت کا کوئی وقت مہمان اور موت کی طرح متعین نہیں ہوتا اور نہ کسی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ گاڑی کا صحیح وقت بتا سکے۔ گاڑی صرف اس وقت آتی ہے جب اس کا دل چاہے۔ اس معاملے میں ہم سب بے بس ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ گاڑی کے دیر سے آنے کی کوئی معقول وجہ بھی ہو اور ریلوے حکام یہ بتانے کے پابند بھی ہرگز نہیں ہوتے کہ گاڑی لیٹ کیوں آ رہی ہے۔ وہ بیچارے بتائیں بھی کیسے؟ ان کا کنٹرول سسٹم ہمیشہ ان کے کنٹرول سے باہر ہوتا ہے۔ کنٹرول سسٹم کی خرابی ان کے بس کا روگ کہاں ہے۔ یہ تو اللہ کے کام ہیں اور خدائی کاموں میں کوئی دخل کیسے دے سکتا ہے۔

سنا ہے جاپان اور یورپ میں ریل گاڑیوں کی تعداد اور رفتار کئی گنا زیادہ ہونے کے باوجود گاڑیاں لیٹ نہیں ہوتیں اور مسافر' گاڑی آنے پر اپنی گھڑیوں کا وقت صحیح کرتے ہیں۔ یہ تو خوبی سے زیادہ ان کی مجبوری ہے کیونکہ اتنی زیادہ تعداد میں گاڑیاں چلا کر اگر وہ لیٹ ہونے لگیں تو ان کا تمام نظام درہم برہم ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو چند گاڑیاں چلتی ہیں۔ وہ اگر لیٹ بھی ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی دفعہ گاڑیاں وقت سے پہلے بھی تو آ جاتی ہیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے' مجھے پشاور جانا تھا۔ ریل گاڑی مقررہ وقت سے پون گھنٹہ پہلے آ گئی۔ میں جلدی سے ٹکٹ خرید کر گاڑی میں بیٹھنے کے لئے دوڑا مگر گاڑی چل دی اور میں سوار نہ ہو سکا۔ میں نے سٹیشن ماسٹر صاحب سے شکایت کی تو انہوں نے انکساری سے جواب دیا--- "آپ قطعاً" پریشان نہ ہوں یہ کل والی ٹرین تھی۔ آج والی خدا جانے کب آئے گی۔"

اسی طرح کسی معروف سٹیشن پر ایک دن ایک ہی نام کی دو گاڑیاں یکے بعد دیگرے مختلف پلیٹ فارموں پر آ رکیں۔ سٹیشن ماسٹر سخت بوکھلاہٹ کے عالم میں اپنی الجھن دور کرنے کی غرض سے پہلے انجن ڈرائیوروں اور پھر متعلقہ گارڈوں سے دریافت کرنے لگا' مگر انہوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا' کیونکہ انہوں نے راستے میں ڈیوٹی سنبھالی تھی۔ پھر سواریوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ پہلے آنے والی ٹرین پچھلے روز پہنچی تھی' مگر ہر سٹیشن پر بلا وجہ لیٹ ہوتی رہی۔ دوسری گاڑی میں چونکہ ایک مرکزی وزیر سفر کر رہے تھے اس لئے وہ قبل از وقت ہی آ گئی۔

گزشتہ برس میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس کراچی جانے کا قصد کیا۔ اس غرض سے میں گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن گیا اور ٹکٹ خرید کر انکوائری آفس چلا گیا تاکہ معلوم کر سکوں کہ گاڑی کتنی لیٹ ہے۔ پتہ چلا کہ سلسلہ مواصلات خراب ہے اس لئے کوئی صحیح اطلاع نہیں دی جا سکتی۔ ناچار پلیٹ فارم پر آ کر انتظار کرنے لگا۔ کوئی پچیس منٹ بعد سگنل ڈاؤن ہوا۔ قلی سامان اٹھا کر اپنے اپنے مسافروں کو بٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب گاڑی سٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو سبھی مایوس ہوئے کیونکہ وہ مال گاڑی نکلی۔ تمام لوگ خفت محسوس کرتے ہوئے پھر محو انتظار ہو گئے۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد دوبارہ سگنل ڈاؤن ہوا۔ اس دفعہ پھر نہایت جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسافر بھاگنے لگے مگر شومئی قسمت خالی انجن ہی دکھائی دیا۔ تیسری دفعہ ریلوے کا ایک چھوٹا افسر لائن چیک کرتے ہوئے تھیلے پر بیٹھ کر مسافروں کا منہ چڑاتے ہوئے گزر گیا۔ چوتھی بار سگنل ڈاؤن ہوا تو ہمارے دل کی حرکت بھی ڈاؤن ہونے لگی۔ اس مرتبہ خدا معلوم کیا چیز گزرنے والی تھی۔ مسافروں کے چہروں پر بیم و یاس طاری تھی۔ یہ پریشانی جلد ہی دور ہو گئی۔ ہماری محبوبہ میل ٹرین کی بجائے ایک پسنجر گاڑی سٹیشن پر آ رکی۔ اس وقت مسافروں کا اضطراب قابل دید تھا۔ اور وہ ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے کترا رہے تھے۔ بارہ منٹ بعد پسنجر گاڑی کی روانگی ہوئی اور اس کے کوئی چالیس منٹ بعد ہماری مطلوبہ ٹرین کی جھلک دکھائی دی۔ ہمیں حسین سپنے کا گمان ہو رہا تھا۔ پھر قلی نے خبردار کیا تو گاڑی میں سوار ہوئے۔

یہ ضروری نہیں کہ گاڑی لمبی مسافت طے کرتے ہوئے لیٹ ہوتی ہے۔ یہ تو اکثر سفر کا آغاز کرتے وقت بھی لیٹ ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ عملے کی بے پناہ مصروفیت ہوتی ہے۔ ان بیچاروں کو سینکڑوں کام ہوتے ہیں۔ وہ کس کس طرف توجہ دیں کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ الیکٹریشن کے بروقت نہ ملنے کے سبب تمام ریل گاڑی کی بتیاں گل رہتی ہیں اور ٹرین بلیک آؤٹ کی مشق کرتے ہوئے ہی سارا سفر مکمل کر لیتی ہے۔ ان حالات میں کئی لوگوں سے بدحواسی میں ایسی ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جن کے نتیجے میں انہیں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ ہمارے ایک سیدھے سادے پڑوسی راولپنڈی جانا چاہتے تھے۔ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جب ٹرین ایمن آباد سے گزر رہی تھی تو سامنے بیٹھے ہوئے ایک معمر شخص سے پوچھنے لگے:

"میاں جی آپ کہاں جائیں گے؟"

"لاہور جا رہا ہوں۔"

"مگر یہ گاڑی تو راولپنڈی جا رہی ہے۔"

"جی ہاں۔" ہمارے پڑوسی نے اطمینان سے جواب دیا۔۔۔۔ "کراچی پہنچ کر یقیناً واپس راولپنڈی ہی جائے گی۔"

ہمارے ملک میں ریل گاڑیوں کی تعداد معدودے چند ہونے کے باعث ان میں اکثر بہت زیادہ ہجوم رہتا ہے اور گاڑی میں سوار ہونا انتہائی کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اکثر اوقات بیٹھنے کی جگہ نہ ملنے پر سارا سفر ہی کھڑے کھڑے کاٹنا پڑتا ہے۔ منزل مقصود پر اترنے والے بیشتر مسافر اپنا سامان کھڑکیوں کے راستے باہر پھینک کر خود دوسرے مسافروں کو زد و کوب کرتے ہوئے گاڑی سے اترتے ہیں ورنہ ہجوم میں پھنسے ہوئے نہ جانے کہاں جا پہنچیں۔ بعض لوگ اپنی جگہ محفوظ رکھنے کے لئے نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں اور مسافر انہیں جگہ کے لئے پریشان نہیں کر سکتے۔ ریل گاڑی میں نماز تسبیح پسندی میں بہت مدد دیتی ہے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے والے مسافر جب ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہیں تو ان پر اس قدر خوف طاری ہو جاتا ہے کہ نماز کی نیت باندھ لیتے اور اگلا سٹیشن آنے اور ٹکٹ چیکر کے اتر جانے تک خشوع و خضوع سے رکوع و سجود میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسرے لوگ جنہیں معقول نشست بیٹھنے کو مل جاتی ہے وہ کھڑے ہوئے مسافروں سے نظریں ہی نہیں ملاتے اور کھڑکی سے باہر کا نظاہرہ بڑی بے نیازی سے کرتے رہتے ہیں۔ کئی مسافر جگہ تلاش کرتے کرتے مختلف محکموں کی ریزرو بوگیوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور منت سماجت کے علاوہ چند روپے تھما کر بیٹھنے کا سہارا بنا لیتے ہیں۔

اسی قسم کی بھیڑ میں دو سکھ نوجوان لوگوں کو دھکیلتے ہوئے بڑی جدوجہد کے بعد چلتی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ بہت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہم سفر نے ازراہ ہمدردی ان سے پوچھ لیا:

"کیا آپ کا کوئی سامان پیچھے رہ گیا ہے؟ آپ بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں۔"

ان میں سے ایک نے جواب دیا۔۔۔۔ "نہیں۔ ہم تو اپنے رشتہ داروں کو چڑھانے آئے تھے۔ وہ سوار نہیں ہو سکے۔"

تقسیم ملک سے پہلے لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان ریلوے سپیشل رمانق [illegible]

(واپسی) ٹکٹ جاری کرتی تھی- ایک سکھ سردار گاڑی میں سفر کر رہا تھا کہ چیکر آ گیا- اس نے تمام مسافروں کی ٹکٹیں چیک کرنی شروع کر دیں- وہ سکھ مسافر ادھر ادھر ہونے لگا تو ایک شخص نے اس سے پوچھا:

"کیوں سردار جی- آپ بغیر ٹکٹ کے ہیں؟"

"نہیں مہاراج-" سکھ نے جواب دیا---- "میں نے دراصل رعایتی ریٹرن ٹکٹ خریدا تھا- مگر میرا ارادہ واپس آنے کا نہیں ہے- یہ لوگ واپسی پر مجھے تلاش ہی کرتے رہیں گے- اس لئے ان کے سامنے نہیں آنا چاہتا-"

بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے لوگ کئی قسم کے ہوتے ہیں- ان میں سکول اور کالج کی سپورٹس ٹیمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو میچ وغیرہ کھیلنے باہر جاتی ہیں تو زیادہ تر بغیر ٹکٹ ہی سفر کرتی ہیں- اگر وہ پکڑی بھی جائیں تو کوئی نہ کوئی چکر چلا کر بچ نکلتی ہیں یا پھر معمولی جرمانہ ادا کر کے گلو خلاصی کروا لیتی ہیں-

ایک دفعہ ملک کے نامور کرکٹر جناب ڈاکٹر دلاور حسین مرحوم کرکٹ ٹیم لے کر بطور منیجر ہندوستان گئے- انہوں نے امرتسر جا کر ایک کھلاڑی کو دلی کے چند ٹکٹ خریدنے کو بھیج دیا- کھلاڑی کو شرارت سوجھی- اس نے صرف ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کا ٹکٹ خرید کر انہیں دے دیا- بقایا رقم اس نے ٹیم کے کپتان کے حوالے کر دی- جب ٹیم دلی ریلوے سٹیشن پر اتری تو چیکروں کی ایک اسپیشل جماعت نے انہیں پکڑ لیا- ڈاکٹر صاحب کو جب اصل حالات کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے- آخر خاصی بحث و تمحیص کے بعد جرمانہ ادا کر کے چھٹکارا حاصل کیا گیا- جب ڈاکٹر صاحب واپس آئے تو ٹیم کے کپتان نے پوچھا-

"کہئے ڈاکٹر صاحب کیا فیصلہ ہوا؟"

"بھئی پچاس روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا-"

"ڈاکٹر صاحب- کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ دس روپے کی آفر دے کر شروع کرتے تو اس طرح بیس روپے پر سودا ہو جاتا-" ڈاکٹر صاحب حیرانگی کے عالم میں بولے- "کیا بات کرتے ہو یار- میں تو معافی سے چلا تھا-"

میں اپنے ایک عزیز دوست کے ہمراہ 1957ء میں بذریعہ ریل دلی گیا- ہم امرتسر سے جنتا میل میں سوار ہوئے- سفر بہت اچھا کٹا- دلی ریلوے سٹیشن پر اترے تو پلیٹ فارم پر ایک

ہنگامہ بپا ہو گیا- ہم نے دیکھا کہ ایک انگریز مسافر ٹرین کے سکھ گارڈ کو بے تحاشہ گالیاں دے رہا تھا' گارڈ بڑی تحمل مزاجی سے گالیاں برداشت کر رہا تھا- ہم نے انگریز مسافر سے مغلظ خرافات بکنے کی وجہ پوچھی تو وہ بتانے لگا:

"اس کمینے گارڈ کو میں نے چلتے وقت تاکید کی تھی کہ مجھے راستے میں فلاں سٹیشن پر جگا کر اتار دینا- اس نے مجھے وہاں نہیں اتارا- اب میں بہت آگے نکل آیا ہوں-"

ہم نے سکھ گارڈ سے پوچھا کہ سردار جی یہ انگریز تمہیں اتنی گالیاں بک رہا ہے اور تم بالکل خاموش ہو- اس پر سکھ گارڈ کہنے لگا---- "مہاراج اس سالے نے کیا گالیاں دینی ہیں- گالیاں تو اس کی سننے والی ہوں گی جسے میں اس کی جگہ راستے میں اتار آیا ہوں-"

میرے ایک زندہ دل ہم جماعت ایک دن لاہور سے گوجرانوالہ مجھے خاص طور پر ملنے آئے- میں نے ممنونیت کے لہجے میں پوچھا---- "کیسے تشریف لائے؟" فرمانے لگے---- "ایک سو گیارہ میں آیا ہوں"____ میں سمجھا کسی بس یا لاری کا نمبر بتا رہے ہیں- مزید استفسار کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ریلوے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کر کے آئے ہیں- ان کا ماتھا متورم دیکھ کر میں نے پوچھا کہ یہ چوٹ کیسے آئی تو انہوں نے بتایا کہ رش زیادہ تھا- اترتے وقت ایک مسافر کے ٹرنک کا کونہ لگ گیا تھا- مثل مشہور ہے- "ایک ایک اور دو گیارہ-" اس میں یاران طریقت نے "تین ایک سو گیارہ" کا اضافہ کر لیا ہے اگر تین کا ہندسہ رومن انگلش میں لکھا جائے تو ایک سو گیارہ ہی پڑھا جاتا ہے- وہ دوست بھی سچے ہیں کیونکہ اگر یہ درجہ بندی ریلوے کے عالمی معیار پر مقرر کی جائے تو ہمارے تیسرے درجے کو یقیناً ایک سو گیارہ نمبر ہی ملے گا- ویسے بھی ہمارے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جہاں صرف چالیس مسافروں کی گنجائش ہوتی ہے وہاں ایک سو گیارہ خوش نصیب سفر کرتے ہیں- اس وجہ سے بھی ایک سو گیارہ پر یقین کرنا پڑتا ہے-

پلیٹ فارموں پر آپ کو جس قدر ناقص اور گھٹیا غذا ملے گی کوئی شریف آدمی کھانا پسند نہیں کرتا- "آپ کو گرم پکوڑے" کی بلند صدائیں سنائی دیں گی- اگر پکوڑوں کو ہاتھ لگائیں تو برف کی مانند یخ ہوں گے- اگر شکایت کریں تو جواب ملے گا- "تاثیر گرم ہے-" ٹھنڈا مشروب پی کر آپ کو دنیا گھومتی نظر آئے گی- آپ کو کسی رشتہ دار کے ہاں جانا ہو- اس نے بچوں کے لئے ازراہ شفقت پلیٹ فارم سے پھل خریدنے کی غلطی کر لی تو پھر اطمینان

رکھیں آپ کا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور آپ وہاں دوبارہ جانے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ حلوہ پوڑی کھالیں تو ایسا محسوس ہو گا جیسے پیٹ میں لبنتس ڈال دیا ہو۔ کباب اور پراٹھے کھا کر مسافر اڑنے لگتا ہے۔ مٹھائی اور کنفیکشنری کا تو جواب نہیں۔ یہ دیہاتی میلوں میں بکنے والی اشیائے خوردنی کو مات کرتی ہیں۔

دوسرے ملکوں میں کونٹر کے علاوہ خود کار مشینوں سے بھی ٹکٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ یہ مشینیں ٹکٹ کے علاوہ بقایا رقم بھی لوٹاتی ہیں۔ ہم یہاں کھڑکی پر کھڑے ہو کر بابو سے ٹکٹ وصول کریں اور بقایا رقم اگر وہاں ہی نہ گنیں تو پھر کوئی بھی شخص ہمارا کلیم تسلیم نہیں کرے گا۔ سادہ لوح اور ان پڑھ مسافروں کو بعض چالاک بابو دور کی بجائے قریبی ریلوے سٹیشن کا ٹکٹ دے دیتے ہیں اور وہ سفر کے دوران چیکروں کی مشق ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔

دس روز پیشتر آپ کراچی' راولپنڈی یا پشاور کے لئے اپنی نشست ریزرو کروانا چاہیں تو بغیر رجسٹر دیکھے ہی آپ کو کورا جواب مل جائے گا۔ کوئی واقفیت یا پیسے کی بات ہو تو گاڑی چلنے سے چند منٹ پہلے بھی آپ کی سیٹ ریزرو ہو جائے گی۔ اگر گارڈ یا چیکر سے تعلقات ہوں تو پھر ٹکٹ اور ریزویشن دونوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بیزار زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ریلوے لائن کا استعمال ہمیشہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ یہ خودکشی کا نہایت ہی آسان اور یقینی نسخہ ہے۔ دکھ بھری زندگی سے نجات حاصل کرنے والے اس کوشش میں کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ایک پٹھان اسی طرح ریلوے لائن پر لیٹا تھا۔ اس سے ایک راہ گیر نے دریافت کیا:

"خان! ریلوے لائن پر کیوں لیٹے ہو؟"

"ہم خودکشی کرے گا۔" پٹھان نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ روٹی کا ڈبہ کیوں ساتھ رکھا ہے؟" راہ گیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

پٹھان بولا---- "اگر گاڑی لیٹ ہو گیا تو تمہارا باپ ہم کو کھانا کھلائے گا۔"

ریلوے کے متعلق اکثر چٹکلے مشہور ہیں۔ مثلاً گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ایک ڈبے میں دو بہت موٹے آدمی بیٹھے تھے۔ ایک آدمی نے قریب سے گزرتے ہوئے ان سے پوچھا---- "کیا یہ کمپارٹمنٹ ہاتھیوں کے لئے ریزرو ہے؟" اس پر ایک موٹا آدمی کہنے لگا---- "نہیں جناب کتے بلیاں بھی بیٹھ سکتی ہیں۔"

گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن کے دونوں اطراف ریلوے کراسنگ ہیں جو گاڑی آنے سے کم از کم پندرہ منٹ پہلے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے عوام کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں گوجرانوالہ کے عوام نے ریلوے حکام سے سخت احتجاج کیا تھا کہ یہ پھاٹک صرف مسافر گاڑیوں کے لئے ہی بند کئے جائیں۔ مال گاڑیاں یا خالی انجن گزارنے کے لئے عوام کی تکلیف کے پیش نظر انہیں کھلا ہی رہنا دیا جائے۔

ایک روز میں ٹانگے میں بیٹھ کر کچہری سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں پھاٹک بند ملا۔ خاصے انتظار کے بعد ایک مال گاڑی گزر گئی۔ ٹانگے والا کہنے لگا---- "باؤ جی! جب کسی مسافر گاڑی کا ٹائم نہیں ہوتا تو ریلوے والے عوام کو تنگ کرنے کی غرض سے مالی گاڑی چھوڑ دیتے ہیں۔"

مشرقی پنجاب کی حکومت نے چند برس پہلے سکھوں کے دیرینہ مطالبے پر ہمدردانہ غور کرتے ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ چونکہ ٹرین کے آخری ڈبے میں زیادہ دھچکے لگتے ہیں اس لئے آئندہ آخری ڈبہ نہیں لگایا جائے گا۔

ایک سکھ فسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں اتفاق سے بیٹھ گیا۔ وہ باتھ روم میں گیا اور جھک کر فلش استعمال کرنے لگا اس کا بٹوہ کموڈ میں گر گیا۔ وہ گھبرایا ہوا باہر آیا اور اپنے ساتھی مسافر کو بٹوے کی گمشدگی کے متعلق بتانے لگا۔ ساتھی نے پوچھا---- "بٹوے میں کتنی رقم تھی؟" سکھ نے بتایا---- "دو ہزار روپے"____ ساتھی نے کہا---- "گاڑی روکنے کے لئے تم نے زنجیر کیوں نہیں کھینچی؟" سکھ نے جواب دیا---- "زنجیر تو کئی مرتبہ کھینچی تھی مگر ہر بار پانی ہی نکلتا رہا۔ گاڑی نہیں رکی۔"

آپ کو ہر بڑے ریلوے سٹیشن پر باوردی قلیوں کی فوج ظفر موج نظر آئے گی جن کی اجرت فی پھیرا مقرر ہے۔ اگر آپ نے اچھا لباس نہیں پہن رکھا تو قلی آپ کے پاس نہیں پھٹکیں گے؟ کیونکہ وہ مقرر کردہ اجرت وصول کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ اگر آپ نے سوٹ وغیرہ پہنا ہو گا تو انہیں کئی گنا اجرت ملنے کی توقع ہو گی۔ اس لئے وہ آپ کے سامان پر جھپٹیں گے اور آپ کے لئے مشکل ہو جائے گی کہ کس قلی کو سامان اٹھانے کی اجازت دیں۔

اگر بدقسمتی سے آپ نے ریلوے کے ذریعے مال بک کروایا ہے تو پھر بھول جائیں ا

منزل مقصود پر کب پہنچتا ہے- کھانے پینے کی اشیاء عموماً راستے میں ہی گل سڑ جاتی ہیں- پوری ریلوے ویگن بک کروانی مطلوب ہو تو آپ کو بے حد دقت کا سامنا کرنا پڑے گا- کیونکہ ویگنوں کی سخت قلت بیان کی جائے گی- آپ کو پندرہ بیس روز تک صبر کرنے کی تلقین ہو گی اگر مال فوری بھجوانا ہو تو مقررہ نرخ کے مطابق بابو کے ہاتھ میں پیسے تھما دیں پھر کوئی مسئلہ نہیں- جتنی بوگیاں درکار ہوں' مل جائیں گی- بابو سے بالا بالا کسی بڑے افسر کی مداخلت کے سبب اگر آپ نے کوئی بوگی بک کروانے کی غلطی کر لی تو وہ سفر کے آغاز سے چند منٹ پہلے ریلوے مکینک کے اعتراض پر خطرناک نقائص کی بنا پر ٹرین سے علیحدہ کر کے یارڈ میں کھڑی کر دی جائے گی اور پھر اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہو گا- راستے میں سامان کم یا گم ہونے کی بھی ریلوے ہرگز ذمہ دار نہ ہو گی-

ہمارے ہاں کی پسنجر ٹرینیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں- ان کی اوسط رفتار دس سے پندرہ میل فی گھنٹہ ہے- ہر سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوتی ہے بلکہ اکثر سٹیشنوں پر دو دفعہ رکتی ہے- ایک دفعہ تو سگنل کے باہر' کیوں کہ ڈاؤن نہیں ہوتا اور دوسری دفعہ پلیٹ فارم پر- بڑے سٹیشن پر رکنے کے بعد تو یہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتی اور گھنٹوں اس انتظار میں رہتی ہے کہ مسافر تنگ آ کر کہیں بھاگ جائیں اور اسے دو گھڑی آرام نصیب ہو- لوپ لائنوں پر چلنے والی گاڑیوں کا حال تو تپسق کے اس لاعلاج مریض جیسا ہوتا ہے جسے دنیا کی کسی بات سے دلچسپی نہیں ہوتی- ان گاڑیوں میں صرف وہی لوگ سفر کرتے ہیں جنہیں کوئی اور سواری میسر نہیں-

لاہور اور سیالکوٹ کے درمیان ایک بابو ٹرین چلتی ہے جس میں گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے اضلاع سے تعلق رکھنے والے ریلوے ملازمین زیادہ تر سفر کرتے ہیں- انہی کے نام پر اس کو بابو ٹرین کہا جاتا ہے- یہ بابو سالہا سال سے ہر روز روٹی کا ڈبہ اٹھائے ریلوے دفاتر میں جاتے ہیں' اور دفتر سے چھٹی کے بعد اسی گاڑی کے ذریعہ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں- یہ بابو جب علی الصبح گھر سے نکلتے ہیں تو ان کے بچے ابھی سو رہے ہوتے ہیں اور جب شام ڈھلے واپس گھر آتے ہیں تو بچے سو چکے ہوتے ہیں- انہی بابو لوگوں کے بچے اپنی ماؤں سے پوچھتے ہیں کہ اتوار کو آنے والا آدمی کون ہے؟

بابو ٹرین میں اگر آپ کو سفر کرنے کا موقع ملے تو آپ بے حد محظوظ ہوں گے- ایک

ڈبے میں باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد مذہبی مسائل پر گفتگو شروع ہو جائے گی- دوسرے کمپارٹمنٹ میں شطرنج یا تاش کی بازی چل رہی ہو گی- کھیلنے والوں کے حمایتی بڑی محویت سے اگلی چال کے متعلق صلاح مشورے دے رہے ہوں گے- تیسرے کمرے میں بابو لطیفہ گوئی میں مصروف ہوں گے- اور ایک دوسرے کے متعلق فی البدیہہ فقرے چست کریں گے- چوتھے میں راگ رنگ کی دلچسپ محفل جمی ہو گی- ایک بابو گا رہا ہے اور کئی بابو اپنے اپنے روٹی کے ڈبے گھٹنوں پر رکھ کر بجا رہے ہوں گے- پانچویں ڈبے میں ملکی سیاست اور گرانی پر گرما گرم بحث چلتی رہے گی- چھٹی بوگی میں چند سوشلسٹ ذہن کے بابو حکومت' افسروں اور امیروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہوں گے- ساتویں کمرے میں جو لوگ بیٹھے ہوں گے وہ دوسرے ڈبوں کے مکین لوگوں پر تنقید کرتے ہوں گے-

گوجرانوالہ کے ایک بزرگ بابو جو ریٹائر ہونے والے تھے' ہمیشہ گاڑی کے آخری ڈبے میں سفر کرتے تھے- ایک روز وہ حسب عادت دفتر سے چھٹی کر کے ریلوے سٹیشن پہنچے اور بابو ٹرین کے آخری ڈبے میں بیٹھ کر گاڑی چلنے کا انتظار کرنے لگے- سخت سردی کی وجہ سے انہوں نے کھڑکیوں اور دروازوں کو اچھی طرح سے بند کر رکھا تھا- جب وقت روانگی سے بیس منٹ بعد تک گاڑی نہ چلی تو وہ بزرگ بابو گاڑی نہ چلنے کا سبب معلوم کرنے کی نیت سے ڈبے سے اتر کر باہر آئے تو یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ گاڑی ان کا ڈبہ چھوڑ کر کب کی جا چکی تھی- اگلی گاڑی کی روانگی میں ابھی دو گھنٹے تھے- انہوں نے سوچا کہ شدید سردی میں لاہور سٹیشن پر انتظار کرنے کی بجائے شاہدرہ جنکشن چلا جائے جہاں کا اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر ان کا دوست ہے' وہاں سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر گوجرانوالہ چلے جائیں گے- اس پروگرام پر عمل کرتے ہوئے وہ لاہور سے لائل پور جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے- کھڑکیاں دروازے بند ہونے کی وجہ سے وہ ڈبہ گرم تھا پھر چلتی گاڑی کے ہلکے ہلکے ہچکولوں سے انہیں نیند آ گئی اور شاہدرہ اترنے کی بجائے بہت آگے نکل گئے- جب گاڑی چک جھمرہ سٹیشن پر رکی تو وہ گہری نیند سے بیدار ہوئے- پھر سخت گھبراہٹ میں وہاں ہی اتر گئے- چک جھمرہ سے انہوں نے ایک اور گاڑی گیارہ بجے رات پکڑی اور ساڑھے بارہ بجے پھر شاہدرہ آ گئے- شاہدرہ سے ایک مال گاڑی کے گارڈ کے ساتھ بیٹھ کر وہ صبح چار بجے گوجرانوالہ سٹیشن پر اترے وہاں سے سیدھا گھر جا کر اپنی بیوی کو کہنے لگے کہ جلدی سے

روٹی بنا دو' مجھے دفتر جانا ہے- اس واقعہ کے بعد وہ بزرگ کبھی آخری ڈبے میں سوار نہیں ہوئے-

ملک تقسیم ہوا- آزادی ملی- حکومتیں بدلیں- ریلوے کے افسران اور عملہ کے افراد ریٹائر ہوئے- ان کی جگہ نئے لوگوں نے لے لی- بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں نے اپنی تعداد میں بھی اور فنکاری میں بہت ترقی کر لی- جنگ اور سیلاب کی وسیع تباہ کاریوں نے ریلوے کو کاری ضربات لگائیں- لاتعداد مہلک حادثات پیش آئے- طلباء اور سیاسی تنظیموں کے کارکنوں نے بے شمار دفعہ پتھراؤ کئے- عملے کے بیشتر بددیانت افسروں نے سالہا سال ریلوے کو لوٹ لوٹ کر اپنی عالیشان کوٹھیاں تعمیر کیں- مختلف سٹوروں میں دن رات چوریاں ہوتی رہیں- افسروں اور اہل کاروں نے کام کرنا چھوڑ دیا- ناقص غیر معیاری اور استعمال شدہ بوگیاں' انجن اور سٹورز کی خرید و فروخت عمل میں آتی رہی مگر ریل چلتی رہی اور آئندہ بھی زمانے کے نشیب و فراز اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے- ریل چلتی رہے گی-

○

ساری رانگ نمبر

جن لوگوں کے دفتر یا گھر میں بدقسمتی سے ٹیلیفون لگا ہوا ہے' انہیں ان جادو بھرے سنہری الفاظ سے روزانہ کئی مرتبہ واسطہ پڑتا ہے- بعض حرماں نصیب تو سارا دن "سوری رانگ نمبر" کی گردان ہی کرتے رہتے ہیں- محکمہ ٹیلیفون بھی ان پر خاص طور پر مہربان ہوتا ہے- ایک دو مرتبہ تو معمولی بات ہے' صحیح نمبر ملانے کے لئے کئی دفعہ ڈائیل کرنا پڑتا ہے لیکن جب مہینے کے بعد ٹیلیفون کا بل آتا ہے تو تمام رانگ نمبروں کا جرمانہ بھی اس بل میں شامل ہوتا ہے- یہ ان مغلظ گالیوں کے علاوہ ہوتا ہے جو شرفاء کو تنگ کرنے کے عوض پڑتی ہیں- ٹیلیفون گوناگوں دلچسپیوں کا حامل ہے- مثلاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی- ریسیور اٹھایا تو آواز آئی---- "آپ 2222 سے بول رہے ہیں؟"

"سوری رانگ نمبر-" Sorry Wrong Number

ایک صاحبہ کا فون آیا- پوچھنے لگیں---- "آپ 4310 سے بول رہے ہیں؟"

"نہیں محترمہ' یہ 4311 ہے-"

"پھر ذرا تکلیف کریں- اپنے پڑوسیوں میں سے کسی کو بلا دیں-"

ایک روز ڈاکٹر کو فون کیا اور پوچھا ڈاکٹر صاحب ہیں؟ جواب ملا---- "معاف کرنا ہم سبزی منڈی سے بول رہے ہیں-" پھر سوری رانگ نمبر کہہ کر جان چھڑائی-

آپ اپنے بچے کے سکول میں فون کرتے ہیں مگر نمبر شفاخانہ حیوانات سے جا ملتا ہے---- سول لائن میں ایک عزیز سے بات کرنا چاہی تو بارہا پولیس لائن ہی ملتی رہی- ایک دن اپنی بیگم کو اس کی خالہ کی وفات کی اطلاع دینے کے لئے گھر ٹیلیفون کیا تو ایک اجنبی نسوانی آواز سنائی دی- ہم نے اپنی بیگم کے متعلق استفسار کیا تو جواب میں "سوری رانگ نمبر" سنائی دیا اور فون بند ہو گیا- دوبارہ کوشش کی تو وہی محترمہ بولیں- اس دفعہ ان کی آواز میں خاصی خفگی تھی- پھر "سوری رانگ نمبر" کہتے ہوئے غصے سے ٹیلیفون کا ریسیور پٹخ دیا- تیسری مرتبہ جو ڈائیل کیا تو کافی دیر کے بعد وہی تلخ آواز میرے کانوں میں گونجی- میں نے

معذرت کرنا چاہی تو اس معزز خاتون نے بے نقط سنانی شروع کر دیں---- "تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے؟ کمینے ذلیل" وغیرہ- میں نے انتہائی صبر کے ساتھ تمام خرافات سنیں- پھر جب اس نے سانس لینے کے لئے گفتگو ایک لمحہ کے لئے بند کی تو میں نے نہایت انکساری سے عرض کیا---- "اے محترم خاتون- میں ایک عزت دار آدمی ہوں- اپنی بیگم کو اس کی اکلوتی خالہ کے انتقال پرملال کی خبر سنانا تھی مگر محکمہ ٹیلیفون کی ستم ظریفی کی بدولت آپ سے گالیاں بھی کھائیں' بے عزت بھی ہوا' مگر اپنی بیگم کو یہ منحوس خبر نہ سنا سکا- آپ بے شک اور گالیاں دے لیں لیکن خدا کے لئے ذرا میری بیوی کو فلاں نمبر پر فون کر کے یہ اطلاع دے دیں- میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں گا-" یہ سن کر وہ محترمہ پسیج گئیں اور پھر معذرت کرتے ہوئے میری بیگم کو مطلع کرنے کی حامی بھرلی-

تھوڑی دیر بعد میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی- تو ہماری بیگم انتہائی غصیلی آواز میں بولیں---- "میں پوچھتی ہوں وہ گشتی کون تھی جس کے ذریعہ اب پیغام بازی ہو رہی ہے؟ میری خالہ فوت ہو گئی تھی- مگر تمہاری زبان تو سلامت تھی- اس حرافہ کو کیوں زحمت دی؟"

میں یہ سن کر سکتے میں آگیا- اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ اس نیک سیرت عورت نے تو مجھ پر احسان کر کے میری مشکل آسان کی تھی اور بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے کے ہماری بیگم نے اسے بھی ضرور کچھ نہ کچھ کہہ ڈالا ہو گا- آخر ہم نے گھر جا کر بڑی مشکلوں کے بعد بیگم کو اصل صورت حال سے آگاہ کر کے اس کی غلط فہمی دور کی-

ایک روز ہمارے ایک دوست کی دوکان میں اچانک آگ لگ گئی- فوراً" فائر بریگیڈ سٹیشن ٹیلیفون کیا اور آگ بجھانے کی درخواست کی- جواب ملا---- "اگر ناراض نہ ہوں تو دوبارہ فون کریں کیونکہ یہ پٹرول پمپ ہے- یہاں آگ بجھانے کا نہیں' آگ لگانے کا بندوبست ہے-"

کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نمبر ملانے کے لئے ریسیور اٹھایا اور پہلا نمبر گھمایا تو ٹیلیفون پر لوگوں کی گفتگو سنائی دینے لگی- پھر کوشش بسیار کے باوجود بھی اس گفتگو سے چھٹکارا حاصل نہ کیا جا سکا- بعض اوقات تو کئی کئی روز تک یہ تماشا چلتا رہتا ہے اور مختلف قسم کی باتیں ٹیلیفون پر سنائی دیتی رہتی ہیں- ہم آپ کو ان باتوں کے چند نہایت دلچسپ نمونے سنا سکتے ہیں لیکن سنائیں گے نہیں کیونکہ یہ باتیں راز کی ہیں- کوئی بیوی اپنے خاوند

کو کھری کھری سنا رہی ہے- کوئی بولنے والی کسی بولنے والے سے راز و نیاز اور "کہیں دور" ملنے کے وعدوں سے دل پرچا رہی ہے- کوئی آڑھتی کسی دوسرے آڑھتی کو بلیک کے نرخ بتا رہا ہے اور یہ سب لوگ محکمہ ٹیلیفون کے اعتماد پر راز کی باتیں کرتے ہیں مگر جانتے نہیں کہ ان کے فون کے تاروں کے کہیں بیچ لڑ گئے ہیں اور راز کی باتیں سارا زمانہ سن رہا ہے-

اس کا سب سے افسوس ناک اور تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ چند لوگوں کو مغلظ اور گندی گالیاں سنا کر ایک خاص قسم کی فرحت محسوس ہوتی ہے اور وہ ٹیلیفون پر بڑی فراخدلی سے فحش اور لچر گفتگو ایسی عورتوں سے کرتے ہیں جنہیں وہ جانتے تک نہیں- ایسے بے حیا اور بدکردار لوگوں کو محکمہ ٹیلیفون کے انجینئر بھی نہیں ڈھونڈ سکتے- اس معاملے میں صنف نازک بھی کسی سے پیچھے نہیں- بعض آزاد خیال اور شریر لڑکیاں دن کے وقت مختلف لوگوں کو ٹیلیفون کر کے پریشان کرتی رہتی ہیں- ایسی لڑکیاں اپنی مرضی کے بھولے بھالے شکار ڈھونڈ کر ان پر دلچسپ فقرے چست کرتی ہیں- پھر بڑے رومانٹک لہجے میں جھوٹی محبت کا دم بھرتی ہیں اور شرفا سے دل لگی کر کے یا پھر ان کا مذاق اڑا کر روحانی تسکین حاصل کرتی ہیں- اگر بھولے پنچھی کی بجائے کوئی منجھا ہوا شکاری مل جائے تو پھر یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا ہے اور بعض اوقات دل لگی کی حدود سے نکل کر سنجیدگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے نتائج اکثر عبرت ناک ہوتے ہیں- ایسی بیٹیوں کے باپ ہمیشہ محکمہ ٹیلیفون کو کوستے رہتے ہیں کہ بل اتنا ہوشربا بھیج دیا- ایسے مظلوم باپوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بل اس وقت ان کے گھر میں بنتے ہیں جب وہ دفتر جا چکے ہوتے ہیں- یہ خرافات اکثر ان ٹیلیفونوں پر چلتی ہے جن کے بل سرکار پاکستان ادا کرتی ہے-

اپریل 1951ء میں ہمارے ایک دوست اقبال صاحب بی- اے فائنل کی تیاریاں بڑے زور شور سے کر رہے تھے- وہ اپنی کوٹھی واقع لارنس روڈ لاہور کے لان میں بیٹھ کر ہر روز صبح سے شام تک پڑھائی میں منہمک رہتے- ایک دن وہ حسب معمول پڑھائی میں محو تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی- ملازم اس وقت موجود نہ تھا- لہٰذا اقبال کو خود ہی ریسیور اٹھانا پڑا- اور کہا "ہیلو"---- دوسری جانب سے بڑی ہی سریلی آواز میں کوئی لڑکی بولی---- "مس شہناز کو بلا دیجئے-"

"سوری رانگ نمبر" کہہ کر فون بند کر دیا-

تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجنے لگی- ریسیور اٹھایا تو وہی محترمہ بولیں---- "آپ کہاں

سے بول رہے ہیں؟"

"جہنم سے۔" اقبال صاحب نے اسی آواز کو پہچانتے ہوئے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"وہاں کیسے پہنچ گئے۔" نسوانی آواز نے پوچھا۔

"فرمائیے بندہ کیا خدمت کر سکتا ہے؟"

"آپ کا نمبر کیا ہے؟"

"میں کوئی بس یا ٹرک نہیں جس کا کوئی نمبر ہو۔"

"آپ بڑے بدتمیز ہیں۔"

"اوہو۔ تو آپ میرے نام سے بھی واقف ہیں۔"

"اب سمجھ گئی کہ آپ جہنم کیوں گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ صحیح سمجھا ہے آپ نے۔ اب اجازت دیں۔ شکریہ۔" اور ٹیلیفون بند کر دیا۔

اگلے روز پھر تین بجے ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دی۔ اقبال نے فون اٹھایا تو وہی نسوانی آواز آئی۔۔۔۔ (مسکراہٹ کے لہجہ میں) آداب عرض۔"

"سوری رانگ نمبر۔"

"ٹھہریئے مسٹر سوری رانگ نمبر، فون بند نہ کریں۔"

"فرمائیے۔"

"اگر بار خاطر نہ گزرے تو ایک سوال پوچھوں!"

"پوچھئے۔"

"جہنم میں کب تک ٹھہرنے کے ارادے ہیں؟"

"جب تک کوئی پیاری سی حور الاٹ نہیں ہو جاتی۔"

"حور کب الاٹ ہو گی؟"

"سروے تو ہو چکا ہے۔ امید ہے کام جلد ہی بن جائے گا۔"

"آپ تو بڑے رنگین مزاج ہیں۔"

"یہ سب حضور کی سحر کاریوں کا اثر ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ اب اجازت دیں۔"

"خدا حافظ۔"

آدھ گھنٹے کے بعد پھر اسی نازنین کا ٹیلیفون آیا۔ کہنے لگی۔۔۔۔ "دوبارہ تکلیف دینے

کی معافی چاہتی ہوں۔"

"قہر درویش بر جان درویش۔ فرمائیں۔"

"بی۔ اے کے بعد کیا ارادے ہیں؟"

"کوئلوں کی دلالی کا پروگرام بنا رہا ہوں۔"

"جہنم میں رہ کر آپ کو اس کا خاصا تجربہ ہو چکا ہو گا۔"

"جی ہاں۔ اسی وجہ سے تو یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"اگر آپ کسی سینما کے باہر ٹکٹیں بلیک کریں تو زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔"

"آپ کی تجویز تو خوب ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ کوئی پولیس والا واقف نہیں۔ اور پھر باکسنگ کے فن سے بھی ناآشنا ہوں۔"

"تو پھر انارکلی میں دانتوں کا منجن یا مولی کا نمک فروخت کریں۔ کافی نفع بخش رہے گا۔"

"دیکھئے محترمہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہی ہیں۔"

"میں حیران ہوں کہ آپ میری تجاویز کو ٹانگ اڑانا کیوں خیال کرتے ہیں۔"

"باز آئے ایسی محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا۔"

"تو ہماری بلا سے۔ آپ جہنم ہی میں سڑتے رہیں۔"

"بہت بہتر۔ آئندہ بھی اس ناچیز کو درگزر ہی فرمایا جائے"____ اور ٹیلیفون بند ہو گیا۔

تیسرے روز اقبال اس شریر لڑکی کے ٹیلیفون آنے کی وجہ سے سخت عاجز آ چکا تھا اور سوچنے لگا کہ آئندہ کیسا طرز عمل اختیار کیا جائے کہ فون کی گھنٹی ٹھیک تین بجے بجنے لگی۔ وہ سخت غصے کے عالم میں گیا اور ریسیور اٹھا کر کہنے لگا۔۔۔۔ "تمہیں شرم آنی چاہئے۔ میں یہ بے ہودگی برداشت نہیں کر سکتا"____ دوسری طرف سے بے حد کھردری مردانہ آواز سن کر اقبال سخت بدحواس ہو گیا۔ وہ صاحب اس کے والد کے دوست تھے اور انہی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اقبال نے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں "سوری رانگ نمبر" کہا۔ اور ریسیور رکھ دیا۔ گھنٹی دوبارہ ہوئی تو اقبال کو اپنی حماقت کا خیال آیا۔ ملازم کو فون سننے کا کہہ کر خود لان میں چلا گیا۔ اس کے بعد اس لڑکی کا کبھی ٹیلیفون نہیں آیا۔

ایک صاحب کو گھر ٹیلیفون آیا تو ایک غیر مانوس آواز سنائی دی۔ "دیکھئے صاحب' میں قاضی فخرالاسلام بول رہا ہوں۔ کل بعد دوپہر آپ کی بیگم صاحبہ خود کار چلا رہی تھیں۔ وہ سمن آباد مین روڈ پر جاتے ہوئے کار کا کنٹرول نہ سنبھال سکیں اور میری گاڑی جو وہاں ایک جانب کھڑی تھی' سے آ ٹکرائیں۔ اس سے میری گاڑی کی بیک سائیڈ بری طرح پچک گئی' دونوں بتیاں اور پچھلا شیشہ بھی ٹوٹ گیا۔ دونوں مڈگارڈ اور بمپر کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے۔"

"آپ کیسے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ میری ہی بیگم تھیں؟"

"آپ کا فون نمبر انہوں نے ہی دیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی غلطی تسلیم بھی کر لی تھی۔"

اس بیگم کے خاوند نے حیران ہو کر پوچھا---- "کیا میری بیگم نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے؟"

"جی ہاں۔"

بیگم کے خاوند بولے---- "سوری رانگ نمبر" اور ٹیلیفون بند ہو گیا۔

ایک سکھ ٹیلیفون آپریٹر اپنی ڈیوٹی پر بیٹھا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ سکھ نے چونگا اٹھایا اور "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف سے آواز آئی---- "کرنل جان سپیکنگ دس سائیڈ۔ ہو از سپیکنگ دیٹ سائیڈ۔"

COLONEL JOHN SPEAKING THIS SIDE WHO IS SPEAKING THAT SIDE?

یہ انگریزی سن کر سکھ گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ اب انگریزی میں ہی نام بتانا پڑے گا۔ چنانچہ وہ بولا---- "تھوزینڈا سنگھ شارپر دس سائیڈ۔"

THOUSANDA SINGH SHARPER THIS SIDE

---- سکھ کا نام ہزارہ سنگھ تیکھا تھا۔

ایک صاحب نے رات کے وقت کسی عزیز کو ٹیلیفون کیا۔ ادھر سے آواز آئی----

"ہیلو۔"

"کون صاحب ہیں؟"

"ہیلو۔"

"بھائی کون بول رہے ہیں؟"

"آواز نہیں آ رہی۔ ذرا اونچا بولیں۔"

"کیا شمسی صاحب موجود ہیں؟"

"اجی حضرت۔ ذرا اونچا بولیں۔"

(اور بلند آواز سے) "شمسی صاحب سے بات کرائیں۔"

"بڑی دھیمی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کیا آپ اونچا نہیں بول سکتے؟"

(پھر چیختے ہوئے) "میاں میں اس سے اونچا بول سکتا تو ٹیلیفون استعمال کیوں کرتا۔"

"سوری رانگ نمبر" اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

گوجرانوالہ کے ایک معروف صنعت کار کو اس کے بھائی کا ٹیلیفون کراچی سے آیا۔ اتفاق سے اس روز یکم اپریل تھی۔ کارخانہ دار کو پہلے بھی کئی رانگ نمبر مل چکے تھے اور اب وہ بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ اس دفعہ آپریٹر نے انہیں کہا کہ کراچی سے بات کریں۔ تو وہ سمجھ گئے کہ یہ کوئی نیا چکر ہے اور اپریل فول بنایا جا رہا ہے۔ ان کے بھائی بیچارے کو اس کا علم بھی نہ تھا۔ چنانچہ بات اس طرح ہوئی---- "مجید صاحب ہیں؟"

"جی وہ باہر گئے ہیں۔"

"سعید صاحب سے بات کرائیں۔"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

"منیجر محمد رفیع صاحب سے ملا دیں۔"

"وہ آج بیمار ہیں۔ فیکٹری نہیں آئے۔"

"اچھا اکاؤنٹنٹ کو بلا دیں۔"

"وہ بھی چھٹی پر ہیں۔"

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں تو گاہک ہوں۔"

"کیا دفتر میں کوئی صاحب ہیں؟"

"جی نہیں۔ دفتر میں تو تالا لگا ہے۔"

"پھر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ منیجر بیمار ہے اور اکاؤنٹنٹ چھٹی پر ہے؟"

"چوکیدار نے بتایا تھا۔"

"اچھا چوکیدار کو بلا دیں۔"

"وہ کھانا کھانے چلا گیا ہے۔"

"بھئی میں کراچی سے حمید بول رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے۔"

"بکواس آپ کرتے ہیں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

مجید صاحب بڑے خوش تھے کہ وہ اپریل فول نہیں بنے۔

ایک بزرگ ناشتہ کرنے لگے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آپ نے اپنی نوجوان بیٹی سے کہا---- "نازلی بیٹا' ذرا دیکھنا کس کا فون ہے۔" نازلی چلی گئی۔ بوڑھے میاں جب ناشتہ سے فارغ ہوئے تو بیٹی ابھی ٹیلیفون پر مصروف گفتگو تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد جب نازلی فون سن کر واپس آئی تو باپ نے پوچھا---- "بیٹا کس کا فون تھا؟"

نازلی نے جواب دیا---- "ڈیڈی کوئی رانگ نمبر تھا۔"

میں ایک دفعہ اپنے کسی دوست کے گھر بیٹھا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ آس پاس اہل خانہ میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی---- "ہیلو چودھری امتیاز صاحب ہیں؟"

میں اس وقت دل لگی کے موڈ میں تھا۔ کہہ دیا---- "جی وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔"

"سوری رانگ نمبر" اور سلسلہ ختم ہو گیا۔

ہمارے ایک رشتہ دار جب ٹیلیفون کرتے ہیں تو وہ کچھ مخصوص رٹے ہوئے فقرے ضرور ادا کرتے ہیں۔ مثلاً---- "السلام و علیکم"

"وعلیکم السلام"

"کون صاحب ہیں؟"

"جی میں عزیز ذوالفقار بول رہا ہوں۔"

"کیا حال ہے برخوردار۔"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"آپ کی دعا ہے۔"

"مزاج کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔"

"بھائی صاحب (یعنی میرے والد صاحب) کا کیا حال ہے؟"

"خدا کے فضل سے بخیریت ہیں۔"

"بہن کیسی ہیں؟"

"وہ بھی راضی ہیں۔"

"اور کیا حال ہے؟"

"جناب پہلے سے بہت افاقہ ہے۔"

"کیوں کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں ہوا تھا۔"

"دوسرے اہل خانہ کیسے ہیں؟"

"آپ کی درازی عمر کے لئے دعا گو ہیں۔"

"کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"رب العزت کی مہربانی ہے۔"

"اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔"

"بہت بہتر گزر رہی ہے۔"

"ہمارے لائق کوئی خدمت!"

"بس آپ کی شفقت درکار ہے۔"

"میں نے سوچا کئی روز سے خیریت معلوم نہیں کی۔ فون پر ہی پتہ کر لوں۔"

"آپ کی عنایت ہے۔"

"بھائی ہمیں تو خیال ہوتا ہی ہے..... اور پھر سب خیریت ہے؟"

"پروردگار کا فضل ہے۔"

"اچھا پھر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

میرے ایک عزیز دوست کو ایک ٹیلیفون آیا۔ جب اٹھایا تو آواز آئی---- "ذرا حاجی صاحب کو بلا دیں۔"

"کون صاحب ہیں؟"

"میں امجد بول رہا ہوں۔"

"اچھا ہولڈ کریں۔" کہہ کر وہ اپنے والد کو بلا لائے۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔۔۔۔

"سناؤ برخوردار مزاج کیسے ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے جناب۔"

"کب آئے لاہور سے؟"

"کل شام کو ہی آ گیا تھا۔"

"تمام اہل خانہ تو اچھے ہیں؟"

"جی سب راضی ہیں۔"

"آج کیسے یاد کیا؟"

"حاجی صاحب' آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جمعرات کو شنیل اور جارجیٹ بھجوا دیں گے مگر ابھی تک کچھ بھی نہیں پہنچا۔"

"کیا بات کرتے ہو میاں؟ کیسی شنیل اور کونسی جارجیٹ؟"

"آپ اتنی جلدی بھول گئے۔ ابھی تو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ میں کل رقم ایڈوانس دے گیا تھا۔ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جمعرات کو مال بھجوا دیں گے؟"

"ارے بھائی ہوش کرو۔ میرا شنیل سے کیا واسطہ؟"

"کیا آپ حاجی محمد شفیع نہیں ہیں؟"

"نہیں تو۔ میں حاجی محمد اسماعیل بول رہا ہوں۔"

"سوری رانگ نمبر۔"

ایک معزز خاتون نے سکول کے ہیڈ ماسٹر کو ٹیلیفون کیا اور اپنے لڑکے کی تعلیمی حالت کے متعلق استفسار کرنے لگی۔ اس دوران ٹیلیفون کا رابطہ منقطع ہو کر ایک تھانیدار سے جا ملا جو اپنے ایس۔ پی کو ایک مفرور مجرم کی گرفتاری کی روئداد سنا رہا ہے۔ عورت بیچاری یہ سمجھتی رہی کہ اس سے ہیڈ ماسٹر مخاطب ہے۔ پھر گفتگو کچھ ایسے ہوئی۔

"وہ لڑکا مفرور قاتل نکلا ہے۔ آج میوہ منڈی میں اسے اس کے آوارہ ساتھیوں کے ساتھ قمار بازی کرتے ہوئے گرفتار کر لیا ہے۔ اس نے قتل کے علاوہ بھی کئی وارداتوں کا اقبال کر لیا ہے۔ ہم نے اس کی نشاندہی پر ڈھائی ہزار روپے کا مسروقہ مال بھی برآمد کر لیا

ہے۔"

عورت سخت سراسیمگی کی حالت میں بولی۔ "کیا کہا؟"

(تھانیدار اپنی دھن میں مگن) "جناب عالی۔ ہم مجرم کے گھر میں آج اچانک چھاپہ مار کر تلاشی لے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اور بھی جرائم سے پردہ اٹھے گا۔"

عورت نے روتے ہوئے ٹیلیفون بند کر دیا۔

میر صاحب اور شیخ صاحب دونوں بڑے زندہ دل' خوش مزاج اور بے تکلف دوست ہیں۔ دونوں سخت سردی کے دنوں میں کمبل وغیرہ اوڑھے کمرے میں حقہ پی رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میر صاحب نے فون اٹھایا تو ایک لڑکا فحش گالیاں بکنے لگا۔ میر صاحب کو شرارت سوجھی اور کہنے لگے:

"آپ کو شیخ صاحب سے ملنا ہے؟ وہ میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔" انہوں نے ریسیور شیخ صاحب کو دے کر کہا۔۔۔۔ "لیجئے بات کریں" ____ جب شیخ صاحب نے حقے کی نے منہ سے نکال کر ریسیور کان سے لگایا اور بڑے شفقت آمیز لہجہ میں "ہیلو" کہا تو دوسری طرف سے ماں بہن کی غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ شیخ صاحب سخت بوکھلا گئے اور پھر اسی زبان میں جواب دینے لگے۔ اسی دوران غصے کی حالت میں شیخ صاحب کا ایک پاؤں حقے کو جا لگا جو گر پڑا اور چلم ٹوٹ گئی۔ شیخ صاحب خود بھی گالیاں دیتے ہوئے اپنا توازن کھو بیٹھے اور کرسی سمیت زمین پر آ رہے۔ میر صاحب کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ اب شیخ صاحب ٹیلیفون کرنے والے شریر لڑکے کے علاوہ میر صاحب کو بھی صلواتیں سنا رہے تھے۔ شیخ صاحب کو گرنے سے گھٹنے پر اتنی شدید چوٹ آئی کہ وہ اگلے دس روز تک چارپائی سے اٹھ نہ سکے۔

اپنے ایک کرم فرما تو "سوری رانگ نمبر" کے شیدائی ہیں۔ وہ ہر وقت ان طلسمی الفاظ کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔۔۔۔ بازار یا گلی سے گزرتے ہوئے انہیں اگر کہیں ٹھوکر لگ جائے تو بے ساختہ ان کے منہ سے "سوری رانگ نمبر" نکل جاتا ہے۔ کئی مرتبہ راہ چلتے ہوئے بدحواسی میں کسی دوست کے خیال سے اجنبی سے ہمکلام ہو جاتے ہیں اور پھر "سوری رانگ نمبر" کہہ کر آگے چل دیتے ہیں۔ وہ دفتر میں اپنی سٹینو کو چٹھی لکھاتے ہوئے اگر کوئی غلط لفظ لکھا دیں تو "سوری رانگ نمبر" کہہ کر فوراً کٹوا دیتے ہیں۔ انہی خوبیوں کی بدولت وہ دوستوں اور دفتر کے عملہ میں "سوری رانگ نمبر" کے نام سے مشہور ہیں۔ "سوری رانگ

نمبر" کا ان کی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے بلکہ یہ پیارے اور دلاویز الفاظ ان کے لئے خوش قسمتی کی علامت ہیں- ان کی حسین اور وفادار بیوی اور قابل رشک گھریلو زندگی بھی " سوری رانگ نمبر" کی مرہون منت ہے- اگر رانگ نمبروں کا ملنا معرض وجود میں نہ آتا تو شاید تمام عمر ہی کنوارے رہتے- یہی وجہ ہے کہ انہیں ان سحر انگیز الفاظ سے والہانہ لگاؤ ہے- وہ اکثر "سوری رانگ نمبر" زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں-

○

کامونکی بائی نائٹ

آپ عنوان دیکھ کر حیران نہ ہوں- اگر یورپ بائی نائٹ' لندن بائی نائٹ' پیرس اور ٹوکیو بائی نائٹ ہو سکتا ہے تو پھر کامونکی بائی نائٹ بھی ممکن ہے- کیوں نہ ہو- کامونکی کسی شہر سے کم تو نہیں- یہاں یورپ جیسی شبینہ کلبیں (نائٹ کلبیں) پب PUBS نیون سائن کی چکا چوند کرنے والی روشنیاں' بڑے بڑے دلاویز ڈانسنگ ہال' بلند عمارات' کشادہ اور خوبصورت بازار' وسیع و عریض فیشن ایبل ہوٹل اور ریسٹورنٹ' حسین پارک اور باغات' دل کش شاپنگ سنٹر اور رنگین عشرت کدے نہیں تو پھر کیا ہوا- یہاں رات تو ہوتی ہے اور رات کی گہما گہمی میں دلفریب محفلیں تو جمتی ہیں- یہاں بھی لوگ تفریح کے لئے رات کو گھروں سے نکلتے ہیں' اور مختلف طریقوں سے اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچاتے ہیں اور پوری طرح سے لطف اندوز ہوتے ہیں- بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جن لوگوں کو کامونکی بائی نائٹ سے محظوظ ہونے کا موقع ملا ہے' انہیں کوئی اور بائی نائٹ پسند نہیں آئی-

امریکہ' یورپ' مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے تمام بائی نائٹ بہت ہی مہنگے ہوتے ہیں---- اور ایک اوسط درجے کا ٹورسٹ ان سے لطف اندوز ہونے کا خرچہ برداشت ہی نہیں کر سکتا- مگر کامونکی بائی نائٹ کم خرچ بالا نشین والی بات ہے- اسے ہر امیر غریب' چھوٹا بڑا' مرد اور عورت بلا کسی رکاوٹ اور تردد کے دیکھ سکتا ہے- غریب ٹورسٹ تو خاص طور پر کامونکی بائی نائٹ دیکھ کر اس قدر خوش ہوتا ہے جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو-

میں تقریباً پندرہ برس لندن میں مقیم رہا ہوں اور اس دوران امریکہ' یورپ' مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے تمام بڑے بڑے اہم شہروں کی سیاحت کی ہے- ان جگہوں کی پرکیف نائٹ لائف بھی دیکھی ہے- خاص طور پر پیرس کی LIDO اور CASINO لندن کی پکاڈلی سرکس بیروت کی CASINO DE LIBON ٹوکیو کی گنزا' نیویارک کی براڈوے' روم کی TRIVOLI BY NIGHT اور ایتھنز کا وائن فیسٹویل تو رنگین دنیا کی رعنائیوں دلچسپیوں اور سحر کاریوں کا حسین مرقع ہیں- بیشک ٹورسٹ ان مشہور عالم چیزوں کو دیکھ کر اپنی

شخصیت ہی بھلا بیٹھتا ہے مگر کامونکی' کسی شاعر نے کیا خوب اور درست کہا ہے۔

"جو بات تجھ میں ہے اور کسی میں نہیں۔"

زندگی کا بیشتر حصہ ان ترقی یافتہ خوبصورت شہروں میں گزارنے کے باوجود بھی میں کامونکی کو نہیں بھولا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جو کشش مجھے کامونکی سے ہے وہ دنیا میں کہیں بھی نظر نہیں آئی۔

اتنا عرصہ یورپی ممالک میں گزارا۔ مگر قسم لے لیں جو ایک مرتبہ بھی میرا پاؤں کہیں کیچڑ یا گوبر میں پڑا ہو۔ وہاں مکھی اور مچھر تک تو نظر نہیں آئے اور آدمی پر اس حد تک پابندی ہے کہ وہ سڑک' بازار یا گلی میں تھوک بھی نہیں سکتا۔ لعنت بھیجو ایسی جگہوں پر۔ جبھی تو میرا ان جگہوں پر دل نہیں لگا۔ اور مجھے کامونکی رہ رہ کر یاد آتا رہا۔

معاف کرنا میں اپنا تعارف تو کروانا بھول ہی گیا۔ میں کامونکی کے چنگڑ محلہ کے ایک معزز چمار خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ آٹھ جماعتیں پڑھ کر اپنے ایک دور کے چچا کے پاس ولائت چلا گیا تھا وہاں پہلے ایک ہوٹل میں برتن مانجھنے کا کام مل گیا۔ چند ماہ بعد ایک بس کمپنی میں کلینر کی جگہ مل جانے پر ہوٹل کی ملازمت چھوڑ دی۔ یہ ملازمت بھی مجھے راس نہ آئی تو ایک فیکٹری میں بطور قلی بھرتی ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے ورک مسٹری بن گیا۔

ولائت میں لوگ مجھے امین ڈٹ کے نام سے پکارتے تھے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اپنا نام تبدیل نہیں کیا۔ چونکہ میرا اصل نام جو والدین نے رکھا تھا' اللہ دتہ ہے۔ جسے انگریز لوگ امین ڈٹ بنا بیٹھے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اگرچہ اسکول میں انگریزی پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر ولائت میں رہ کر انگریزی اچھی خاصی روانی سے بولنے لگا ہوں۔

لندن سے باہر میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو پرنس آف کامونکی ظاہر کیا ہے۔ ان لوگوں کو چونکہ علم ہے کہ ہند و پاک میں بہت سی ریاستیں ہیں۔ اس لئے مجھے پرنس ماننے میں انہیں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ لندن میں البتہ ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ پیشتر لوگ میری حقیقت اور اوقات سے واقف تھے۔

یورپ کی شاندار تقریبوں اور رنگین محفلوں' سہانی راتوں میں جگمگاتی روشنیوں' دلفریب شبینہ کلبوں' حسین پارکوں' دیو قامت عمارتوں' خوبصورت اور پررونق بازاروں اور شاپنگ کے مرکزوں' نوادرات سے مزین عجائب گھروں' مستی بھرے میخانوں' مسحور کن عشرت کدوں اور پری چہرہ مہ وشوں کے جھرمٹ میں جہاں کہیں بھی مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے'

خدا گواہ ہے' میں نے آہیں بھر بھر کر نہ صرف خود کامونکی کو یاد کیا ہے بلکہ دوسرے ساتھیوں اور دوستوں کو بھی اس گوشہ جنت قابل دید مقام کے متعلق بھی روشناس کرایا ہے۔

وطن کے لئے میرے اس والہانہ جذبے نے مجھے نہ صرف یورپ کی پراسرار اور رنگین سرزمین کو چھوڑنے پر مجبور کیا بلکہ مجھے خاصا نقصان بھی پہنچایا۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی کو غموں اور پریشانیوں سے ہمکنار کیا۔ میری آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو گئے۔ کام کاج کرنے کی صلاحیت بھی جاتی رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری چہیتی شریک حیات گریٹا بھی مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی۔

معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو گریٹا کے متعلق تو بتایا ہی نہیں۔ وہ آئرش لڑکی تھی۔ اور مانچسٹر میں ایک باربر شاپ میں بال تراشنے کا کام انجام دیتی تھی۔ میری اس سے ملاقات بھی اسی شاپ میں ہوئی تھی۔ پھر چند ماہ کی کورٹ شپ کے بعد ہم نے شادی کر لی۔ گریٹا بڑی اچھی ساتھی تھی۔ اس کی بینائی البتہ کمزور تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ موٹے شیشوں والی عینک لگاتی تھی۔ کامونکی بائی نائٹ کے قصیدے بارہا وہ مجھ سے سن چکی تھی اور اسے دیکھنے کے لئے بہت بیتاب تھی۔ وہ ہر وقت ضد کرتی رہتی تھی کہ کامونکی چلو۔ میں ہمیشہ ٹال مٹول کر کے اس کا اشتیاق بڑھاتا رہتا۔ آخر ایک دن اس نے رشتہ ازدواج منقطع کرنے کا الٹی میٹم دے دیا تو ناچار مرعوب ہو کر میں نے کامونکی کی زیارت کا قصد کیا اور پھر ایک روز ہم لوگ اچانک اپنی دل پسند اور محبوب منزل کامونکی پہنچ گئے۔ ہم ٹرین سے اتر کر جب شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کے پندرہ بیس لونڈے' چند پانڈی (مزدور) کچھ دیہاتی اور دو مقامی آوارہ کتے ہمارے پیچھے لگ گئے اور ہم اس پروقار جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنے آبائی گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تمام دکاندار اور راہ گیر ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد گریٹا نے اپنی ناک پر رومال رکھ لیا تھا اور بازار میں چلتے ہوئے اس کی حالت قابل رحم تھی۔ راستے میں مہاجے حلوائی کی دوکان آئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں..... پہچانتا بھی کیسے۔ میں پندرہ برس کے بعد لوٹ رہا تھا۔ میں نے جب اپنے متعلق بتایا تو وہ اسی طرح انتہائی غلیظ بنیان اور دھوتی کے ساتھ آگے بڑھا اور بڑے خلوص اور تپاک کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ دوسرے دوکاندار کو بڑی رشک اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ادھر گریٹا بڑی خشمگیں اور درشت نظروں

سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اس کا اگر بس چلتا تو وہ میرے اور مہاجے کے ٹکڑے کر دیتی۔

گھر پہنچ کر اسے مزید مایوسی ہوئی۔ ہمارا کاشانہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ جب اس کی نظر میرے تایا مولا بخش پر پڑی جو اس وقت پرانے جوتوں کی مرمت کر رہے تھے' تو وہ سٹپٹا اٹھی۔ پھر میری تائی بھاگن' اس کی لڑکی سکینہ اور دیگر بچوں کو دیکھا تو اس پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے تصور میں خدا جانے کیا کچھ لائی تھی۔ بہرحال اس کے چہرے کی تیوریاں عیاں تھیں اور میں کھسیانہ ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

شام کو گریٹا نے میری اور تائی کی ہزار منت سماجت کے باوجود کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا اور مجھے کہنے لگی۔ "ڈارلنگ رات کو ڈنر کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔" میں اس کی تجویز سن کر مسکرا دیا۔

رات کو گریٹا نے کامونکی بائی نائٹ دیکھنے کی خواہش کی تو میں اسے ساتھ لے کر تقریباً آٹھ بجے باہر گیا۔ گلیوں میں سخت اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے محو خرام تھے۔ چلتے چلتے گریٹا کی ایک دم چیخ سنائی دی۔ میں گھبرا گیا اور فوراً" اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ پھر وہ اپنا دایاں پاؤں اوپر اٹھاتے ہوئے نان سینس اور سلی کہہ رہی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی روشن کی تو دیکھا کہ اس کا پاؤں گوبر سے بھرا ہوا تھا اور جوتا ندارد۔ میں نے گوبر کے ڈھیر میں سے اس کا جوتا تلاش کر کے نکالا اور تھوڑی دور جا کر نلکے پر اس کا پاؤں اور جوتا دونوں دھلائے۔ وہ جوتا پہن کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں نے گریٹا کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کی تلقین کی۔ پھر ہم احتیاط سے چلتے ہوئے مین بازار میں آ گئے جہاں بیشتر دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف پھل' دودھ' دہی اور پان سگریٹ کی دوکانیں کھلی تھیں' جہاں بلند آواز میں ریڈیو بج رہے تھے اور دس بارہ بے فکرے لوگ ہر دوکان کے گرد جمع تھے۔ آگے بڑھے تو دو آدمی بند دوکانوں کے عین سامنے نالی پر بیٹھ کر پیشاب کر رہے تھے۔ گریٹا انہیں دیکھ کر سخت پریشان ہوئی اور اس نے ایڈیٹ IDIOT کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ پھر ہم جی ٹی روڈ پر آ گئے تو وہاں خاصی رونق اور چہل پہل تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ وہاں کھڑے آنے جانے والی بسوں' لاریوں اور ہاکروں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ پٹرول پمپ کے پاس کھلے میدان میں بہت روشنی اور لوگوں کو جمگھٹا تھا اور لاؤڈ سپیکر کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم وہاں گئے تو پتہ چلا کہ کوئی

مذہبی جلسہ تھا اور شیخ الحدیث ابوالکلام' واعظ خوش بیان حضرت مولانا علامہ قاری شیر محمد قادری ڈسکوی تقریر کر رہے تھے۔ وہ فرما رہے تھے:۔

"اگر ایک معمولی سی گولی' دو پیسے کی حقیر گولی' ایک چھوٹی سی ادنیٰ گولی' بروک بیکس کی بے حقیقت گولی قبض کشا ہو سکتی ہے تو کیا وجہ ہے میرے مولا اور آقا حیدار کرار کرم اللہ وجہ' مشکل کشا نہیں ہو سکتے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی فضا نعرہ تکبیر' اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ گریٹا یہ جوش و خروش دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگی کہ اس پادری نے کیا کہا ہے تو میں جواب گول کر گیا۔ کیونکہ اسے اصل بات بتا کر میں اپنے مذہب کی تضحیک کروانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں سے چل کر ہم مویشیوں کا میلہ دیکھنے گئے جو کہ اتفاق سے ان دنوں لگا ہوا تھا' میلے میں مٹھائی' کٹے ہوئے تربوز' حلیم' مچھلی' سری پائے اور کلیجی اوجری وغیرہ کی دوکانیں نہایت ذوق سے سجی ہوئی تھیں اور گرد و غبار کا طوفان اٹھ کر ان اشیاء پر پڑ رہا تھا۔ جب ہم ان دوکانوں کے قریب سے گزرے تو تعفن اور بساند کی وجہ سے ہمیں ناک پر رومال رکھنے پڑے۔ مکھی اور مچھر کی بھی بہتات تھی۔ گریٹا نے جب دیکھا کہ دکانداروں نے ان کھانے پینے والی اشیاء کو ڈھانپنا بھی گوارا نہیں کیا اور لوگ وہی چیزیں بلا تکلف ہڑپ کرتے جاتے ہیں' تو وہ حیرانگی سے مجھے پوچھنے لگی کہ یہ چیزیں تو مہلک جراثیم سے پر ہیں' لوگ اسے کھا کر زندہ کیسے بچے رہتے ہیں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ راکٹ ڈیزل والوں کی طرح یہ لوگ گلے میں لال فلٹر رکھتے ہیں' جس میں سے جراثیم نہیں گزر سکتے۔ اسی لئے یہ لوگ ایسی تمام چیزیں بے دھڑک کھا جاتے ہیں۔ گریٹا میرا جواب سن کر سخت حیرت زدہ ہوئی۔ میں نے اسے مزید بتایا کہ ان اشیاء کے کھانے سے آدمی ملیریا' ہیضہ اور ٹیٹنس سے محفوظ ہو جاتا ہے اور یہ بیماریاں پھر دور بھاگتی ہیں۔

پھر ہم آگے چل دیئے۔ میں نے گریٹا کو بتایا کہ اب ہم CASINO LE KAMOKI دیکھنے جا رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم بچی شاہ کے تھیٹر کے سامنے کھڑے ایک خسرہ نما طوائف کا بڑا ہی لچر رقص دیکھ رہے تھے اور وہ پنجابی کا یہ گانا گا رہی تھی۔

"میری چیچی دا چھلا ماہی لا لیا گھر جا کے شکیت لاواں گی"

تھوڑا آگے گئے تو "رحمو دا تھیٹر" نظر پڑا۔ اس کے باہر بھی ایک طوائف مٹک مٹک کر

ڈانس کر رہی تھی اور یہ گانا گا رہی تھی۔

"میرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے"

"موت کا کنواں" دیکھ کر گریٹا بہت محظوظ ہوئی اور اس نے دل کھول کر داد دی اور کہا۔ "ویری تھرلنگ۔ ونڈرفل۔"

وہاں سے آگے بڑھے تو راستے میں ایک حجام اپنے کسی گاہک کا سر اپنے گھٹنوں میں دبا کر اس کی حجامت بنا رہا تھا اور گاہک بیچارا مرغا بنا خاموشی سے بال کٹانے میں محو تھا۔ میں نے گریٹا کو بتایا کہ یہاں ہیئر کٹنگ ہو رہی ہے تو وہ چونک گئی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا HORRIBLE HOW CRUEL IT IS

اس کے قریب ہی ایک کھیت میں چند دیہاتی لوگ کورس کی صورت میں ڈھولک کے ساتھ ناچ اور گا رہے تھے۔ دیہاتیوں کا یہ مجنونانہ بھنگڑا ڈانس گریٹا نے بہت پسند کیا۔ یہ اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ وہ راک این رول اور ٹویسٹ بھول گئی۔

پھر میں نے اسے جادو کے حیرت انگیز کرتب دکھائے جنہیں دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی۔ جب جادوگر نے سرعام اپنے ایک جمورے کی زبان تیز دھار چاقو سے کاٹ کر لوگوں کو دکھائی اور جمورے کا منہ لہو لہان ہو رہا تھا تو گریٹا ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ میں بھی گھبرا گیا۔ اس کے چہرے پر پانی چھڑکا تو اسے ہوش آیا اور اپنے سامنے اسی جمورے کو صحیح سلامت دیکھ کر بہت نادم ہوئی۔ اور پھر تالی بجا کر جادوگر کو داد دینے لگی۔ ونڈرفل۔ ایکسیلینٹ۔

وہاں سے ہم فارغ ہو کر واپس چلنے لگے تو آندھی کے زبردست طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔ تمام خیمے اور پنڈال اکھڑنے لگے۔ گرد و غبار میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مچھلی' سری پائے اور مٹھائی کے تیل کی سڑاند اور تیز بو نے ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ گرد کی وجہ سے راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجبوراً" ایک جگہ ہمیں بیٹھ کر طوفان تھمنے کا انتظار کرنا پڑا۔ آدھ گھنٹہ بعد کہیں جا کر طوفان تھما اور ہم واپس جی۔ ٹی روڈ پر آئے۔ میں گریٹا کو "پردیسی ہوٹل" میں لے گیا' جہاں ٹرکوں کے ڈرائیور اور کلینر کھانا کھاتے ہیں۔ ہم وہاں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ایک بے حد غلیظ بیرے کو بلا کر جب میں آرڈر دینے لگا تو گریٹا نے اپنا دم گھٹنے کی شکایت اور جلدی سے اٹھی۔ اس کے سکرٹ کے ساتھ کرسی بھی اٹھ آئی۔ کیونکہ کرسی پر جمی ہوئی چکنی میل سکرٹ سے چپک گئی تھی۔ میں نے کرسی کو سکرٹ سے علیحدہ کیا مگر وہ

کافی پریشان تھی۔ اس ماحول سے گھبرا کر وہ باہر آ گئی اور مجھے فوراً" گھر چلنے کو کہا۔ میں نے گریٹا کو دو انتہائی بہترین اور دلچسپ پنجابی فلمیں "اگے تیرے بھاگ لچھیئے" اور "چن مکھناں" جو اتفاق سے وہاں چل رہی تھیں دکھانے کی پیش کش کی۔ مگر گریٹا چونکہ تھک چکی تھی' نہ مانی۔ ویسے بھی ہم لوگ گرد و غبار سے اٹے پڑے تھے۔ اس لئے ہم گھر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ بازاروں اور گلیوں میں چاند نکل آنے کی وجہ سے روشنی تھی۔ گریٹا کو گوبر والا حادثہ پیش آنے کی وجہ سے میں نے گھر جانے کا دوسرا راستہ اختیار کیا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہاں کھلے گٹر پر سے گزرنا پڑے گا۔ چنانچہ چلتے چلتے ہم وہاں گٹر کے قریب پہنچے تو میں نے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ ایک بوسیدہ لکڑی کے تختے پر سے گزرنا پڑے گا۔ میں نے گریٹا کو خبردار کر دیا اور اسے آہستہ آہستہ اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں نے مشکل سے ابھی گٹر پار ہی کیا تھا کہ گریٹا کی دلدوز چیخ اور گٹر میں دھڑام سے گرنے کی آواز آئی۔ بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طور پر راستے کا اندازہ نہ کر سکی۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ ادھر ادھر چلائے تو اس کا ایک ہاتھ ایک مرے ہوئے کتے کی نعش پر جا پڑا۔ اسی کش مکش میں اس کی عینک بھی گٹر میں گر گئی جس سے وہ اور زیادہ وحشت زدہ ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے مجھے گالیاں دے رہی تھی۔ میں اسے اسی ابتر حالت میں گھر لے آیا۔ تمام راستے وہ ابکائیاں اور قے کرتی رہی۔ گھر آ کر اسے تائی بھاگن نے خوب صابن مل مل کر نہلایا اور کپڑے تبدیل کروائے۔ اس کے جسم پر کئی جگہ خراشیں آئی تھیں۔ جن پر اسپرٹ لگایا تو گریٹا نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ رات کو تیز بخار نے اسے آ لیا۔ وہ رات اس نے تڑپ تڑپ کر بڑی اذیت میں گزاری۔

اگلے روز صبح ڈاکٹر نے آ کر اسے ٹیکے لگائے۔ چار گھنٹے بعد اس کا بخار ہلکا ہوا' تو وہ چارپائی سے اٹھ کر واپس جانے کے لئے چل کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کی بہت منت اور خوشامد کی اور اسے صرف چند روز اور ٹھہرنے کو کہا۔ میں نے اسے مشہور گولڈن جوبلی پنجابی فلموں مثلاً ابا جی' چاچا جی' ماما جی' باؤ جی' حکیم جی اور منیم جی بھی دکھانے کا لالچ دیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ چنانچہ اسی شام میں اسے لاہور لے گیا۔ وہاں اس کی نئی عینک خریدی۔ کامونکی میں قیام کے دوران پورے اٹھارہ گھنٹوں میں اس نے پانی یا چائے کی ایک بوند بھی حلق سے نہ اتاری تھی' اور نہ ہی کھانے کا ایک نوالہ تک لیا تھا۔ بھوک پیاس اور

ناسازی طبیعت کے باعث وہ نڈھال ہو رہی تھی- میں اسے مال روڈ پر شیزان انٹر کانٹی نینٹل ریسٹورنٹ میں لے گیا- وہاں اسے کھانا کھلایا تو اس کے حواس بجا ہوئے-

اگلے روز وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر ولایت روانہ ہو گئی- اس کی روانگی سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنی صحت اور کامونکی بائی نائٹ کا واسطہ دے کر اسے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کو کہا مگر اس نے نہایت حقارت سے کہا-

HELL WITH KAMOKI HELL WITH YOU.

(جہنم میں جاؤ تم اور جہنم میں جائے کامونکی)

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ قصور خود اس کی اپنی بینائی کا تھا- مگر مورد الزام مجھ غریب کو ٹھہرایا- یہ میرے ساتھ کتنی بڑی زیادتی تھی-

○

خلیفہ جی

ہاتھی کا ایک بچہ راستہ بھول کر جنگل میں کہیں دور نکل گیا- اس کی ملاقات ایک چوہے سے ہوئی- چوہا اپنے علاقے کا چودھری تھا- اس نے اتنی بڑی مخلوق پہلی مرتبہ دیکھی تو بے حد حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ اس کی عمر ہزار سال تو ہو گی- جبھی اتنا بڑا ہے- پھر اپنے تجسس کو چھپاتے ہوئے پوچھنے لگا---- "آپ کون ذات شریف ہیں؟" ہاتھی کے بچے نے جواب دیا---- "ہم ہاتھی ہوتے ہیں-" چوہے نے دریافت کیا- "آپ کی عمر کتنی ہے؟" ہاتھی کا بچہ کہنے لگا---- "چھ ماہ-" چوہا یہ غیر متوقع اور حیران کن جواب سن کر بہت پریشان اور شرمسار ہوا-

ہاتھی کا بچہ چوہے کی الجھن کو بھانپ گیا اور اس سے پوچھنے لگا---- "آپ کون ہیں؟" چوہے نے جواب دیا---- "ہم چوہے ہوتے ہیں-" پھر اس کی عمر پوچھی تو چوہا سخت ندامت سے سر جھکا کر کہنے لگا---- "میں دراصل بیمار رہتا ہوں- اس لئے صحت کمزور ہے-"

ہمارے خلیفہ جی بھی اکثر بیمار رہتے ہیں- اس لئے کمزور صحت کے مالک ہیں- وہ پچپن کے پیٹے میں ہیں- ان کا وزن بمشکل تمام ساٹھ پونڈ ہو گا- آپ جوانی کے ایام میں اکھاڑے جا کر باقاعدہ ورزش کرتے تھے اور بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں سے کشتی لڑ چکے ہیں- آپ کی پھرتی اور چستی ضرب المثل بن گئی..... فن پہلوانی کے شائقین دور دور سے خلیفہ جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے آتے تھے- خلیفہ جی اپنے دور میں یقیناً رستم زماں ہوتے اگر وہ اکثر بیمار نہ رہا کرتے-

خلیفہ جی پیشے کے لحاظ سے حجام ہیں- ان کا اصل نام کرم دین ہے جو شاید ہی کوئی جانتا ہو مگر بطور خلیفہ جی انہیں لاہور کا ہر چھوٹا بڑا پہچانتا ہے- آج کل وہ "آرائش گیسو" کے نام سے اپنی دکان چلا رہے ہیں- ان کے ہاں ہر وقت گاہکوں اور خلیفہ جی کے پروانوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے- عالمی اور ملکی سیاست' عوامی مسائل' مذہب' معاشرہ' کمر توڑ مہنگائی اور

پنجابی اور اردو فلموں پر گرما گرم بحث ہوتی رہتی ہے۔ اور خلیفہ جی پورے جوش و خروش، وثوق اور اعتماد کے ساتھ جچے تلے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ خلیفہ جی میٹرک پاس ہیں۔ اردو اخبار بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں۔ ملکی اور عالمی سیاست میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور دنیا کے ہر موضوع پر بڑی فصاحت و بلاغت سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

خلیفہ جی بہت سی صفات کے مالک ہیں۔ مثلاً آپ ہر بڑے آدمی کی ہاں میں ہاں ملانا فریضہ اول خیال کرتے ہیں کیوں کہ وہ کسی کی دل آزاری یا دل شکنی کبھی نہیں کرتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ خلیفہ جی ایک بات کی سخت مخالفت میں بول رہے ہیں۔ اتنے میں کوئی امیر کبیر آدمی یا کوئی نامی گرامی رجسٹرڈ غنڈہ وہاں پہنچ گیا اور اپنی رائے اس بات کے حق میں دے دی تو خلیفہ جی وہیں سے الٹا گیئر لگا کر حمایت میں بولنے لگیں گے اور ایسے ایسے دلائل دینے شروع کر دیں گے کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رہ جائیں گے ایک دفعہ میری موجودگی میں ایسا ہوا۔ میں نے خلیفہ جی سے علیحدگی میں پوچھ ہی لیا کہ یہ کیا چکر ہے۔ ایک ہی بات کی سخت مخالفت اور کبھی بے حد تعریف۔ خلیفہ جی مسکرا دیئے اور مجھے یہ لطیفہ سنانے لگے:

ایک دن اکبر بادشاہ اپنے نو رتنوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ کدو موضوع سخن تھا۔ اکبر بادشاہ کہنے لگے کہ کدو اچھی سبزی ہے۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے بیربل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "جہاں پناہ۔ کدو تو سبزیوں کی شہنشاہ سبزی ہے۔ یہی سبزی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھی۔ کدو سینکڑوں دوائیوں میں استعمال ہوتا ہے اور بے شمار بیماریوں کا تیر بہدف علاج ہے۔ آنکھیں خراب ہوں تو کدو کا پانی ان میں ڈالیں منٹوں میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ اگر انسان کے جسم میں تلخی یا گرمی پیدا ہو جائے تو پاؤں کے تلوؤں پر کدو کاٹ کر رگڑیں، تلخی یا گرمی فوراً" کافور ہو جائے گی۔ دال یا گوشت میں ڈال کر سالن بنائیں۔ حلوہ یا رائیتہ تیار کریں۔ ہر حالت میں لطف دے گا۔ پھر یہ واحد سبزی ہے جس کا کدو کش ہو سکتا ہے۔"

یہ سن کر اکبر بادشاہ فرمانے لگے۔۔۔۔ "لیکن کدو مجھے پسند نہیں۔" اس پر بیربل کہنے لگے۔۔۔۔ "بجا ارشاد عالم پناہ۔ کدو کوئی کھانے والی چیز تھوڑے ہی ہے۔ انتہائی بدذائقہ سبزی ہے۔ اسے کون کھاتا ہے۔ اگر گوشت میں ڈالیں تو گوشت کا ذائقہ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ حلوہ بنائیں تو چینی اور گھی بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ اسے تو غربا اور مساکین بیچارے بھی

مجبوراً" کھاتے ہیں۔ دراصل کدو تو بطور دوا ہی استعمال ہوتا ہے۔

بیربل کے منہ سے یہ سب کچھ سن کر ملا دو پیازہ کہنے لگے۔۔۔۔ "بک اپ چمچے۔ بک اپ۔ تم بھی کیسے عجیب جانور ہو۔ ابھی کدو کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے تھے اور جب جہاں پناہ نے کدو کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو تم نے بھی کدو میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔"

بیربل نے برجستہ جواب دیا۔۔۔۔ "میں جہاں پناہ کا ملازم ہوں۔ کدو کا نہیں۔"

خلیفہ جی کہنے لگے۔۔۔۔ "مجھے اللہ تعالیٰ روزی جن لوگوں کی معرفت دیتا ہے، انہیں میں کیوں ناراض کروں۔ پھر ویسے بھی میں کسی کی دل آزاری نہیں کر سکتا۔"

انتخابات کے زمانے میں جس امیدوار کے حمایتی یا اسپورٹر خلیفہ جی کے پاس آئیں گے، خلیفہ جی اسی امیدوار کے حق میں بولیں گے۔ اسی کی مدح سرائی کریں گے۔ اور اس کے مد مقابل حریف میں ہزاروں کیڑے ڈالیں گے۔ انتخابات ختم ہونے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ خلیفہ جی نے ووٹ کس امیدوار کو دیا تھا۔

خلیفہ جی ایک ماہر حجام ہیں۔ بال تراشنے، شیو اور خط بنانے میں ان کا ثانی نہیں ملتا۔ وہ خود کہا کرتے ہیں کہ بال کاٹنا ایک آرٹ ہے جس طرح منجھا ہوا آرٹسٹ تصویر بناتے وقت فن کی باریکیوں میں ڈوب کر کوئی اچھوتی اور منہ بولتی تصویر بناتا ہے، وہ بھی اسی طرح انسان کو ایک نیا روپ اور نیا سر عطا کرتے ہیں۔۔۔۔ وہ اپنے پیشے کے کسی دوسرے حجام کو فن کار یا آرٹسٹ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ خلیفہ جی صرف چیدہ چیدہ گاہکوں کی حجامت بناتے ہیں۔ عام لوگوں کو تو ان کی دوکان کے اندر داخل ہونے کی جرات بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ پاکستانی لوگوں کو بال کٹوانے کا سلیقہ یا شعور ہی نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں وہ انگریز قوم کی بہت تعریف کرتے ہیں، جن سے ان کا واسطہ قریباً اٹھارہ سال تک رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران خلیفہ جی نوجوانی ہی میں بیماری اور پہلوانی دونوں کو چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ وہاں وہ اپنی رجمنٹ کے انگریز افسروں کی حجامت اور شیو بناتے رہے ہیں۔ وہ خود ہی بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ علی الصبح انگریز جرنیلوں اور کرنیلوں کی شیو پلنگ پر سوتے میں بنا دیتے تھے۔ جگانا تو درکنار خلیفہ جی انہیں پتہ بھی نہ چلنے دیتے اور شیو بنا کر واپس آ جاتے تھے۔ انگریز افسران خلیفہ جی کی انہی خوبیوں کی بدولت ان پر جان چھڑکتے تھے اور انہیں بے شمار تحائف اور بھاری رقموں سے نوازتے رہتے تھے۔ انگریز

عورتیں تو خاص طور پر خلیفہ جی پر فدا تھیں- اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ ان کے خاوندوں نے خلیفہ جی کے علاوہ کسی اور سے حجامت بنوائی ہے تو وہ ان سے بول چال بند کر دیتی تھیں-

خلیفہ جی کو اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ ویول کے ہیڈ بٹلر اور چیف باورچی کی شیو بنانے کا بھی اعزاز حاصل ہے- ہیڈ بٹلر نے تو خلیفہ جی کے کام سے خوش ہو کر لارڈ ویول کی عطا کردہ جرسی بھی انہیں انعام میں دی تھی- دوسری جنگ عظیم کے دوران خلیفہ جی بتاتے ہیں کہ وہ اگلے مورچوں کی خندقوں میں جا کر پوزیشنوں میں لیٹے ہوئے دس دس فوجی گوروں کی شیو ایک ہی وقت میں بنا آتے تھے-

ایک مرتبہ خلیفہ جی اندھیرے میں برما فرنٹ پر غلطی سے دشمن کے مورچوں میں چلے گئے تھے- وہاں سات جاپانیوں کی شیو بنا کر لوٹے- شیو بناتے وقت خلیفہ جی کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا تو وہ اپنی ذہانت اور بلند حوصلے کے بل بوتے پر انہیں چکر دے کر کھسک آئے- واپس آ کر خلیفہ جی نے اپنے افسروں کو جاپانیوں کی پوزیشنوں اور نقل و حرکت سے آگاہ کر دیا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے وہ محاذ چند گھنٹوں میں فتح کر لیا- خلیفہ جی کو ایسا شاندار کارنامہ انجام دینے پر ترقی اور سونے کا تمغہ بھی ملا تھا- جو انہوں نے تڑوا کر اپنی بیوی کی بالیاں بنوا دی تھیں- خلیفہ جی اکثر کہا کرتے ہیں کہ انگریز تو فنکار کا عاشق ہوتا ہے مگر پاکستانی فوجی افسر تو آرٹسٹوں کی مطلق پروا نہیں کرتے- اسی لئے تو انہوں نے انگریزوں کے ہندوستان اور پاکستان سے کوچ کے بعد فوجی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تھا-

اگر کوئی شخص خلیفہ جی کو نائی' حجام یا راجہ جی کہہ دے تو اس کی خیر نہیں- خلیفہ جی فوراً طیش میں آ جاتے ہیں اور ایسا کہنے والے کو اپنی دوکان سے نکال دیتے ہیں- یہی وجہ ہے خلیفہ جی آج تک مقامی باربر ایسوسی ایشن کے رکن تک نہیں بنے- حالانکہ ممبران ایسوسی ایشن انہیں اپنا صدر بنانے کو تیار تھے- یہ الگ بات ہے کہ ایسوسی ایشن نے جب بال کاٹنے' شیو اور خط بنانے کے ریٹ بڑھائے تھے تو خلیفہ جی نے بھی ان کی تائید میں ریٹ بڑھا دیئے تھے- خلیفہ جی ایسے القابات سننا اپنے آرٹ کی توہین خیال کرتے ہیں- اسی عادت کی بدولت وہ ایک دن حوالات میں بھی گزار آئے ہیں- ہوا یوں کہ خلیفہ جی اپنے سیلون میں چند دوستوں کے ساتھ کسی سیاسی لیڈر کے بیان پر تبصرہ کر رہے تھے کہ ایک سب انسپکٹر پولیس شیو بنوانے آ گیا ..... تھانیدار نے اندر آ کر دریافت کیا..... "حجام کہاں ہے؟"

یہ سننا تھا کہ خلیفہ جی غصے سے تلملا اٹھے- اور کہنے لگے---- "حجام فوت ہو گیا ہے اور ہم اس کے قل پر بیٹھے ہیں-" تھانیدار یہ توہین آمیز سلوک برداشت نہ کر سکا اور خلیفہ جی کو پکڑ کر تھانے لے گیا اور حوالات میں بند کر دیا---- اگلے روز دوستوں نے خلیفہ جی کو رہائی دلوائی-

خلیفہ جی کو اکثر یہ شکوہ رہتا ہے کہ ان کے پاس کوئی شاگرد نہیں ٹکتا- حالانکہ وہ اچھی تنخواہ بھی دیتے ہیں اور ناز بھی اٹھاتے ہیں- ان کا کہنا ہے کہ شاگردوں کے ساتھ جتنا اچھا وہ سلوک کرتے ہیں- شاید ہی کوئی استاد کرتا ہو- اس کے باوجود ان کے پاس کوئی شاگرد ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ نہیں رہا- جب خلیفہ جی سے پوچھا گیا کہ شاگرد کو وہ کتنی تنخواہ دیتے ہیں تو وہ کہنے لگے' ایک سو پانچ روپے- ہم نے حیرت سے کہا کہ اتنی زیادہ تنخواہ شاگردوں کو کون دیتا ہے- خلیفہ جی نے جواب دیا- "ستر روپے کھانے اور کپڑے کے اور تیس روپے رہائش کے کاٹ کر پانچ روپے نقد دیتا ہوں- اور انہیں کیا چاہئے؟"

ایک دن خلیفہ جی چائے نوش فرما رہے تھے کہ ایک گاہک شیو بنوانے آ گیا- خلیفہ جی نے اپنے شاگرد لڑکے سے کہا کہ گاہک کی داڑھی پر صابن لگاؤ- میں اتنی دیر میں چائے پی لوں- شاگرد برش کو صابن لگا کر گاہک کی داڑھی پر لاپروائی سے پھیرنے لگا- خلیفہ جی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے عینک کے اوپر سے دیکھا کہ شاگرد نے صابن سے بھرا ہوا برش گاہک کی آنکھ میں گھسیڑ دیا ہے- وہ تاؤ کھا کر اٹھے اور انتہائی غصے کے عالم میں ایک تھپڑ شاگرد کو رسید کیا- شاگرد تو ڈر کر ایک طرف ہو گیا اور تھپڑ پورے زور کے ساتھ گاہک کے گال پر لگا- خلیفہ جی انتہائی شرمندگی کی حالت میں گاہک سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے- پھر شاگرد کو ایک طرف بلا وجہ ہٹنے اور تھپڑ نہ کھانے کے جرم میں گالیاں دیتے ہوئے ملازمت سے برطرف کر دیا-

گرمیوں کی ایک دوپہر کو خلیفہ جی ایک گاہک کی حجامت بنا رہے تھے کہ بجلی بند ہو گئی- انہوں نے شدید گرمی اور گھٹن کی وجہ سے گاہک کی حجامت کا کام بجلی آنے تک ملتوی کر دیا- گاہک بھی گرمی سے عاجز آ کر دوکان کے باہر لکڑی کے تختے پر بیٹھ کر بجلی کا انتظار کرنے لگا- خلیفہ جی جو سیلون کے اندر پسینے سے شرابور اور گرمی سے بے حال ہو رہے تھے- کہنے لگے کہ انگریز بھی اسی نامراد گرمی کے ہاتھوں یہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے- اگر انگریز قوم اتنی سخت گرمی برداشت کر سکتی تو وہ ہندوستان اور پاکستان کو کبھی آزاد نہ کرتی- آدھے

گھنٹے کے بعد بجلی آئی- خلیفہ جی اس گاہک کو تلاش کرنے لگے جس کی آدھی حجامت بنا چکے تھے مگر وہ کہیں نظر نہ آیا- خلیفہ جی بیزار ہو کر کہنے لگے- "پتہ نہیں وہ الو کا پٹھا کہاں چلا گیا-" یہ الفاظ گاہک نے بھی سن لئے- تو اس نے اندر آ کر کہا---- "خلیفہ جی گالیاں کیوں دیتے ہو- میں کوئی تمہارے پیسے لے کر تو نہیں بھاگ رہا-" اس پر خلیفہ جی کہنے لگے- "توبہ توبہ بھائی- میں تو اپنے بھانجے کے متعلق کہہ رہا تھا-"

آج کل کی نئی نسل میں جو بال بڑھانے اور حجامت نہ کروانے کا رجحان بڑھ رہا ہے' خلیفہ جی اس کے سخت مخالف ہیں- وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ نیا فیشن اخلاقی بے راہروی اور جنسی آزادی کا نشان ہے جس کو صرف مادر پدر آزاد لڑکے اپنا کر اپنا مستقبل اور عاقبت خراب کر رہے ہیں- اگر کوئی ایسا نوجوان خلیفہ جی سے شیو کروانے آ جائے تو خلیفہ جی اس کی حجامت مفت بنانے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر شیو نہیں بناتے- وہ لڑکیوں کے بال کٹوانے کے بھی سخت خلاف ہیں- بلکہ اسے گناہ کبیرہ خیال کرتے ہیں- ان کا کہنا ہے کہ بال عورتوں اور لڑکیوں کی زینت ہوتے ہیں-

دوست اور عینک خلیفہ جی کی کمزوری ہیں- وہ بیوی بچوں' رشتہ داروں اور کھانے پینے کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں مگر کیا مجال کہ اپنی عینک اور دوستوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی جدا ہوں- عینک کے بغیر انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی حجامت وغیرہ بنا سکتے ہیں اور دوست ان کی زندگی کا سکون ہیں- ایک دفعہ ان کے چند بے تکلف دوستوں کو شرارت سوجھی- انہوں نے خلیفہ جی کی دعوت کر کے دھوکے سے انہیں بھنگ کھلا دی- خلیفہ جی کا ناتواں جسم اس نشے سے مانوس نہ تھا- بھنگ نے انہیں ہوا میں اڑانا شروع کر دیا- خلیفہ جی نے تبخیر معدہ کی شکایت خیال کرتے ہوئے پیدل چلنا شروع کر دیا- تازہ ہوا سے نشہ اور بڑھ گیا- اسی ترنگ میں آ کر انہوں نے پہلی مرتبہ انگریزوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں- پھر خدا جانے ان کے دماغ میں کیا بات سمائی کہ وہ سیدھے گھر چلے گئے اور دس منٹ کے بعد اپنی فوجی وردی اور ہیٹ پہن کر دوکان پر آ گئے-

خلیفہ جی کے دوست ان کا پیچھا کر رہے تھے' مبادا کوئی گڑبڑ ہو جائے- ایک بزرگ گاہک بال کٹوانے آ گئے- بھنگ کے نشے میں خلیفہ جی کو عینک لگانی یاد نہ رہی- وہ کنگھی اور قینچی لے کر کان کے اردگرد بال تراشنے لگے- گاہک نے چیخنا شروع کر دیا- کیونکہ خلیفہ جی بال کاٹنے کی بجائے گاہک کے کان کتر رہے تھے- باہر کھڑے دوست فوراً" شور سن کر دوکان

کے اندر آ گئے- خلیفہ جی غصے سے بلند آواز میں کہہ رہے تھے- "ہزار مرتبہ کہا ہے کہ ہماری دوکان پر بچوں کا داخلہ ممنوع ہے- پھر پتہ نہیں بچے کیوں آ جاتے ہیں- قینچی دیکھ کر ہی چیخنے لگتے ہیں-" دوستوں نے منت سماجت کر کے بزرگ گاہک کو راضی کیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا- دوستوں نے آئندہ ایسا سنگین مذاق کرنے سے توبہ کر لی-

خلیفہ جی ایک ہی وقت میں اسلام نواز بھی ہیں اور سیکولر ازم کے حامی بھی- سوشلسٹ بھی ہیں اور کمیونسٹ بھی- غرض جو وقت کا تقاضا ہو' وہ روپ دھار لیتے ہیں- جنگ دسمبر سے پہلے وہ کٹر روس نواز تھے- اور برطانیہ کے پروانے' مگر جنگ کے بعد وہ چین اور امریکہ کے شیدائی ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ان دو بڑے ملکوں کی امداد کے بغیر ہمارا زندہ رہنا محال ہو گیا ہے- حکومت وقت کے وہ ہمیشہ ہی مداح ہوتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت پر ہر وقت کی نکتہ چینی ملکی خوش حالی کے منافی ہے- خلیفہ جی کے خیال میں عوام کا کوئی کردار نہیں- وہ اکثر کہتے ہیں کہ عوام اچھے ہوتے تو پھر کس بات کا دکھ تھا- پاکستان اگر دو ٹکڑے ہوا ہے تو اس کا سبب غیر ملکی سازشوں کے علاوہ عوام کا گھناؤنا کردار بھی ہے- اور اب اگر ملک کی کوئی مزید بربادی ہوئی تو اس کی سو فیصد ذمہ داری بھی عوام پر ہی ہو گی- عوام جب خود ہی ایک دوسرے سے نفرت کریں اور ایک دوسرے کو دیکھنا پسند نہ کریں تو دوسروں کو کیوں مورد الزام ٹھہرایا جائے-

عوام اپنے حقوق نہیں پہچانتے' اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتے- خلیفہ جی سیاسی لیڈروں اور مذہبی راہنماؤں کے بھی سخت مخالف ہیں- ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ عوام کے کردار کی تعمیر اور اصلاح کرنے کی بجائے ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے ہیں- انہیں قوم یا ملک سے کوئی ہمدردی نہیں- اکثر ایسی باتیں کرتے ہوئے خلیفہ جی کا دل بھر آتا ہے- خلیفہ جی خود ہی کہتے ہیں کہ بابائے قوم حضرت قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ ہمیں تین سنہری اصول دے گئے تھے---- "یقین محکم' اتحاد اور تنظیم" ---- ایوب خانی دور میں یقین محکم جاتا رہا- پھر یحییٰ خان کے وقت اتحاد ختم ہو گیا اور اب عوامی راج میں عوام نے خود تنظیم کو بھی دفن کر دیا ہے---- اس قوم کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے' جس کا کوئی ذاتی نظریہ یا اصول ہی نہ ہو-

خلیفہ جی راگ رنگ کے بھی بڑے رسیا ہوا کرتے تھے- وہ کئی برس بڑے بڑے استادوں اور ماہر گانے والوں کی پرلطف محفلوں میں بیٹھ کر اپنے شوق کی تسکین کرتے رہے

ہیں- خلیفہ جی کو پکے گانوں اور راگوں کی خاصی سوجھ بوجھ ہے- وہ جن موسیقی کے شہنشاہوں اور ملک کے نامی گرامی استادوں کی رنگین محفلوں کو رونق بخشتے رہے ہیں' ان میں سے استاد بڑے غلام علی خان' چھوٹے غلام علی خان' اختر علی خان' پیارے خان' برکت علی خان' امیر علی خان' امید علی خان' عاشق علی خان' بیبے خان' پنڈت پٹوردھن' شنکر راؤ' نرائن راؤ دیاس' مچھر خان اور طبلہ نواز استاد قادر بخش خاص طور پر قابل ذکر ہیں-

مشہور گانے والیوں میں گولی' نابھ' اختری بائی فیض آبادی' عنایت بائی ڈیرو والی اور مختار بیگم کے خلیفہ جی سچے پروانے ہوا کرتے تھے اور ان کی جادو بھری شیریں آوازیں خلیفہ جی کو بے خود بنا دیا کرتی تھیں- یہ عشق کی انتہا تھی کہ خلیفہ جی پر راگ اور پکا گانا سیکھنے کا جنون طاری ہو گیا- اللہ بھلا کرے استاد برکت علی خان صاحب کا جنہوں نے خلیفہ جی کی آواز سن کر انہیں مشورہ دیا تھا کہ آپ گانا اور راگ صرف سننے پر ہی اکتفا کریں تو بہتر ہے- اس نصیحت کے بعد خلیفہ جی نے راگ اور پکا گانا سیکھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا- یہ نصیحت خلیفہ جی کی ذات کے لئے بھی بہتر ہی ثابت ہوئی-

نو نقد نہ تیرہ ادھار

قرض یا ادھار لینا ایک قدیم رسم ہے- زمانہ قبل از مسیح میں یہودی قوم کو اس معاملے میں مکمل اجارہ داری حاصل تھی- ان کے سارے کاروبار کا انحصار سود پر قرض دینے پر تھا- ان کی یہ اجارہ داری آج تک قائم ہے-

قرآن پاک میں بھی جہاں نماز قائم کرنے اور زکواۃ دینے کو کہا گیا ہے وہاں قرض حسنہ دینے کے متعلق بھی ارشاد فرمایا گیا ہے- یہ الگ بات ہے کہ عادی مقروض قرض حسنہ کا مطلب ہی اور نکالتے ہیں- مثلاً ہمارے ایک کرم فرما جو قرض حاصل کرنا جزو ایمان خیال کرتے ہیں' ان سے پوچھا گیا---- "حضرت قرض حسنہ کا کیا مطلب ہے؟" آپ فرمانے لگے- "جب کوئی قرض خواہ قرض واپس مانگنے آئے تو ہنس دو-"

ہماری روزمرہ کی کاروباری اور نجی زندگی میں ادھار کا لین دین ایک ناقابل تردید حقیقت قرار پا چکا ہے- کوئی کاروباری یا تجارتی ادارہ ادھار لینے اور دینے کے بغیر چل ہی نہیں سکتا بلکہ بنک اور کوآپریٹو سوسائٹیاں تو اسی مقصد کے لئے معرض وجود میں آئی ہیں کہ وہ اداروں اور عوام کو کاروبار کے آغاز' توسیع اور دیگر ضروریات کے لئے قرض دیں- اسی طرح بے شمار کمپنیاں' کارپوریشنیں اور ادارے عوام کی سہولت کے لئے رہائشی مکان' پلاٹ اراضی' سلائی اور کڑھائی کی مشینیں' ریفریجریٹر' ریڈیو' ٹیلی ویژن' گھریلو فرنیچر اور ہزاروں دیگر چیزیں آسان اقساط پر ادھار دیتے ہیں- یہ سلسلہ یہاں نہیں بلکہ دنیا کے تمام مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی رائج ہے- ہمارے ہاں البتہ نقد سودا ادھار کے مقابلے میں اکثر ارزاں ملتا ہے-

ادھار لینا تو تقریباً سبھی لوگ صدق دلی سے پسند کرتے ہیں' مگر ادھار دینے سے لوگ کتراتے ہیں..... ادھار کی واپسی اکثر مشکل اور بعض حالات میں ناممکن ہوتی ہے- کم سرمایہ والے غریب دوکاندار تو بعض مرتبہ ادھار دے دے کر اپنا کاروبار ہی ٹھپ کر لیتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ بہت سارے دوکانداروں نے اپنی دکانوں کے دروازوں پر کئی دلچسپ فقرے جلی

حروف میں چھپوا کر یا خود لکھ کر آویزاں کئے ہوتے ہیں مثلاً :

نو نقد نہ تیرہ ادھار۔

ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں۔

ادھار محبت کی قینچی ہے۔

آج نقد کل ادھار۔

ادھار لینے والے آج معاف فرمائیں۔

نقد بڑے شوق سے' ادھار اگلے چوک سے۔

آج سے ادھار بند ہے۔

براہ کرم ادھار لینے والے پریشان نہ کریں۔

اس قسم کے سخت اور قابل نفرت فقرے آویزاں کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ اس دوکان سے ادھار نہیں مل سکتا۔ بلکہ یقین کیجئے کہ انہیں ادھار دینا ہی پڑتا ہے اور اگر وہ ادھار سودا نہ دیں تو ان کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ بعض متمول اور پکے گاہکوں کو وہ زبردستی ادھار سودا دے دیتے ہیں۔ اگر گاہک نقد رقم ادا بھی کرنا چاہے تو وہ اصرار کرتے ہیں۔۔۔۔ "کوئی بات نہیں چوہدری صاحب! پیسے آ جائیں گے۔ یہ رقم تو ہماری جیب میں ہے۔"

بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔ اگر کسی دوست یا رشتہ دار سے پیچھا چھڑانا مطلوب ہو تو اسے ادھار دے دیں۔

ادھار لینے والوں میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو وعدہ کے مطابق ادھار لوٹا دیتے ہیں مگر ایسے لوگوں کی بہتات ہے جنہیں ادھار لے کر واپس کرنا ہی یاد نہیں رہتا۔ اکثر لوگ تو پنجابی کے اس مقولے پر عمل کرتے ہیں۔

لینا اپنا لے لیئے تے دینا لیئے دب
ڈھیٹ بن کے بہ رہئے جو کرے سو رب

کئی لوگوں نے تو قسم کھا رکھی ہوتی ہے کہ نقد پیسے دے کر سودا نہیں خریدنا۔ وہ ادھار لینے میں اس قدر ماہر ہوتے ہیں کہ اجنبی دکاندار سے بھی ادھار سودا لے آتے ہیں۔ دوکاندار کو جرات نہیں ہوتی کہ وہ انہیں ادھار دینے سے انکار کر سکے۔ اس طرح کے مشاق ادھار لینے والوں میں گجرات کی ایک فیکٹری کے منشی ہیں۔ منشی صاحب ہزاروں کا مال روزانہ

خریدتے ہیں مگر کیا مجال کہ وہ جیب میں ایک پیسہ بھی ڈال کر بازار جاتے ہوں سودا خریدتے وقت وہ اس قسم کی گفتگو کریں گے کہ دوکاندار "لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" کے مصداق پوری دوکان ہی ادھار دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ منشی صاحب کارخانے کے لئے بازار سے مختلف اشیاء خریدنے گئے۔ مالک کارخانہ نے منشی صاحب کی مرضی کے خلاف زبردستی دس روپے جیب میں ڈال دیئے' مبادا کہیں ضرورت پڑ جائے۔ منشی صاحب تین گھنٹے بعد معہ ڈھائی سو روپے کے خرید کردہ سامان کے واپس تشریف لائے اور مالک کو مبلغ سوا نو روپے لوٹا دیئے۔ منشی صاحب اس روز خاصے رنجیدہ دکھائی دیتے تھے کیونکہ انہیں پچھتر پیسے اس مزدور کو دینے پڑ گئے تھے جو سامان اٹھا کر لایا تھا۔ یہ رقم ڈیڑھ گھنٹے کے تکرار کے بعد منشی صاحب کو بہ امر مجبوری ادا کرنا پڑی کیونکہ مزدور کسی صورت میں ادھار کرنے پر راضی نہ ہوا۔ احمق مزدور کو اس کی ناجائز ضد کی وجہ سے پچیس پیسے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ کیونکہ ایک روپیہ طے شدہ مزدوری کی بجائے اسے پچھتر پیسے ہی نقد مل سکے۔

بعض لوگ ادھار تو لے لیتے ہیں' پھر قرض خواہ کے خوف سے اس طرف جانے سے گھبراتے ہیں۔ ایک شخص اپنے کسی دوست سے کہنے لگا۔۔۔۔ "چلو یار' ذرا سبزی منڈی تک ہو آئیں"۔۔۔۔ دوست نے جواب دیا۔۔۔۔ "یار تمہارے لئے جان بھی حاضر ہے مگر میں ادھر نہیں جاؤں گا کیونکہ وہاں میں نے کالو حلوائی کی چونی دینی ہے' وہ ظالم کا بچہ دو دفعہ پہلے میری ٹوپی اتار چکا ہے۔"

ادھار حاصل کرنے کے لئے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ انہیں کسی قسم کی ایکٹنگ کرنی پڑتی ہے۔ نئی نئی کہانیاں بنا کر سنانی پڑتی ہیں۔ مختلف حیلے اور بہانے تراش کر اپنی ضرورت سمجھانا پڑتی ہے۔ قرض دینے والے کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے مدح سرائی اور مسکا بازی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہمارے ایک مہربان جو اس فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں' آج سے تیس برس پہلے گرمیوں میں ململ کی باریک قمیض پہن کر اس کی سامنے والی جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ رکھ لیتے تھے۔ پھر وہ موچی سے جوتا پالش کروا کر اسے سو روپے کا نوٹ دکھاتے ہوئے کہتے تھے۔۔۔۔ "بقایا پیسے دے دو۔" غریب موچی سو کا نوٹ دیکھ کر بوکھلا جاتا اور مجبوراً" ایک آنہ پالش کی اجرت کا ادھار کر لیتا۔ اس طرح یہ صاحب پان' سگریٹ' ماچس' نمک' آٹا' تیل اور دیگر ضروریات زندگی ادھار حاصل کر لیتے تھے۔ چند ماہ بعد تمام دوکانداروں نے ایکا کر کے ان حضرات کو پکڑ لیا اور اپنی اپنی رقموں کا تقاضا کیا۔

انہوں نے پھر سو کا نوٹ دکھایا تو ایک دکاندار نے جلدی سے نوٹ جھپٹ لیا۔ جب نوٹ دیکھا تو وہ ایک آنے والا نمائشی نوٹ تھا جو ننھے بچوں کی دلچسپی کے لئے بازار سے عام دستیاب تھے۔

ایک صاحب اپنے ساتھ چیک بک لئے پھرتے تھے۔ وہ جہاں سے سودا خرید کرتے فوراً" چیک بک نکال لیتے۔ دکاندار نقد رقم کا تقاضا کرتا تو وہ اگلے روز نقد رقم ادا کرنے کا وعدہ کر کے چل دیتے' اس طرح قرض کی رقم اور قرض خواہوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ کئی ماہ بعد بھی قرض خواہوں کو اپنی رقموں کے عوض چیک ہی ملے۔ جب وہ مذکورہ بنک سے چیک کیش کروانے گئے تو انہیں پتہ چلا کہ ان حضرات کا بنک میں اکاؤنٹ ہی نہیں اور وہ جعلی چیک بک کہیں سے اڑا کر تمام لوگوں کو الو بناتے رہے تھے۔

میرے ایک جاننے والے ہفتے کے روز' بعد دوپہر میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے---- "مجھے سوموار کی صبح مکان کی رجسٹری کروانی ہے۔ سترہ سو روپیہ کم ہے۔ آج بینک بند ہو گیا ہے۔ کل اتوار ہے۔ اس لئے سوموار سے پہلے میں یہ رقم اپنے اکاؤنٹ سے نہیں نکلوا سکتا۔ براہ کرم مجھے سترہ سو روپیہ دو روز کے لئے ادھار دے دیں' سوموار کو بنک سے نکلوا کر واپس کر دوں گا۔"

میں نے انہیں کہا---- "رجسٹریاں تو دو بجے دوپہر کو تصدیق ہوتی ہیں۔ آپ سوموار کو صبح کو بنک سے رقم نکلوا کر بڑی آسانی سے وقت پر ادا کر سکتے ہیں۔" وہ کہنے لگے---- "بائع (مکان بیچنے والا) سوموار کو چھ ماہ کے لئے ہانگ کانگ جا رہا ہے۔ اس نے رجسٹرار صاحب سے منت خوشامد کر کے تصدیق رجسٹری کے لئے صبح آٹھ بجے کا وقت لے لیا ہے۔" یہ سن کر میں نے عرض کی---- "میرے پاس بھی اتنی رقم نہیں ہے۔ مجھے بھی بنک سے ہی نکلوانی پڑے گی۔ اس لئے میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے مجھے کسی اور دوست سے قرض لے کر انہیں یہ رقم فراہم کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ جسے میں نے بڑی خوش اسلوبی سے رد کر دیا۔ ناچار انہیں مایوس ہی لوٹنا پڑا۔ میری حیرانگی کی حد نہ رہی جب وہ سوموار کو نو بجے پھر میرے پاس آ گئے اور فرمانے لگے---- "بائع کو ہانگ کانگ کی روانگی بچے کی بیماری کی وجہ سے ملتوی کرنی پڑ گئی ہے اس لئے اب رجسٹری کل ہو گی۔ بنک کا اکاؤنٹ چونکہ میرا لڑکا اوپریٹ کرتا ہے اور وہ تین روز کے لئے سرگودھا گیا ہوا ہے۔ اس لئے آپ ازراہ عنایت سترہ سو روپیہ بطور قرض بنک سے

نکلوا کر دے دیں۔ میں لڑکے کے واپس آتے ہی آپ کی رقم لوٹا دوں گا۔"

اب میری سمجھ میں سارا چکر آ گیا تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ کل صبح میں آپ کے ساتھ کچہری چلا چلوں گا اور سترہ سو روپیہ بائع کو روبرو رجسٹرار ادا کر کے آپ کی رجسٹری تصدیق کروا دوں گا۔ میرا خلاف توقع جواب انہیں بالکل پسند نہ آیا۔ وہ کچھ پریشان سے ہو گئے اور پھر مرجھایا ہوا چہرہ لے کر چلے گئے۔ اگلے روز وہ حسب توقع تشریف ہی نہ لائے۔ شاید رجسٹری کا محض بہانہ تھا یا شاید بائع ہی فوت ہو گیا ہو گا۔

کئی حضرات جیب میں چیک ڈال کر اپنے دوستوں کے پاس چلے جاتے ہیں اور انہیں دس پندرہ روز بعد کی تاریخ کا چیک دے کر ادھار رقم حاصل کر لیتے ہیں پھر تاریخ آنے پر قرض خواہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ابھی تک رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ اس لئے چند روز مزید انتظار فرما لیں اور چیک بنک میں پیش نہ کریں پھر بعد میں وہ مقروض نظر ہی نہیں آتے۔

موجودہ دور میں دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک کا گزارہ ہی ادھار یا امداد پر حاصل کی گئی رقوم پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ممالک اپنے کسی بھی ترقی کے منصوبے کو ملکی ذرائع سے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ادھار دینے والے تمام ترقی یافتہ ممالک اپنی پسند کی پیشگی کڑی اور سخت شرائط منوائے بغیر ایک کوڑی بھی دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ضرورت مند ممالک اپنی غرض کے تحت ان شرائط پر قرضہ تو حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی آزادی' خود مختاری اور بین الاقوامی حیثیت کو ہمیشہ کے لئے کھو کر قرض دینے والے ممالک کے غلام حلیف بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بجٹ کا بھی بہت بڑا حصہ پچھلے کئی برسوں سے بیرونی امداد اور قرضوں پر حاصل کی جانے والی متوقع آمدنی کے سہارے ہی مرتب کیا جاتا ہے۔

ادھار لینے کی ضرورت تو حکومت' عوام' کارخانے دار' مزدور' افسر' کلرک' چپڑاسی' کاروباری اور تجارتی لوگ' دکاندار اور گاہک سبھی کو پڑتی ہے مگر کم آمدنی والے لوگ خاص طور پر اس مرض میں مبتلا ہیں۔ بعض لوگ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی بجائے بڑھ چڑھ کر خرچ کرتے ہیں یا پھر کثرت اولاد ان کی ضروریات کو بڑھا دیتی ہے۔ خصوصاً بچیوں کی شادی اور جہیز کا مسئلہ والدین کو بے بس اور مجبور بنا دیتا ہے۔ ایسے حالات میں لوگ ادھار کا سہارا لیتے ہیں۔ پھر وہ اس چنگل میں ایسے پھنستے ہیں کہ زندگی بھر فرار حاصل نہیں کر سکتے۔

ان میں زیادہ ستم رسیدہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی مجبوری کے تحت سود خور پٹھانوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ سود خور پٹھان اصل رقم قرضہ سے کئی گنا زیادہ رقم سود کی صورت میں جبراً" وصول کر لیتا ہے اور مقروض بیچارہ ذلت و رسوائی اور پریشانی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مقروض سود کی رقم ادا کرتے کرتے قبر تک جا پہنچتا ہے مگر قرضے کی رقم اس کے ذمے واجب الادا رہتی ہے۔ ایسے مقروضوں کا انجام بڑا عبرت ناک ہوتا ہے۔

ایک اجنبی دوکاندار سے ادھار حاصل کرنے کے لئے اکثر لوگ شروع شروع پیشگی پیسے ادا کر دیتے ہیں۔ جب وہ رقم سودے کی صورت میں ختم ہو جائے تو مزید پیشگی دے دیتے ہیں۔ چند دن تک دوکاندار کا اعتماد حاصل کر کے پھر ادھار لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوران گاہے بگاہے تھوڑی بہت رقم اس طرح ادا کرتے جاتے ہیں کہ ادھار کی رقم بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس طریقہ سے دوکاندار بے بس ہو کر ان کے بے رحم شکنجے میں پھنس جاتا ہے' اپنی پچھلی رقم کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے وہ مزید زیر بار ہو جاتا ہے اور ادھار کھانے والے اس کے مال پر عیش کرتے ہیں۔

بعض تجربہ کار اور ہوشیار ادھار لینے والے اپنے سادہ لوح شکار کو لالچ دے کر اپنے دام فریب میں ایسا پھانستے ہیں کہ وہ بیچارہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتا ہے۔ ایسے مکار مقروض ادھار پر حاصل ہونے والی رقم پر بہت زیادہ منافع یا سود دینے کی پیش کش کرتے ہیں۔ لالچی لوگ اس ناقابل یقین شرح منافع کے حصول کی ہوس میں اپنی تمام جمع شدہ پونجی مقروض کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر نفع تو نفع اصل رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

ادھار چونکہ آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے' اس لئے اکثر لوگ ادھار پر ہی اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جب عادی ہو جاتے ہیں تو وہ ادھار حاصل کرنے کے لئے ہر واقف کار اور جان پہچان والے کے آگے ہاتھ پھیلانے میں عار نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو ہر دفعہ نئے نئے ادھار دینے والوں کی تلاش رہتی ہے اور انہیں ایسی بیوقوف آسامیاں بھی مل جاتی ہیں جو ان کی ضروریات پوری کرتی رہتی ہیں۔

ادھار دینے والے کو اگر وعدے کے مطابق رقم لوٹا دی جائے تو اگلی مرتبہ وہ ادھار دینے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا اور پہلے سے کہیں زیادہ ادھار رقم دے دیتا ہے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض سمجھدار مقروض وعدے کے مطابق ادھار کی رقم لوٹا دیتے ہیں تاکہ ان کا اعتماد قائم رہے اور ریکارڈ بھی خراب نہ ہونے پائے۔ اپنا وعدہ پورا

کرنے کے لئے وہ حمید سے ادھار لے کر سعید کا قرضہ اتار دیں گے۔ پھر رشید سے قرض لے کر وہ حمید کی رقم لوٹائیں گے۔ پھر دوبارہ سعید سے رقم لے کر رشید کا ادھار اتاریں گے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ اس طرح ادھار کی رقم اور ان کا اعتماد دونوں پروان چڑھتے رہتے ہیں۔

بعض حالات میں ادھار دینے والا ادھار دینے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کے پاس ادھار دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً کئی شریف النفس افسر جو رشوت لینے سے گھبراتے ہیں' اپنے دفتر میں کسی کام کے سلسلے میں آنے والے لوگوں سے ادھار مانگ لیتے ہیں اور اتنی دیر تک ان کا کام نہیں کرتے جب تک ادھار کی رقم وہ وصول نہیں کر لیتے۔ ایسے لوگوں نے اگر اپنا کام کروانا ہو تو ادھار دینے سے انہیں انکار کرنے کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی۔ ادھار حاصل کرنے کا یہ یقینی نسخہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ایسا ادھار واجب الادا نہیں ہوتا۔

الیکشن میں حصہ لینے والے امیدوار اس معاملے میں بڑے مظلوم اور بدنصیب ہوتے ہیں۔ جوں جوں الیکشن کا دن قریب آتا ہے' توں توں ادھار مانگنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک طرف امیدوار بیچارے کو اپنی الیکشن مہم کے بارے میں خاصی تشویش ہوتی ہے' دوسری طرف اس کے اپنے حمایتی ورکر اور ووٹر مختلف بہانے بنا کر قرضے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے قرضہ کی مطلوبہ رقوم کی ادائیگی کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہوتا۔ ایسے ادا کردہ قرضوں کی واپسی کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جواری ادھار واپس لوٹانے میں بڑا قابل اعتماد ہوتا ہے۔ اگر جوئے میں ادھار کی رقم ہار جائے تو جواری اپنا گھربار بیچ کر بھی قرضہ اتارتا ہے مگر وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا۔ آج کل اکثر اجنبی لوگ دن کے وقت آتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ راولپنڈی یا لائل پور جا رہے تھے کہ راستے میں کسی نے جیب کاٹ لی ہے۔ اب کرایہ کے پیسے نہیں ہیں۔ آپ دس روپے ادھار دے دیں۔ گھر جاتے ہی یہ رقم بذریعہ منی آرڈر واپس کر دیں گے۔ اگر آپ اپنا آدمی ساتھ بھیج کر انہیں بس یا ٹرین میں ٹکٹ خرید کر بٹھانا چاہیں تو وہ خاموشی سے کھسک جائیں گے۔

کئی کاروبار ایسے ہیں جہاں ادھار بالکل نہیں چلتا۔ مثلاً سینما' ورائٹی شو' پہلوانوں کے دنگل' بس یا لاری کا سفر وغیرہ مگر ادھار لینے والوں کے کیا کہنے' وہ ان جگہوں پر بھی ادھار لے

آتے ہیں۔ میرے ایک محلے دار پچھلے ماہ ولائت کا چکر لگا کر آئے تھے۔ انہوں نے جہاز کے ٹکٹ سے لے کر شاپنگ اور رہائش وغیرہ تک سارے کا سارا خرچ ادھار ہی کیا تھا۔ ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ طوائفوں کے گانے بھی ادھار سن آتے ہیں۔

میرے ایک عزیز جو پہلے ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اور اب کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے۔۔۔۔ "بھیا' مجھے کوئی ایسا کاروبار بتائیں جس میں ادھار کا چکر نہ ہو۔" میں نے فوراً" تجویز پیش کر دی کہ سینما گھر بنا لیں۔ انہوں نے کہا کہ سینما بنانے کے لئے تو بہت زیادہ سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ میں نے ٹرانسپورٹ کے متعلق کہا تو وہ کہنے لگے کہ یہ ان کے بس کا روگ نہیں۔ پھر سوچ کر میں نے رائے دی کہ اگر کوشش کر کے ملکہ ترنم نور جہاں' مہدی حسن یا محمد رفیع کی آواز پیدا کر لیں تو اس کاروبار میں ادھار تو کیا سرمایہ کی بھی ضرورت نہ ہو گی۔

میرے ایک ملنے والے ادھار لینے کے شہنشاہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ ادھار حاصل کرنے کے فن میں بے حد ماہر ہیں۔ دوکاندار انہیں آتا دیکھ کر تہیہ کر لیتا ہے کہ آج ان سے سابقہ ادھار کی رقم ہر حالت میں وصول کر کے رہے گا۔ خواہ انہیں گریبان سے پکڑ کر بے عزت ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر قربان جائیں ان کی تحمل مزاجی اور بردباری پر کیا مجال جو طیش میں آئیں۔ دوکاندار انہیں برا بھلا کہتا ہوا' اپنی رقم کا تقاضا کرتا ہے اور وہ دوکاندار کے غلیظ بچے کو گود میں اٹھائے پیار کئے جا رہے ہیں۔ آخر پندرہ منٹ کی نٹ کھٹ کے بعد وہ اسی دوکاندار سے مزید ادھار لے کر چلے جاتے ہیں۔

ایک بخیل بزرگ حاجی صاحب کا واسطہ ایک مرتبہ کسی ڈھیٹ مقروض سے پڑ گیا۔ مقروض نے حاجی صاحب سے بیس روپے قرض مانگے۔ حاجی صاحب نے صاف جواب دے دیا۔ مقروض بضد تھا کہ وہ قرض لے کر ہی جائے گا مگر حاجی صاحب اسے بھگانے پر تلے بیٹھے تھے۔ جب مقروض کسی صورت بھی ٹلتا نظر نہ آیا تو حاجی صاحب نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ مقروض گالیاں سن کر بھی مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا اور بیس روپے قرض لینے پر مصر رہا۔ اس بیہودگی کے مظاہرے پر حاجی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے چھڑی سے اسے خوب پیٹا اور ملازموں کے ذریعے دھکے دے کر نکال دیا۔ مقروض چلا گیا تو حاجی صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد مقروض پولیس کے دو سپاہی ساتھ لے کر آ گیا۔ سپاہی حاجی صاحب کو تھانے لے گئے۔ وہاں کافی رد و کد کے بعد حاجی صاحب کو چالیس

روپے مقروض کو دے کر جان چھڑانی پڑی۔ جب مقروض نے چالیس روپے تھام لئے تو حاجی صاحب سے کہنے لگا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ ان میں بیس روپے ادھار کے ہیں اور بیس مار پٹائی اور گالیوں کے۔ باقی رہا آپ کو تھانے بلانے کا معاملہ تو وہ مجبوری تھی۔ اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔

ادھار کے چکر میں پھنسا ہوا شخص بہرحال پریشان ہی رہتا ہے۔ برصغیر کے نامور شاعر چچا غالب بھی اعتراف کر گئے ہیں۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پچھلے سال ایک پنجابی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ فلم میں ایک حسین و جمیل رقاصہ مٹک مٹک کر اور لہک لہک کر یہ گانا گا رہی تھی۔

پیار کر لے آجا پیار کر لے
پیسے نہیں اوں کول تے ادھار کر لے

اس دن پہلی مرتبہ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ پیار بھی کبھی کبھار ادھار مل سکتا ہے۔ بڑی تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دنیا کی ہر چیز ادھار مل سکتی ہے۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے۔ دریا کا پانی الٹا چل سکتا ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں حصے دوبارہ اکٹھے ہو سکتے ہیں مگر ادھار اس دنیا سے کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

○

انٹرویو ایک بھکاری کا

"حکایت" میں جناب عنایت اللہ صاحب کے قلمبند کئے ہوئے مختلف انٹرویو میری نظر سے گزرے تو مجھے اشتیاق ہوا کہ کسی شخصیت کا انٹرویو لوں اور قارئین کی خدمت میں پیش کر کے داد وصول کروں۔ میرے لئے اول تو یہ فن ہی نیا اور انوکھا تھا۔ دوسرے میری یہ خواہش تھی کہ میرا یہ انٹرویو اگرچہ عنایت اللہ صاحب کی طرح انتہائی دلچسپ' منفرد' مؤثر اور سبق آموز نہ بھی ہو تو اس میں یہ خوبی ضرور ہو کہ قارئین اسے پڑھ کر بوریت محسوس نہ کریں۔ علاوہ ازیں میں انٹرویو کے لئے ایسا کردار منتخب کرنا چاہتا تھا جو ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کر سکے یا یہ کردار ایسا ہو جس کا کبھی کسی نے انٹرویو نہ لیا ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لطیفہ میری نظر سے گزرا۔

ایک بھکاری نے کسی کے دروازے پر کھڑے ہو کر صدا لگائی۔

"بابا۔ خدا کے نام پر ایک روپیہ دے دو۔ اللہ تمہاری مشکلیں آسان کرے گا۔"

اندر سے آواز آئی۔ "معاف کرو بابا۔ ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔"

بھکاری نے کہا۔۔۔۔ "میاں روٹی ہی دے دو۔ بھوکا ہوں۔"

اندر کی آواز نے کہا۔۔۔۔ "روٹی نہیں ہے۔"

"تھوڑے سے چاول ہی دے دو۔"

"بابا چاول کہاں سے لائیں۔ جاؤ نہیں ہیں۔"

"تو مجھے ایک تھالی آٹے ہی کی دے دو۔"

"آٹا بھی ختم ہو چکا ہے۔"

"تو اس محتاج کو کوئی پھٹا پرانا کپڑا ہی دے دو۔"

"معاف کرو' بابا معاف کرو"۔۔۔۔ اندر کی آواز نے جھنجھلا کر کہا۔ "ادھر کوئی کپڑا بھی

نہیں۔"

تنگ آ کر بھکاری نے جواب دیا۔۔۔۔ "تو یہاں کس امید پر بیٹھے ہو۔ چلو میرے ساتھ اکٹھے بھیک مانگیں۔"

یہ لطیفہ پڑھتے ہی خیال گزرا' کیوں نہ کسی بھکاری کا انٹرویو لوں اور اس عجیب و غریب مگر دلچسپ پیشے کے اسرار و رموز سے اپنے پیارے قارئین کو روشناس کراؤں۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایسا تجربہ کار اور سمجھدار بھکاری کہاں تلاش کروں جس سے مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس کے لئے میرے ایک دوست بنک منیجر نے میری رہنمائی کی' اس کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ جب حکومت پاکستان نے پانچ سو اور سو سو روپے کے نوٹ منسوخ کئے تھے تو ایک بھکاری نے مبلغ اسی ہزار (80,000) روپے بنک میں جمع کروائے تھے۔ میں یہ سن کر پہلے تو سکتے میں آیا پھر خوشی سے جھوم اٹھا اور فوراً" سائیں قدرت اللہ کھچو سے انٹرویو لینے چل پڑا۔

سائیں جی کی جھگی ڈھونڈنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی' کیونکہ اس آبادی کے تمام لوگ سائیں جی کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ایک بچے نے سائیں صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دی تو سائیں جی باہر تشریف لے آئے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ ڈالا جیسے اندازہ کر رہے ہوں کہ میں کتنی مالیت کی آسامی ہوں۔ میں نے جب مدعا بیان کیا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔۔۔۔ "برخوردار انٹرویو تو بڑے لوگوں' افسروں' سیٹھوں یا سیاست دانوں کے لئے جاتے ہیں۔ مجھ غریب کا انٹرویو لے کر کیا کرو گے۔" مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ آپ بھی تو معاشرے کا ایک جزو لاینفک ہیں' لوگوں کو آپ کے پیشے کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ عوام آپ کے پیشے کے اسرار و رموز جاننا چاہتے ہیں تو وہ انٹرویو دینے پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اپنی جھگی کے باہر ہی چارپائی پر بٹھایا۔ پھر ایک بچے کو میرے لئے قریبی دوکان سے چائے لانے کے لئے بھیج دیا۔

سائیں قدرت اللہ کھچو ایک متمول بھکاری ہیں اور اس پیشے سے پچھلے اٹھائیس برس سے منسلک ہیں۔ آپ بڑے جہاندیدہ' زمانہ ساز اور ذہین شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنے فن میں بلا کے ماہر اور انتہائی کامیاب ہیں۔ بھکاریوں کی دنیا میں آپ خلیفہ یا پیر استاد مانے جاتے

ہیں- دوسرے تمام بھکاریوں کے لئے آپ مشعل راہ ہیں-

چائے پینے کے بعد میں نے سائیں جی کا انٹرویو لینا شروع کر دیا- آپ نے جس زندہ دلی' بے باکی اور بے تکلفی سے ان پوشیدہ مگر تلخ حقائق سے پردہ اٹھایا ہے' یہ ان کی عظمت کا بین ثبوت ہے- انٹرویو جس طرح سوال و جواب میں حاصل کیا گیا- اسی طرح آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں-

"آپ نے یہ پیشہ کب اختیار کیا تھا؟"

"یہی کوئی اٹھائیس برس پہلے-"

"آپ نے گداگری کا فن کہاں سے سیکھا؟"

"حجرے شاہ مقیم کے سید قلندر علی شاہ مرحوم میرے استاد تھے- آپ سرکار گداگروں کے شہنشاہ تھے- میں نے انہی کے مبارک قدموں کے طفیل فیض حاصل کیا تھا-"

"یہ ہنر سیکھنے کے لئے آپ کو کوئی فیس بھی ادا کرنی پڑی ہو گی؟"

"ہمارے ہاں دستور ہے کہ شاگرد دو سال تک جو کمائے اس میں سے تین حصے استاد کے ہوتے ہیں اور ایک حصہ شاگرد کا-"

"آپ روزانہ کس قدر کما لیتے ہیں؟"

"یہ تو اڈے اور علاقے پر منحصر ہے' اگر اڈہ یا علاقہ اچھا ہو تو روزانہ ساٹھ ستر روپے ہو جاتے ہیں' اگر عید' میلہ یا کوئی اور تہوار ہو تو تین چار سو روپیہ بھی بن جاتا ہے-"

"یہ اڈے اور علاقے کا کیا مطلب ہے؟"

"ہمارے ہاں مختلف علاقے بکتے ہیں اور ان کی نقد قیمت ادا کی جاتی ہے- پھر کوئی دوسرا فقیر یا گداگر اس علاقے میں بھیک نہیں مانگ سکتا-"

"ایک اچھا اڈہ یا علاقہ کس قیمت میں خریدا جا سکتا ہے؟"

"پانچ ہزار روپیہ سے لے کر پچاس ہزار روپیہ تک سالانہ-"

"کیا اتنی زیادہ رقم سال بھر ٹھیکیدار کو واپس وصول ہو جاتی ہے؟"

"یہ کچھ بھی نہیں' اگر ٹھیکیدار سمجھدار اور ہوشیار ہو تو وہ کئی گنا زیادہ کما لیتا ہے-"

"بھیک مانگنے کے لئے تو آپ کو مختلف بہروپ بھی بدلتے پڑتے ہوں گے- مثلاً اندھا'

لنگڑا اور کوڑھی وغیرہ-"

"جی ہاں اس کے لئے تو ہمیں چھ ماہ کی سخت ٹریننگ حاصل کرنی پڑتی ہے- آپ جانتے ہیں' جب تک بھیک دینے والے کی ہمدردی حاصل نہ کی جائے بھیک نہیں ملتی-"

"خیرات آسانی سے کون لوگ دیتے ہیں؟"

"عورتیں اکثر زیادہ رحمدل ہوتی ہیں- ان کا دل جلد ہی پسیج جاتا ہے- تماشبین طوائفوں کے سامنے' پیر مریدوں کی موجودگی میں' جواری جوا جیتنے پر' پڑھنے والے بچے امتحانوں کے دنوں میں' ملزموں کے لواحقین کچہری میں' خدا ترس لوگ مزاروں' خانقاہوں اور مسجدوں سے باہر نکلتے وقت اکثر خیرات دیتے ہیں-"

"آپ کے شاگرد بھی تو ہوں گے؟"

"اس وقت اللہ کے فضل و کرم سے سات ہیں-"

"کون لوگ آپ کی شاگردی کرتے ہیں؟"

"اکثر بے روزگار جو تلاش معاش سے عاجز آ جاتے ہیں' ہمارے پاس آتے ہیں-"

"شاگردوں کی معرفت آپ کو کس قدر ماہوار آمدنی ہو جاتی ہے؟"

"یہی کوئی تین چار ہزار روپیہ کے قریب لیکن آپ انکم ٹیکس والوں کو نہ بتا دیں-"

"آپ اس قدر رقم کا کیا کرتے ہیں؟"

"اتنی مہنگائی میں کیا بنتا ہے باؤ جی- کچھ بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ ہو جاتے ہیں جو بچ جاتا ہے اس کی کوئی جائیداد وغیرہ خرید لیتا ہوں-"

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"دو لڑکے اور ایک لڑکی اللہ تعالیٰ نے دی تھی مگر اب دو لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں اور ایک لڑکا-"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں-"

"نئے فیشن نے ان کی جون بدل دی ہے- لڑکوں نے بال بڑھا لئے ہیں اور لڑکیوں جیسا لباس پہنتے ہیں اور لڑکی نے بال کٹوا کر پتلون پہننی شروع کر دی ہے-"

"کیا آپ اپنی اولاد کو بھی یہ پیشہ سکھا رہے ہیں؟"

"نہیں صاحب لڑکی تو کنیرڈ کالج لاہور میں بی اے کر رہی ہے- بڑا لڑکا ولایت بیرسٹری کرنے گیا ہوا ہے- چھوٹا لڑکا اس سال جونیئر کیمبرج کر رہا ہے-"

"ابھی آپ نے جائداد کا ذکر کیا تھا- آپ نے کیا کیا جائیداد بنائی ہے؟"

"غریب آدمی نے کیا جائداد بنانی ہے باؤ جی- ایک کوٹھی گلبرگ میں خریدی تھی اور دو کوٹھیاں سمن آباد میں ہیں- اس کے علاوہ شاہ جمال میں ایک پلاوٹ خرید رکھا ہے-"

"اچھا سائیں جی یہ بتائیں کہ حکومت انسداد گداگری کی مہم کے سلسلے میں جو قانون بنا رہی ہے اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

"خود بھیک مانگنے والے دوسروں کو کیسے بھیک مانگنے سے روک سکتے ہیں پھر مسلمان حکومت ایسا ہرگز نہیں کر سکتی-"

"کیا مطلب؟"

علامہ اقبالؒ مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

"باؤ جی' حکومت کا اپنا گزارہ بھی تو بھیک پر ہی ہے- خواہ وہ امریکہ سے لے یا چین سے- دوسرے' اسلام میں زکوٰۃ' صدقات اور خیرات دینا اور لینا جائز اور لازمی قرار دیئے گئے ہیں- مسلمان حکومت اسلام کے خلاف کیسے جا سکتی ہے- اگر کوئی ایسا قدم اٹھایا گیا تو وہ خلاف شرع ہو گا- مذہب اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا-"

"لیکن یہ تو صرف غرباء مساکین اور دیگر مستحق لوگوں کے لئے ہوتا ہے- آپ اس طرح ان کا حق مارتے ہیں-"

"چھوڑیئے باؤ جی- کیا آپ کے خیال میں تمام لوگ جو زکوٰۃ' خیرات اور صدقات وصول کرتے ہیں' وہ مستحق ہوتے ہیں؟"

"بھیک مانگنا بہرحال ہمارے معاشرے میں بری نظر سے دیکھا جاتا ہے-"

"معاشرہ اچھی نظر سے کسے دیکھتا ہے؟ ہم پر دن رات تنقید کرنے والے خود بھی

گداگر ہیں- یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس کا نام چندہ یا عطیہ رکھ دیا ہے- آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ ہماری بہو بیٹیاں سر بازار ٹولیوں کی صورت میں ٹی بی' ریڈ کراس' اور کبھی مینا بازار کے نام پر چندہ وصول کرتی ہیں- اس وقت معاشرہ کیوں خاموش رہتا ہے؟"

"سائیں بابا' کیا آپ نے کبھی کسی پر رحم کھا کر خیرات دی ہے؟"

"خیرات لینے والے نے کیا خیرات دینی ہوتی ہے باؤ جی- ہاں البتہ جب میں گلبرگ والی کوٹھی کی رجسٹری کروانے گیا تھا تو رجسٹری والے بابو کو پچیس روپے خیرات دی تھی- بعض پولیس والے تو اکثر بھکاریوں سے جبراً" خیرات وصول کرتے رہتے ہیں-"

"آپ کو اپنی بھکاری زندگی میں آمدنی کے لحاظ سے سب سے زیادہ کون سی جگہ پسند آئی ہے؟"

"یوں تو کئی جگہیں ہیں جہاں خاصی آمدنی ہوتی ہے مگر مزار حضور داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ' میلہ چراغاں اور انارکلی کے بانو بازار کا جواب نہیں- ان جگہوں سے ہم لوگ جھولیاں اور جیبیں بھر کر واپس آتے ہیں-"

"سائیں جی- کیا آپ بھنگ' افیون چرس وغیرہ کا استعمال بھی کرتے ہیں؟"

"ہماری ڈیوٹی ذرا سخت قسم کی ہوتی ہے- ہمیں سخت سردی' گرمی' بارش' آندھی اور طوفان میں بھی گھر سے نکلنا ہوتا ہے- ہم جان بوجھ کر لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے سخت سردی میں بغیر کوئی موٹا کپڑا پہنے گیلی اور نمدار جگہ پر بیٹھتے ہیں اور سخت گرمی کی دوپہر کو دھوپ میں تپتے ہوئے تھڑوں پر بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں- ایسے حالات میں ان چیزوں کا استعمال پٹھوں کا تناؤ دور کر دیتا ہے اور دماغ کو سکون پہنچاتا ہے-"

"کیا آپ کبھی جیل بھی گئے ہیں؟"

"بھیک مانگنے کے لئے تو کبھی بھی جیل جانے کا اتفاق نہیں ہوا مگر بھیک مانگنے کے جرم میں تین چار مرتبہ جیل یاترا کر چکا ہوں-"

"آپ کو اپنی اولاد کی شادیوں کی بھی تو فکر ہو گی؟"

"نہیں جناب مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے- بڑے لڑکے نے ولائت میں ایک میم سے شادی کر لی ہے- لڑکی کے کئی دوست ہیں- وہ خود ہی پسند کی شادی کر لے گی- چھوٹا لڑکا تو

ایسے سکول میں ہے جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں- کوئی نہ کوئی چکر چلا ہی لے گا- رہا لڑکی کے جہیز کا سوال تو میں نے پہلے ہی بچوں کے نام کافی جائداد لگوا رکھی ہے اور مختلف بنکوں میں کافی رقم بھی ان کے نام پر جمع ہے- اس لئے میرے سامنے یہ کوئی مسئلہ نہیں-"

"سنا ہے جب حکومت پاکستان نے پانچ سو اور سو سو روپے کے کرنسی نوٹ منسوخ کئے تھے تو آپ نے مبلغ اسی ہزار روپے اپنے نام پر بنک میں جمع کروائے تھے-"

"جی ہاں یہ درست ہے-"

"آپ اتنی بڑی رقم بنک یا ڈاک خانہ کی بجائے گھر میں کیوں رکھتے ہیں؟"

"یاؤ جی- اپنی آمدنی کی رقم بنک یا ڈاک خانے میں اس لئے نہیں رکھتا تھا کہ انکم ٹیکس والوں کو پتہ نہ چل جائے مگر اب میں نے توبہ کر لی ہے کیونکہ میں نے چند جاننے والے شرفاء کے پاس پچاس ہزار روپے بطور امانت رکھے تھے جو وہ بھلے مانس واپس کرنے تو درکنار سرے سے امانت کی وصولی سے ہی انکاری ہو گئے تھے- میں نے دوسرے لوگوں سے شکایت کی تو کسی نے بھی میرے ساتھ ہمدردی ظاہر نہیں کی اور نہ ہی میری بات کو درست جانا- بلکہ الٹا مجھے ہی جھوٹا قرار دیا گیا- مجھے اتنی بڑی رقم گنوا کر یہ سبق ملا ہے کہ کسی شخص پر بھروسہ کرنا عظیم حماقت ہے- اب میں اپنی تمام رقم بنک یا ڈاک خانے ہی میں رکھتا ہوں-"

"سائیں جی- آپ بھیک مانگتے وقت جو مختلف صدائیں لگاتے ہیں' ان کا نمونہ تو ذرا پیش کریں-"

"امتحان کے دنوں میں ہم لوگ کمرہ امتحان کے قریب ہی بیٹھے ہوتے ہیں- اور امتحان دینے والے بچوں کو دیکھ کر یہ صدا لگاتے ہیں- اللہ پاس کرے' مولا پاس کرے' شالا پاس ہوویں' توں پاس ہوویں' پرچے سوکھے ہوون' جواب ٹھیک ہوون' نمبر بہتے ہوون' مولا پاس کرے' اللہ پاس کرے.....

"کچہری میں ملزم اور اس کے لواحقین کو دیکھ کر- جا بچہ توں بری- دکھ دور- بلا دور' جا مقدمہ خارج' موج کر' مزے اڑا' بابے دی جھولی بھر دے' سدا سکھی رہو.....

"شکر گڑھ کا مہاجر بن کر یہ صدا لگاتے ہیں- بھائیو- میں شکر گڑھ کا مہاجر ہوں- میرا سب کچھ ظالم ہندو لوٹ کر لے گئے ہیں- دو دن کا بھوکا ہوں- تمہاری بہن کے ہاں بچہ

ہونے والا ہے- وہ سٹیشن کے مسافر خانے میں کراہ رہی ہے- تمہاری دو بھتیجیاں سکھ غنڈے اغوا کر کے لے گئے ہیں- چھوٹے بچے سردی اور بھوک سے بلک رہے ہیں- خدا کے نام پر ہماری مدد کرو- اللہ تمہاری مشکلیں آسان کر دے گا.....

"عام صدا جو کسی وقت بھی لگائی جا سکتی ہے- یااللہ کل عام دی خیر- سب دا بھلا- جڑ ہری' بوٹا قائم- اللہ کسی کا محتاج نہ کرے-"

"معاف کرنا- برا نہ مانیں تو آخر میں ایک تلخ سوال کرنا چاہتا ہوں-"

"فرمائیے-"

"کیا بھکاری معاشرے میں انتہائی بھیانک اور گھناؤنا کردار انجام نہیں دے رہا؟ کیا وہ ناسور کی حیثیت نہیں رکھتا؟"

"میاں جی' بھکاری سخت محنت اور مشقت سے اپنی روزی کماتا ہے- آپ جب آرام دہ کمروں میں بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون لمحات گزار رہے ہوتے ہیں تو اس وقت بھکاری سردی' گرمی' آندھی' بارش طوفان اور گھور اندھیرے سے بے نیاز در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے اور دکھ جھیلتے ہوئے خدا اور انسانیت کے نام پر اپنی روزی کا بندوبست کرتا ہے- بھکاری چوری نہیں کرتا- ڈاکہ نہیں ڈالتا- کسی کو دھوکا یا فریب نہیں دیتا- وہ اپنی محنت کی کمائی طوائفوں کے کوٹھوں اور جوئے خانوں میں ضائع نہیں کرتا- ملاوٹ جیسے گھناؤنے فعل کا مرتکب نہیں ہوتا- کم نہیں تولتا- بلیک مارکیٹ' سمگلنگ' ذخیرہ اندوزی یا چور بازاری نہیں کرتا- وہ مجبور کر کے لوگوں سے بھاری رقمیں نہیں اینٹھتا' کسی کی امانت میں خیانت نہیں کرتا- جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو وہ گھناؤنا کردار کیسے انجام دے سکتا ہے- معاشرے کے ناسور تو وہ ہیں جو شرافت کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر دنیا کو دھوکہ دیتے ہیں جو اپنی حیثیت یا منصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے غریب عوام کا خون چوستے ہیں جو بھیانک جرائم کے مرتکب ہو کر انسانیت کی توہین کرتے ہیں- وہ خودغرض اور ضمیر فروش سیاست دان ہیں جنہوں نے ذاتی اغراض و مقاصد اور عیاشی کی خاطر مادر وطن کی ناموس کو بھی بیچ ڈالا ہے- بھکاری تو ہمیشہ مظلوم ہوتا ہے- کسی صاحب ثروت نے رحم کھا کر کچھ دے دیا تو دعائیں دیتا ہوا آگے چل دیتا ہے- وہ وطن' قوم اور انسانیت کے خلاف سازش نہیں کرتا- وہ غریبوں اور لاچاروں

کو دکھ پہنچا کر خوش نہیں ہوتا۔"

"سائیں بابا۔ معاف کرنا۔ میں آپ کے جذبات کی صدق دل سے قدر کرتا ہوں۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز نہ تھا۔ بلکہ آپ کے احساسات جاننا چاہتا ہوں۔"

"باؤ جی۔ حقیقت سے کوئی ذی ہوش شخص انکار کیسے کر سکتا ہے۔ مجھے بھکاری بھی معاشرے نے بنایا ہے اور جو ہزاروں کی تعداد میں آپ کو گداگر سڑکوں' گلیوں اور فٹ پاتھوں پر نظر آتے ہیں' وہ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟"

پھر میں سائیں جی کا شکریہ ادا کر کے اجازت لے کر واپس چلا آیا اور تمام راستہ یہی سوچتا رہا کہ کیا میں بلندی سے واپس آ رہا ہوں یا پستی سے لیکن اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

جھیل سیف الملوک

دوستوں کی زبانی اکثر سنا تھا کہ جھیل سیف الملوک گوشہ جنت ہے۔ دلفریب قدرتی مناظر کی دل کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ پریوں کے حسین دیس کا دلاویز عکس ہے۔ حسن و جمال کی نادر تصویر ہے۔ شاعروں کے رنگین تخیل کی ایک دل نشین جھلک ہے۔ جادو نگری کی مسحور کن داستان ہے۔ مدہ بھرے سریلے گیتوں کی آماجگاہ ہے۔ سہانے سپنوں کی خوبصورت تعبیر ہے اور بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جس شخص نے جھیل سیف الملوک نہیں دیکھی' وہ زندگی کی حقیقی مسرتوں اور لذتوں سے ناآشنا رہا---- مگر مجید گنجا جھیل سیف الملوک کی زیارت کو حج کے بعد ہر مسلمان اور شریف شہری کے لئے لازمی قرار دیتا ہے۔

جھیل سیف الملوک کے متعلق ایسے حیرت انگیز اور دلفریب قصے سن کر ہمیں بھی اشتیاق پیدا ہوا کہ زندگی میں ایک بار اس پراسرار الف لیلوی سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور غازیوں میں نام لکھا لیں---- جھیل سیف الملوک سرسبز و شاداب وادیوں اور پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے دیکھنے کو تو ہر کوئی تیار تھا۔ مگر اس دلچسپ سفر کے لئے ایسے ساتھیوں کا انتخاب ضروری تھا جو اچھے ہم سفر ثابت ہوں۔ کافی سوچ بچار کے بعد کوہ پیمائی کی اس عظیم مہم میں شمولیت کے خواہشمند دوستوں کے لئے چند خصوصیات اور صفات کا حامل ہونا اشد ضروری قرار دیا گیا جو حسب ذیل ہیں:

خوش مزاج' خوش خوراک اور خوش گفتار ہو۔

زندہ دل' وسیع النظر اور بے تکلف ہو۔

خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے میں بخل نہ کرے۔

مذاق کرنے اور برداشت کرنے کا اہل ہو۔

شعر سننے اور سنانے سے عملاً اجتناب کرے۔

سفر کی صعوبتیں برداشت کر سکے۔

اختلاف رائے کا قائل نہ ہو۔

اچھا گا اور پکا سکتا ہو۔ یا گانے اور پکانے میں مددگار ثابت ہو۔

جلدی سونے اور دیر سے اٹھنے کا عادی نہ ہو۔

دوران سفر بیوی بچوں یا کاروبار کو یاد کر کے پریشان نہ ہو۔

اس معیار پر ہمارے علاوہ آٹھ اور دوست پورے اترے۔ چنانچہ ہمارا یہ نو دوستوں کا قافلہ مورخہ 17_ جون 1970ء جھیل سیف الملوک کو دیکھنے کے شوق میں ایک فورڈ پک اپ پر عازم بالاکوٹ ہوا۔

مولوی ابراہیم اور خلیل صابری بے حد خوش تھے کیونکہ کہ انہوں نے لاہور کی شملہ پہاڑی کے علاوہ اور کوئی پہاڑ اس سے قبل نہ دیکھا تھا۔ اسحاق جاوید اور مجید گوہر نے اگرچہ بیشتر انگریزی اور پاکستانی فلموں میں مختلف پہاڑوں کا نظارا کیا ہوا تھا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خوبصورت پہاڑوں اور حسین وادیوں کا اپنی آنکھوں سے دیدار کرنے والے تھے۔ البتہ مجید گنجا مطمئن نظر آتا تھا کیونکہ وہ چند روز سانگلہ ہل میں گزار آیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے سابقہ تجربات پر اترا رہا تھا۔ نواز بٹ اپنی داڑھی اور گرم اچکن کے ساتھ ساتھ دوائیوں کا بہت بڑا تھیلا اٹھا لایا تھا جو بوقت ضرورت دوستوں کے کام آ سکتا تھا۔

اسماعیل قمر کا ایک قریبی رشتہ دار جو فوج میں میجر تھا' ان دنوں اپنی کمپنی کے ساتھ کاغان ویلی میں کہیں مقیم تھا۔ مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ میجر قدیر کے ساتھ رشتہ داری اور پک اپ کہیں سے مانگ لانے کے صلے میں اسماعیل قمر کو تمام دوستوں نے متفقہ طور پر میر کارواں چن لیا۔ مجید گوہر اپنے محلے کی مسجد کا خزانچی تھا۔ اس تجربے کی بنا پر اسے اس قافلے کا خزانچی مقرر کر دیا گیا۔ اسحاق جاوید کو پہاڑوں اور وادیوں کے متعلق وسیع معلومات رکھنے کی وجہ سے مشیر سیاحت و قباحت بنایا گیا۔ وہ اس جلیل القدر عہدے کا اس لئے بھی اہل تھا کہ وہ اے۔ ڈی۔ ماڈل سکول گوجرانوالہ میں پورے سات سال تک جغرافیہ پڑھاتا رہا ہے۔

آٹھ سیلنڈر کی یہ فورڈ پک اپ اگرچہ خاصی پرانی تھی۔ مگر تھی قابل دید چیز۔ اس کا فرنٹ تو "سپرد خدا" ٹرک جیسا تھا مگر پچھلی جانب سے وہ ایمبولینس دکھائی دیتی تھی۔ چلتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی طوفانی سمندر کی تند اور بے رحم موجوں پر کشتی میں بیٹھے سفر کر رہے ہیں۔ ہم پندرہ گیلن پٹرول ڈلوا کر گوجرانوالہ سے چلے جو گوجر خان سے

سات میل آگے جا کر ختم ہو گیا۔ افضل بٹ اور خلیل صابری دونوں بس میں بیٹھ کر واپس گوجر خان گئے اور وہاں سے چار گیلن پٹرول کے کر ایک گھنٹہ بعد آئے۔ پٹرول ڈالنے کے بعد ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔

اس وقت دوستوں نے قدرے بوریت محسوس کی۔ میر کارواں نے قوالی گانے کا حکم صادر فرمایا۔ مولوی ابراہیم نے جو ہمارے گروپ کا تان سین تھا تعمیل حکم کرتے ہوئے پہلا الاپ لگایا۔ اس کے سامنے والے مصنوعی دانتوں کا بیڑہ بغاوت کر کے منہ سے چھلانگ لگا گیا۔ مولوی ابراہیم قوالی کو بھول کر اپنے دانت ڈھونڈنے لگا۔ پھر افضل بٹ نے ہاتھ کان پر رکھ کر جو تان لگائی تو پک اپ یکدم ڈولنے لگی اور ڈرائیور نے پہیہ پنکچر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اتنے عرصے میں ہم دو میل کا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے۔ پہیہ تبدیل کرنے میں ہمیں خاصا وقت لگ گیا' کیونکہ جیک کام نہیں کر رہا تھا۔ اس طرح ہم سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک بجے راولپنڈی پہنچے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے ہم ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ کھانا اچھا نہ تھا۔ تمام دوستوں نے تھوڑا تھوڑا کھانا کھا کر ٹیبل خالی کر دیئے مگر میر کارواں مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا۔ پلاؤ اور سالن کی پلیٹوں پہ پلیٹیں اپنے پیٹ میں اتارے جا رہا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ ہوٹل کا تمام کھانا ختم کر کے ہی دم لے گا۔ یا پھر پولیس ہی آ کر اسے اٹھائے گی۔ کھانے سے فارغ ہو کر اور ٹائیر کو پنکچر لگوا کر ہم نے مزید چودہ گیلن پٹرول پک اپ میں ڈلوایا اور ایبٹ آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ تین گھنٹے کے بعد ہم بمشکل تمام ایبٹ آباد پہنچے۔ اس وقت چھ کا عمل تھا۔ چند دوستوں نے رات ایبٹ آباد میں گزار کر اگلے روز سفر کرنے کا مشورہ دیا مگر اسحاق جاوید نے پک اپ کے متعلق اپنا خدشہ ظاہر کر دیا۔ اس نے بتایا کہ پک اپ کے حلیے اور عادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کو کھڑے کھڑے تمام پٹرول ہضم کر جائے گی جو خون پسینے کی کمائی سے خرید کر ہم نے اس میں ڈالا ہے۔

اس سنسنی خیز انکشاف نے تمام دوستوں کے اوسان خطا کر دیئے اور سبھی نے سفر جاری رکھنے کے حق میں ووٹ دے دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر ہم لوگ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ ایبٹ آباد سے کوئی گیارہ میل آگے گئے ہوں گے کہ پک اپ کا دائیں طرف والا اگلا پہیہ ایک زبردست پٹاخے کی آواز سنا کر فلیٹ ہو گیا۔ پک اپ چونکہ کافی رفتار سے

چل رہی تھی۔ اس لئے بڑی مشکل سے ڈرائیور سلیم نے اس پر کنٹرول کیا۔ پہیہ تبدیل کر کے ہم ابھی چلنے ہی والے تھے کہ پچھلا بائیں طرف والا ٹائر پھر بیٹھ گیا۔ اب ہمارے پاس کوئی فالتو ٹائر بھی نہ تھا جسے لگا کر ہم سفر جاری رکھ سکے۔ سلیم ڈرائیور اور مولوی ابراہیم ٹائر لے کر ایبٹ آباد چلے گئے اور پنکچر لگوا کر ایک گھنٹہ بعد واپس آئے۔ اس دوران تمام دوستوں نے دوبارہ ایبٹ آباد چلنے اور رات گزارنے کا پروگرام بنا لیا۔ اسحاق جاوید کے بتائے ہوئے خدشے کے پیش نظر ہم نے پک اپ سے سارا پٹرول نکال کر دو جیری کینوں میں محفوظ کر لیا۔ پک اپ پر ہمیں کوئی اعتماد نہ تھا۔

سامان کامران ہوٹل کے دو کمروں میں رکھ کر ہم کڑاہی گوشت کھانے چلے گئے۔ یہاں بھی اسماعیل قمر نے خوش خوراکی کے بے مثال جواہر اور کمالات دکھائے۔ دو سیر گوشت حلق سے اتارنے کے بعد وہ مزید آرڈر دے رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مجید گوہر پانچ سیر آم خرید لایا جس میں دو سیر تو اکیلا میر کارواں ہڑپ کر گیا اور بقایا تین سیر ڈرائیور سمیت نو آدمیوں نے کھائے۔ میر کارواں کی اشتہا اور کھانے کی CAPACITY دیکھ کر اسحاق جاوید کہنے لگا کہ ہماری پک اپ کی ٹینکی اور قمر کا پیٹ ایک ہی کمپنی کے ساختہ ہیں۔ نواز کہنے لگا کہ ہمارے مشترکہ فنڈ کا اسی فیصد پک اپ اور میر کارواں کے پیٹ کی نذر ہو جائے گا۔

وہاں سے ہم پنجابی فلم "اتھرو اک ٹیار دے" دیکھنے چلے گئے۔ فلم دیکھتے ہوئے مجید گوہر اور محمد افضل بٹ کو ہیروئن کے ساتھ ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ وہ اس الڑ ٹیار کی خوبصورت آنکھوں میں اتھرو دیکھ کر خود بھی رونے لگے اور اسماعیل قمر اور خلیل صابری انہیں تسلی دلاسہ دیتے رہے مگر انہوں نے پوری دلجمعی اور خلوص کے ساتھ ہیروئن کا ساتھ دیا۔ پھر جب شادی کے موقع پر ہیروئن رخصت ہونے لگی تو ایک بار پھر مجید گوہر اور افضل بٹ کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اب کے اسحاق جاوید ان کے غم میں برابر کا شریک تھا۔

سینما شو ختم ہونے پر ہم لوگ کامران ہوٹل کی طرف پیدل ہی چل پڑے۔ موسم خوش گوار تھا۔ تمام راستہ بڑی خاموشی سے طے ہوا۔ کمروں میں آنے کے بعد مجید گنجے نے سبھی دوستوں کو کیپسٹن کے سگریٹ انتہائی خلوص سے پیش کئے۔ تمام دوست مجید گنجے کی اس فیاضانہ پیش کش پر اندر ہی اندر حیران ہوئے کیونکہ وہ ماچس تو ہمیشہ اپنی استعمال کرتا تھا مگر اس کی جیب میں سے کبھی سگریٹ نہیں نکلا تھا۔ بہرحال سبھی مجید گنجے کے ممنون احسان تھے

اور اس کے عطا کردہ سگریٹوں کے کش لگانے اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں بکھیرنے میں محو تھے کہ مولوی ابراہیم کا سگریٹ ایک دم دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا اور وہ سخت بوکھلاہٹ کے عالم میں اپنی کرسی سمیت زمین پر آگرا۔ مولوی ابراہیم کے اچانک گرنے پر خوب قہقہے لگے۔ اتنے میں یکے بعد دیگرے تین اور پٹاخے چلنے کی آواز سنائی دی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نواز، گوہر اور خلیل صابری بھی مولوی ابراہیم کی تقلید کرتے ہوئے اپنا توازن کھو چکے تھے۔ ان لوگوں کا یہ حشر دیکھ کر افضل، قمر، اسحاق جاوید اور میں نے فوراً" سگریٹ پھینک دیئے۔ سگریٹ فرش پر گرتے ہی چند اور پٹاخے چل گئے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سبھی بچوں کی طرح آتش بازی چلا کر شب برات کا جشن منا رہے ہیں۔ مجید گنجا دوستوں کی بدحواسی سے بری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تمام دوستوں نے مجید گنجے کو صلواتیں سنا ڈالیں۔ مجید گنجا ان سگریٹوں میں سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پہلے ہی پٹاخے بھر چکا تھا۔ اس کے مسکین چہرے کو دیکھ کر کسی کو گمان تک نہ گزرا کہ وہ ایسی نازیبا حرکت اتنے بڑے پیمانے پر کر سکتا ہے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اسماعیل قمر نے سخت بھوک لگنے کی شکایت کی۔ مجید گوہر نے ٹوکری سے بسکٹوں کا ایک ڈبہ نکال کر قمر کو دے دیا جسے اس نے چٹخارے لیتے ہوئے منٹوں میں صاف کر دیا۔ پھر ایک مسئلہ یہ چلا کہ کون کون کس کس کمرے میں سوئے۔ اس معاملے میں خاصی لے دے ہوئی کیونکہ مولوی ابراہیم اور مجید گنجے کو کوئی بھی اپنے ساتھ کمرے میں سلانے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخرکار میر کارواں نے اپنا حتمی فیصلہ سنا کر تمام ساتھیوں کو خاموش کر دیا۔ اور اس کے حکم پر تمام کوہ پیما سونے کی تیاری کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد اسماعیل قمر کے خراٹوں کی بھیانک آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بلی کسی ہیبت ناک اژدھے کو اچانک دیکھ کر خوف سے رونے لگی ہو۔ قمر کے سانس لینے کا انداز وہی تھا جو بکرے کے ذبح ہونے کے فوراً" بعد ہوتا ہے۔ اس کی پھولی توند کا مدو جزر انتہائی خطرناک تھا اور کسی زبردست طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔ تمام دوست یہ اندوہناک منظر دیکھ کر گھبرا گئے۔ مجید گوہر نے میر کارواں کی ٹانگ زور سے کھینچ کر اسے گہری نیند سے جگا دیا۔ قمر اس اچانک حملے سے خوفزدہ دکھائی دیا اور بوکھلاہٹ کے عالم میں ساتھیوں کو دیکھنے لگا۔ نواز نے فوراً" اپنے تھیلے سے ہاضمے کی گولیاں نکال کر قمر کو کھلا دیں چونکہ یہ

کھانے والی چیز تھی اس لئے میر کارواں کے لئے اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کا سارا غصہ جاتا رہا۔ اس واقعہ کے بعد تمام دوستوں کی نیند اڑ گئی۔ مجید گنجے نے موقعہ کی نزاکت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک مرتبہ پھر سخاوت کرنا چاہی۔ مگر کسی نے اس کے سگریٹوں کو ہاتھ لگانا تو در کنار نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اتنے میں مولوی ابراہیم نے گانا شروع کر دیا۔ نواز' افضل بٹ اور اسحاق جاوید ناچنے لگے۔ وہ ناچتے کم اور سونے کی ناکام کوشش کرنے والوں کو ٹھوکریں زیادہ مار رہے تھے۔ اس شور اور زد و کوب کرنے کی کاروائی نے تمام کوہ پیماؤں کو اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح بقایا رات ایک دوسرے کو تنگ کرنے میں گزار دی گئی۔

صبح جب سب دوست تیار ہونے لگے تو پتہ چلا کہ کسی نانجار نے تمام پتلونوں کے بٹن اور شلواروں کے آزار بند اتار کر چھپا دیئے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ جوتے بھی غائب تھے۔ اسحاق جاوید کی کھوجی طبیعت نے جوتوں کے چور کو تو بہت جلد پکڑ لیا کیوں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے صرف اسی کا تعلق پنجاب کے اس خطے سے تھا جو جوتیاں چرانے کے فن میں برصغیر کے کونے کونے میں مشہور ہے۔ چنانچہ خلیل صابری کو تھوڑا سا زچ کر کے ہوٹل کی بالائی چھت پر سے جوتے برآمد کر لئے گئے۔ البتہ پتلونوں کے بٹن اور آزار بند مولوی ابراہیم کے سوٹ کیس سے برآمد ہوئے۔ جب مولوی ابراہیم نے قرآن کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ یہ اس کی کارگزاری نہیں تو کوہ پیماؤں کو تشویش پیدا ہوئی اور مجرم کو بے نقاب کرنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ میر کارواں کے حکم پر مجید گنجے کو ٹانگوں سے پکڑ کر جب الٹا لٹکایا گیا تو اس نے اقبال جرم کر لیا۔

اسی روز علی الصبح ہمارا قافلہ بالا کوٹ روانہ ہوا۔ احتیاط کے طور پر ہم نے مزید آٹھ گیلن پٹرول جیری کینوں میں رکھ لیا۔ ایبٹ آباد سے باہر نکل کر دوستوں نے مولوی ابراہیم سے کچھ گانے کی فرمائش کی۔ مولوی ابراہیم بے شک بہت اچھا گاتا تھا مگر عورت کا حقہ پینا اور مولوی کا گانا کبھی بھلا نہیں لگتا۔ پھر مولوی ابراہیم کو زمانہ قبل از مسیح کے یادگار گانوں کے علاوہ اور کچھ یاد نہ تھا۔ مگر ہم کرتے بھی کیا' ہمارے پاس اس گلوکار کے سوا باقی سب تالی بجانے والے فنکار تھے۔ تاہم موسیقی کے معاملے میں وہ ہمارا واحد سہارا تھا۔ دوستوں کی فرمائش پر اس نے دیوکا رانی کی گائی ہوئی ایک چالیس سالہ پرانی فلمی غزل شروع کی۔ جس

کے بول تھے:

اے باد صبا اٹھلاتی نہ آ۔ میرا غنچہ دل تو سوکھ گیا
میرے پیاسے لبوں کو چھوئے بنا پیمانہ خوشی کا ٹوٹ گیا

میر کارواں ایک ٹرنک اور اسحاق جاوید گنجے کا سر بجانے لگا۔ افضل اور میں تالی' نواز اور مجید گوہر چٹکی بجا رہے تھے۔ خلیل صابری منہ سے طبلے کی گت جیسی آواز نکال رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پک اپ کے انجن۔ باڈی اور کراؤن ویل کی بے ہنگم آوازیں ایک عجیب قسم کا طلسماتی سماں پیدا کر رہی تھیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شہنشاہ اکبر اعظم ہمیں اس کیفیت میں دیکھ لیتے تو وہ فوراً" اپنے نو رتنوں کو برطرف کر کے ہمیں ان کی جگہ عنایت فرما دیتے۔

اس طرح ہم ہنستے گاتے اور تفریح کرتے جا رہے تھے کہ ایک زور دار کڑک کی آواز سنائی دی۔ ڈرائیور سلیم نے گاڑی کو بریک لگائی۔ پک اپ کوئی پندرہ بیس قدم آگے جا کر رک گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر دیکھا اور کمانی کا پٹہ ٹوٹنے کی خبر سنا دی۔ تمام کوہ پیماؤں کے چہرے اتر گئے۔ فوری طور پر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا گیا۔ میر کارواں نے تمام دوستوں کے خفیہ ووٹ حاصل کر کے کثرت رائے کے مطابق فیصلہ سنا دیا کہ مانسہرہ تک چیونٹی کی چال چلتے ہوئے پک اپ پر سفر جاری رکھا جائے اور وہاں پہنچ کر پٹہ کی مرمت کروائی جائے۔ مانسہرہ ابھی سات میل دور تھا۔ سبھی دوست سراسیمگی کی حالت میں پک اپ پر سوار ہو گئے اور ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ اب کوہ پیما بڑی خاموشی سے بیٹھے سفر کر رہے تھے۔ ان کی شوخیاں اور شرارتیں رفو چکر ہو چکی تھیں۔ کوئی ڈھائی میل چل کر ڈرائیور نے ایک مرتبہ پھر پک اپ روک دی اور بونٹ کھول کر انجن دیکھنے لگا۔ تمام ہم سفروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میر کارواں نے سخت تشویش کے عالم میں ڈرائیور سے پک اپ روکنے کی وجہ دریافت کی تو پتہ چلا کہ ٹائیمنو بیٹری چارجنگ چھوڑ چکا تھا۔ یہ منحوس خبر سن کر تمام دوستوں کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ ان کی حالت اس وقت اس ملزم جیسی تھی جسے ابھی ابھی دس سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی ہو۔

تھوڑا سا رکنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی پھر چلا دی اور اسی حالت میں مانسہرہ تک

پہنچنے کا مصمم ارادہ کیا۔ اب ہمارے دل گاڑی کی رفتار کے مطابق دھڑک رہے تھے۔ ابھی مانسہرہ تین میل دور تھا کہ گاڑی کے نچلے حصے میں ایک اور دھماکا ہوا۔ اور پک اپ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس دفعہ ٹوٹی ہوئی کمانی کے دو ٹکڑے نیچے سڑک پر جا گرے تھے۔ مولوی ابراہیم اور افضل بٹ پچاس قدم پیچھے جا کر پٹے کے ٹکڑے اٹھا لائے۔ تمام کوہ پیما سخت ہراساں اور پریشان دکھائی دے رہے تھے اور پک اپ کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے حاجی شیطان کو دیکھتا ہے۔ میر کارواں نے اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے ایک اور ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اور اگلے پروگرام کے متعلق دوستوں سے مشورہ کرنے لگا۔ اسحاق جاوید کہنے لگا کہ بہتر ہی ہو گا کہ بالا کوٹ جا کر اس خون آشام پک اپ کو دھکا دے کر دریا میں پھینک دیا جائے۔ مجید گوہر نے گوہر افشانی کی کہ بالا کوٹ تو شاید ہم اگلے دو ہفتوں میں بھی نہ پہنچ پائیں' مزید پریشانی سے بچنے کا واحد حل یہی ہے کہ ہم پک اپ کو ادھر ہی آگ لگا دیں۔ مجید گنجا بولا۔ "کیوں نہ کسی کباڑی کے ہاتھ اس کو فروخت کر ڈالیں۔ اس طرح ہم اپنی مالی نقصان بھی پورا کر لیں گے اور اس آفت ناگہانی سے بھی چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔" خلیل صابری اپنا سارا غصہ میر کارواں پر نکالتا رہا جو اس عذاب الٰہی کو لے کر نازل ہوا تھا۔ اسماعیل قمر بھی خاصا نروس تھا کیونکہ اس قافلے کے تمام شرکاء بجائے اس کے ممنون ہونے کے اس کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنے کی سوچ رہے تھے۔

بہرحال بیس منٹ کے اس ہنگامی اجلاس میں متفقہ فیصلہ قرار پایا کہ تمام ہم سفر پک اپ کو دھکیلتے ہوئے مانسہرہ تک لے چلیں۔ یہ قرارداد تو منظور ہو گئی مگر اس پر عمل درآمد انتہائی کٹھن کام تھا۔ ہم اس دیو قامت پک اپ کو ایک فرلانگ تک بمشکل تمام کندھا دے سکے۔ پھر سبھی ہمت ہار بیٹھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد ایک ٹرک جو وہاں سے گزر رہا تھا' ہمارے اشارہ پر دینے پر رکا۔ ٹرک ڈرائیور نے ہماری کسمپرسی پر ترس کھا کر ایک رسے کی مدد سے پک اپ کو ٹرک کے پیچھے باندھا اور ہمیں ٹرک کے پچھلے حصے میں بٹھا کر مانسہرہ روانہ ہوا۔ اس طرح ہم ڈیڑھ بجے مانسہرہ پہنچے۔

مانسہرہ پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے ایک معمولی سے ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر ڈائینمو اور کمانی کی مرمت کے لئے کوئی ورکشاپ تلاش کرنے لگے۔ ہمیں سخت مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں کوئی ایسا بندوبست نہ تھا۔ مجبوراً" ہمیں ڈرائیور سلیم اور نواز کو بذریعہ بس

ایبٹ آباد بھیجنا پڑا۔ وہ تین گھنٹے کے بعد واپس لوٹے۔ کمانی اور ڈائینمو لگانے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اتنے میں اندھیرا چھا گیا۔ میر کارواں نے بالا کوٹ کی روانگی اگلے روز پر ملتوی کر کے ایک ریسٹ ہاؤس میں رات گزارنے کا بندوبست کر دیا۔ تمام کوہ پیما اس تکلیف دہ سفر کے سبب سخت تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں پچھلی رات ایک لمحہ کے لئے بھی سو نہ سکے تھے۔ اس لئے جلد ہی کھانا کھا کر لیٹ گئے۔ اور لیٹتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو گئے۔ اس طرح یہ رات بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے کٹ گئی۔

مانسہرہ اس علاقے کی بڑی پرکشش اور خوبصورت جگہ ہے۔ ریسٹ ہاؤس' جہاں ہم مقیم تھے' ایک لمبی مگر سرسبز تنگ پہاڑی کے ٹیلے پر واقع تھا۔ وہاں سے پاخلی میدان کا ہوش ربا منظر قابل دید تھا۔ اردگرد صنوبر کے گھنے درختوں کے جھنڈ اور دور نظر آنے والے وادی کاغان کے برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں عجیب دلاویز نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ مولوی ابراہیم اسحاق جاوید سے پوچھنے لگا کہ ہم لوگ سطح سمندر سے کتنا اونچا پہنچ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی استفسار کر رہا تھا کہ وادی کاغان میں سردی کتنی ہو گی۔ اسے غالباً اوور کوٹ پہننے کا شوق تھا جو وہ اپنے چھوٹے بھائی سے اس سفر کے لئے خاص طور پر مانگ لایا تھا۔

ہم لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر بڑی تسلی سے قریباً ساڑھے نو بجے ریسٹ ہاؤس سے چلے۔ بالا کوٹ صرف 29 میل دور تھا۔ اگرچہ یہ بمشکل ایک گھنٹے کا سفر تھا مگر پک اپ کی سابقہ روایات کے پیش نظر دوستوں کو اس پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ بہرحال تمام کوہ پیما قرآن پاک کی آیات کا ورد کر رہے تھے اور ایک عجیب قسم کا انجانا خوف ان کے دلوں پر طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور نے گاڑی روکی۔ ہم سب گھبرا گئے۔ سلیم ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا---- "خاطر جمع رکھیں۔ میں صرف پٹرول ڈالنے لگا ہوں"____ میں نے اسے یقین دلا دیا کہ اب راستے میں کہیں بھی چیکنگ ہونے کا احتمال نہیں اس لئے بغیر پٹرول کے ہی سفر جاری رکھا جائے مگر ڈرائیور چونکہ انتہائی محتاط اور قانون کا پابند تھا اس لئے میری یقین دہانی کے باوجود پک اپ کے خوف ناک پیٹ میں پٹرول منتقل کرنے لگا۔ دونوں جیری کین خالی کر کے اس نے پک اپ چلا دی۔ پک اپ بڑی آن بان سے ہچکولے کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ بالا کوٹ صرف چھ میل دور رہ گیا تھا۔ سبھی کوہ پیما اس دور دراز مگر طلسماتی وادی کاغان کے دامن میں پہنچنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔ مولوی ابراہیم نے

اوور کوٹ اپنے ٹرنک سے نکال کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ اسحاق جاوید اپنے بالوں کو کنگھی کر چکا تو خلیل صابری نے اس سے کنگھی لے کر اپنے بال سنوارنے شروع کر دیئے۔ مجید گوہر اور افضل بٹ نے جوتے پہن لئے۔ مجید گنجا اپنی بش شرٹ اتار کر مٹی جھاڑنے لگا۔ تو پک اپ آنا" فانا" بے قابو ہو گئی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کے بائیں کنارے ایک نحیف و لاغر درخت کا انتخاب کر کے اس پر جا حملہ آور ہوئی۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گیا اور پک اپ اس پر سوار ہو کر رک گئی۔ مجید گنجا گھبراہٹ میں بش شرٹ کو پیرا شوٹ سمجھتے ہوئے کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔ اس کے بائیں پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ دوسرے ہم سفر اگلی سیٹوں پر جا گرے۔ اگلی نشست پر براجمان میر کارواں کا سر سامنے ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔ اس طرح سبھی معمولی چوٹیں کھا کر اس منحوس پک اپ سے باہر آئے۔ اسحاق جاوید ایک شیشے والی عینک پہنے کھڑا تھا کیونکہ دوسرا شیشہ اگلی نشست کے لوہے کے دستے پر لگنے سے چور چور ہو کر گر گیا تھا۔ مولوی ابراہیم کے دو مصنوعی دانت شہید ہو گئے تھے۔ اسماعیل قمر کے ماتھے پر دو انچ موٹا گومند ابھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ نواز اپنے بائیں کندھے کو سہلا رہا تھا۔ گوہر اپنی پتلون اوپر اٹھا کر اپنے گھٹنے کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ سلیم ڈرائیور نے پک اپ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اس کا ٹائی راڈ کھل جانے کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔

اب پک اپ پر بالا کوٹ پہنچنے کا امکان بھی ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم نے اسحاق جاوید اور خلیل صابری کو ایک ٹرک پر بالا کوٹ روانہ کیا۔ وہ ایک گھنٹہ بعد دو جیپیں لے کر آ گئے۔ سارے سامان سمیت ہم جیپوں پر منتقل ہو گئے اور آدھے گھنٹے بعد ہم بالا کوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں اپنا سامان اتار رہے تھے۔

دریائے کنہار کے قریب واقعہ اس ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھنے کے بعد نواز نے تمام دوستوں کو فرسٹ ایڈ مہیا کی۔ چوٹوں اور زخموں کی تعداد اور نوعیت کے مطابق مختلف گولیاں اور کیپسول کھلائے۔ پھر آئندہ پروگرام کو ترتیب دینے کے لئے ایک اہم اجلاس منعقد کیا گیا۔ اکثریت کی رائے چونکہ اگلے روز کاغان وادی کا سفر کرنے کے حق میں تھی' اس لئے میر کارواں نے رات بالا کوٹ میں گزارنے کا فرمان جاری کر دیا۔ میر کارواں نے جب پک اپ کو مرمت کرانے کی غرض سے بالا کوٹ لانے کی تجویز پیش کی تو سبھی دوست آگ بگولا

ہو گئے اور بغاوت پر اتر آئے۔ انہوں نے کامن فنڈ سے مزید ایک پائی بھی پک اپ پر لگانے سے انکار کر دیا۔ میر کارواں نے دوستوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ چونکہ پک اپ کسی دوست سے مانگ کر لایا تھا اس لئے بے چارہ مجبور تھا۔ مگر کوہ پیما اپنی جگہ سچے تھے' کیونکہ پک اپ نے نہ صرف ان کا سکون غارت کر دیا تھا بلکہ سفر کا لطف بھی جاتا رہا تھا۔ ان حالات میں اسماعیل قمر کو ذاتی خرچ پر پک اپ مرمت کرانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ بالا کوٹ کی ایک ورکشاپ کے مستری کو اس نے پک اپ جائے حادثہ سے لانے اور مرمت کرنے کا فرض سونپ دیا۔

بالا کوٹ جہاں سے وادی کاغان شروع ہوتی ہے' ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کی آبادی مشکل سے چار ہزار نفوس پر مشتمل ہو گی۔ دوپہر کا کھانا ریسٹ ہاؤس میں کھا کر ہم لوگ تحریک آزادی کے سرگرم راہنماؤں حضرت شاہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کے مزاروں پر حاضری دینے چلے گئے۔ مجید گنجے نے وہاں نہایت انکساری سے اپنے سر پر بال اگنے کے لئے دعا کی۔ اسحاق جاوید اور نواز نے پک اپ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے ہاتھ اٹھائے اور رو رو کر اپنی داستان غم عرض کی۔ خلیل صابری پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے آئندہ تاش میں بے ایمانی کرنے سے توبہ کر لی۔ مجید گوہر اپنی ترقی اور افضل بٹ نے کاروبار میں برکت کے لئے گڑگڑاتے ہوئے دعائیں مانگیں۔ مولوی ابراہیم کا معاملہ البتہ سنگین نوعیت کا تھا۔ وہ دس بچوں کی پیدائش کے بعد فیملی پلاننگ کی ناکامی کا رونا روتا رہا اور مزید اولاد کی بجائے اپنے موجودہ بچوں کی آباد کاری کے لئے دعا گو تھا۔ اسماعیل قمر دوستوں کے عدم تعاون کے سبب اس وبال جان پک اپ کے متعلق متفکر تھا کہ وہ کیسے اسے واپس گوجرانوالہ پہنچا کر سرخرو ہو گا۔ اس سلسلے میں وہ ان عظیم فرزندان توحید اور مجاہدین اسلام سے مدد مانگ رہا تھا۔ دعا مانگتے ہوئے اس پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ قافلے کے طے کردہ اصولوں کے خلاف شعر بولنے لگا۔ شعروں کی ادائیگی وہ آغا حشر مرحوم کے انداز میں کر رہا تھا۔

وہاں سے فارغ ہو کر دوست بازار میں گھومنے لگے۔ شام کو جب واپس آئے تو وہ بہت کچھ خرید لائے تھے۔ مجید گوہر' اسحاق جاوید' نواز اور افضل بٹ نے زیرا' کستوری اور شہد خریدا۔ خلیل صابری اور مولوی ابراہیم نے زعفران اور دار چینی لی۔ اسماعیل قمر اور مجید گنجے

نے ان چیزوں کے علاوہ سلاجیت' یاقوت' ریچھ اور شیر کی چربی بھی خریدی۔ مجید گنجا بے حد خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ اسے سر پر بال اگانے کا تیل بھی مل گیا تھا جس کے استعمال سے شرطیہ بال اگنے والے تھے۔ اس کی دعا اتنی جلدی منظور ہونے پر سبھی دوست اسے رشک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ افضل بٹ اور خلیل صابری نے دو جیپوں کا بندوبست اگلے روز کے لئے کر لیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد تمام ہم سفر تاش کھیلنے لگے۔ بازی ہارنے والے کو دس بیٹھکیں اور دس ڈنٹر پیلنے پڑتے تھے۔ مولوی ابراہیم کا ساتھی مجید گنجا تھا جو مخالفوں کے ساتھ مل کر کھیل رہا تھا۔ مولوی ابراہیم کا بیٹھکیں نکالتے اور ڈنٹر پیلتے برا حال ہو گیا۔ آخر تھک ہار کر وہ علیحدہ ہو بیٹھا۔ بعد میں جب مولوی ابراہیم کو مجید گنجے کی سازش کا پتہ چلا تو اس نے مجید گنجے کو پکڑ کر خوب پٹائی کی۔ دوسری ٹولی میں مجید گوہر اور افضل بٹ دونوں ساتھی تھے۔ مجید گوہر کا دھیان تاش کی بجائے اپنی بیوی اور بچوں کی طرف تھا۔ وہ کھیلنے کے دوران ایسی حماقتیں کرتا رہا کہ اس کے ساتھی نے ہی اس کی سرکوبی کر ڈالی۔ خلیل صابری اور اسحاق جاوید نے مخالفوں کو تو بے ایمانی سے باز رکھنے کے لئے قرآن کی قسم دے رکھی تھی مگر وہ خود اس سے مستثنیٰ تھے۔ خلیل صابری اپنی توبہ کو بھول کر کھیلے ہوئے پتوں کو بڑی ہوشیاری سے دوبارہ نیچے سے کھسکاتا اور پھر انہی کی مدد سے دشمنوں کو مات دے دیتا۔ وہ بے چارے سادہ لوحی میں شکست پہ شکست کھاتے چلے گئے۔ میر کارواں' ڈرائیور سلیم اور ریسٹ ہاؤس کے بیرے گل محمد کے ساتھ منگ پتہ کھیل رہا تھا۔ اس رات بالا کوٹ کا یہ ریسٹ ہاؤس اپنی گہما گہمی کی بدولت مانٹی کارلو (عظیم جوا خانہ) کی نائٹ کلب کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

رات گیارہ بجے خلیل صابری نے تاش کھیلتے ہوئے اپنی جیب سے مٹھی بھر عمدہ چھوٹی الائچیاں نکالیں اور دوستوں کو پیش کر دیں۔ سبھی دوستوں نے ایک ایک دو دو الائچیاں لے کر منہ میں ڈال لیں۔ اسماعیل قمر اپنی اشتہا کے مطابق اکٹھی پانچ الائچیاں منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ مجید گنجے اور خلیل صابری نے البتہ الائچیاں کھانے سے اجتناب کیا۔ تھوڑی دیر بعد اسحاق جاوید کے ہونٹ کالے' مجید گوہر کے نیلے' نواز کے پیلے' افضل بٹ کے زرد اور مولوی ابراہیم کے جامنی دکھائی دینے لگے۔ اسماعیل کا منہ تو قوس قزح کی مانند تھا کیونکہ اس نے زیادہ الائچیاں کھا لی تھیں۔ سبھی دوست غسل خانوں کی طرف بھاگے اور اپنا اپنا منہ

صاف کرنے لگے۔ الائچیوں میں مختلف رنگ بھرے ہوئے تھے جو دوست تاش میں محویت کے باعث دیکھ نہ پائے تھے۔ رنگ پختہ تھے اس لئے اتنی جلدی اترنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس دوران خلیل صابری دوستوں کے تیور دیکھ کر ان کی مشق ستم سے بچنے کے لئے ریسٹ ہاؤس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ غسل خانے سے نکل کر میر کارواں کی ہدایت پر دوستوں نے خلیل صابری کا تعاقب کیا اور اسے دریائے کنہار کے پل پر جا لیا۔ اس نے دریا میں کودنے کی ناکام کوشش کی۔ دوست اسے پکڑ کر کمرے میں لے آئے اور پلنگ کے ساتھ باندھ دیا۔ خلیل صابری نے قسم کھا کر بتایا کہ مجید گنجے نے یہ الائچیاں دوستوں کو کھلانے کے لئے دی تھیں۔ پھر کیا تھا' مجید گنجے اور خلیل صابری کی ایسی پٹائی ہوئی کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آنے لگا۔ پھر جب دونوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی تو ان کی جان بخشی ہوئی۔ ہمسفر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور دل ہی دل میں مجید گنجے اور خلیل صابری کو داد دے رہے تھے۔ اس کے بعد تمام ہمسفر چند گھنٹے آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ میر کارواں کے ہولناک خراٹوں کی گونج دوسرے ہمسفروں کی نیند خراب کرنے لگی۔ چنانچہ نواز' اسحاق جاوید' خلیل صابری اور مجید گنجے نے قمر کی چارپائی اٹھا کر باہر برآمدے میں لگا دی۔ میر کارواں اس بیہودگی پر سیخ پا ہوا اور چارپائی گھسیٹ کر اندر لے جانے لگا تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ناچار اسے باہر ہی رات گزارنا پڑی۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے تک ناشتہ کر کے دونوں جیپوں میں سارا سامان رکھا جا چکا تھا۔ پورے نو بجے مہذب دنیا کے اس آخری گاؤں کو الوداع کہہ کر ہم کاغان کے رنگین سلسلہ کوہ میں داخل ہو گئے۔ چڑھائی بہت زیادہ تھی۔ سڑک خاصی چوڑی اور عمدہ' ہم حسین قدرتی مناظر کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جھیل سیف الملوک جاتے ہوئے انسان راستے میں ناقابل یقین حد تک قدرتی مناظر سے محظوظ ہوتا ہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد کیوائی پہنچ کر ہماری جیپ رکی۔ یہاں سے وادی کاغان کی خوبصورتی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں محکمہ تعمیرات عامہ کا ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ یہ جگہ بالا کوٹ سے 1600 فٹ اور سطح سمندر سے 4800 فٹ بلند ہے۔ پندرہ منٹ وہاں ٹھہر کر ہم لوگ ایک ذیلی سڑک کے ذریعہ شوگران کی طرف چل دیئے۔ یہ بڑی پرپیچ' تنگ اور خستہ حال سڑک تھی۔ چڑھائی بے حد خطرناک' مگر جیپوں کے ڈرائیور

اپنی مشاقی اور مستعدی کا اعلیٰ ثبوت پیش کر رہے تھے۔ ہمارے چند کوہ پیما بڑے پریشان اور خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ مولوی ابراہیم' خلیل صابری اور مجید گوہر نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

کیوائی سے شوگران اگرچہ صرف پانچ میل دور ہے مگر اس کی اونچائی کیوائی سے 3000 فٹ زیادہ ہے۔ تمام راستہ قابل دید تھا۔ ہم کوئی پچیس منٹ بعد شوگران کی بلندیوں پر کھڑے قدرت کی رعنائیوں کا دلفریب نظارہ کر رہے تھے۔ شوگران سطح سمندر سے 7800 فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہاں سے ملکہ پربت (4000 فٹ) مکڑا پربت (14000 فٹ) اور موسیٰ کا معلا (17000 فٹ) کی برفانی چوٹیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ مقام منفرد حسن کا مالک ہے۔ چاروں طرف گھنے جنگلات ہیں۔ قدم قدم پر جنگلی پھول کھلے ہوئے ملتے ہیں جن کی سوندھی خوشبو سے فضا معطر رہتی ہے۔ دو ڈاک بنگلے' چند کھیت اور اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں تاحد نظر پہاڑوں کی ترچھی ڈھلانوں پر سرسبز گھاس اور ہریالی عجیب دل لبھانے والا نظارہ پیش کرتی ہے۔ یہاں بھی مولوی ابراہیم نے اسحاق جاوید سے دریافت کیا کہ ہم کتنا اوپر آ چکے ہیں۔ مجید گنجا کہنے لگا۔ "یہاں سے عرش معلے کے چار آنے لگتے ہیں" ____ مولوی ابراہیم نے یہ سنتے ہی اوور کوٹ پہن لیا۔ مجید گوہر' نواز' افضل بٹ اور خلیل صابری اس جگہ کا مقابلہ لاہور کی شملہ پہاڑی سے کر رہے تھے۔ مجید گنجا سا گنلہ ہل کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اس خوبصورت جگہ کی تعریف کرنے لگا۔ اسماعیل قمر اور میں رب العالمین کی عظمت اور کرشمہ سازی کی ثنا خوانی میں مصروف تھے۔ مولوی ابراہیم کو مجید گنجے نے دور دکھائی دینے والے برف پوش پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ نانگا پربت یعنی کے ٹو ہے۔ مولوی ابراہیم کو وہ منظر اتنا بھلا لگا کہ اس نے اسی وقت جیب سے کیونڈر کی ڈبیہ نکال کر پھینک دی اور کے۔ ٹو سگریٹ پینا شروع کر دیئے۔

آدھا گھنٹہ وہاں ٹھہر کر اور ریسٹ ہاؤس سے چائے پی کر ہم لوگ واپس کیوائی سے ہوتے ہوئے پارس پہنچے۔ پارس سے ایک راستہ شاران جاتا ہے جو دریا کی دوسری جانب نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فاران کی جانب آگے بڑھے تو شینو کے مچھلی فارم میں دنیا کی انتہائی خوبصورت رنگوں والی مچھلی ٹراؤٹ کی افزائش نسل دیکھی۔ ٹراوٹ ذائقے کے لحاظ سے لذیذ ترین مچھلی شمار کی جاتی ہے۔ یہ صاف شفاف مگر برفانی پانیوں میں پائی جاتی ہے۔ خلیل

صابری نے ٹراوٹ دیکھ کر مولوی ابراہیم کو بتایا کہ یہ مچھلی بھی طوفان نوح سے بچ کر کشتی میں سوار ہو گئی تھی۔ اسحاق جاوید کہنے لگا کہ اس مچھلی کے تیل سے کاڈلور آئیل تیار ہوتا ہے۔ نواز نے انکشاف کیا کہ اس مچھلی کے کھانے سے لقوہ' فالج اور ٹی بی کا مریض چند دنوں میں صحت یاب ہو جاتا ہے۔ یہ الفاظ سن کر مجید گوہر' میر کارواں فضل بٹ اور مولوی ابراہیم کے منہ میں پانی آ گیا۔ انہوں نے ہر قیمت پر ٹراوٹ حاصل کر کے بھون کر کھانے کی خواہش ظاہر کر دی۔ چونکہ وقت کم تھا اور جیپوں کے ڈرائیوروں کی اس یقینی پر دہانی پر کہ یہ مچھلی فاران کے قریب مچھلی پکڑنے کا لائسنس حاصل کر کے دریائے کنہار سے شکار کی جا سکتی ہے' دوست آگے چلنے پر رضامند ہوئے۔

ہمارا اگلا سٹاپ مہانڈری تھا جو لکڑی کی بہت بڑی منڈی ہے۔ مجید گنجے نے وہاں لکڑی کا سودا کرنے کی کوشش کی۔ مگر دوستوں نے اس کی پیش نہ جانے دی۔ مہانڈری سے گیارہ میل دور اور بالاکوٹ سے 39 میل کے فاصلے پر کاغان کا خوبصورت گاؤں آیا جس کے نام سے پوری وادی منسوب ہے۔ یہاں ہم نے ایک تنور سے کھانا کھایا۔ کاغان گاؤں کا علاقہ قدرت کاملہ کی رعنائیوں کا مرقع ہے۔ اس جگہ چاندی کے رین کی طرح بل کھاتا ہوا دریائے کنہار جو سفر کے دوران سیاحوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے' بڑا فرحت بخش نظارا پیش کرتا ہے۔ گہرے دریا کے پتھریلے کناروں اور راستے میں حائل چٹانوں سے ٹکرا کر جب اس کی تیز رفتار موجیں جھاگ اڑاتے ہوئے گزرتی ہیں۔ تو وہ قدرت کی نغمہ سرائی کی دلاویز جھلک پیش کرتی ہیں۔ سیاح اس پرکشش اور دل موہ لینے والے منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

دور دور تک چھوٹے چھوٹے گاؤں پہاڑوں کی ترچھی چٹانوں پر خطرناک طریقے سے لٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ محض فریب نظر ہو۔ اسحاق جاوید ان پراسرار گاؤں کے محل وقوع کا تفصیلی جائزہ لے کر کہنے لگا کہ ان مکانوں سے باہر آنا جانا بے حد کٹھن کام ہے۔ خدا جانے یہ لوگ کیسے اپنے گھروں کو پہنچتے ہوں گے۔ مجید گوہر کو یہ الجھن ستا رہی تھی کہ نوجوان تو خیر ان ناقابل تسخیر چٹانوں کو سر کر کے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے گھروں کو پہنچ جاتے ہوں گے' بوڑھے' بچے اور عورتیں کیا کرتی ہوں گی؟ خلیل صابری کا خیال تھا کہ وہ لوگ اپنی بھیڑ بکریوں کی کمر پر بیٹھ کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ مجید گنجا اپنے سا گنلہ

ہل کے تجربہ کی بنا پر بڑے وثوق سے بولا کہ یہ لوگ رسوں کی مدد سے وہاں پہنچتے ہیں۔ میر کارواں نے البتہ میجر قدیر کا حوالہ دیتے ہوئے اس معمے کا حل پیش کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ لوگ اپنے گھروں سے باہر کہیں نہیں جاتے۔ انہیں ہیلی کاپٹروں کی مدد سے خوراک پہنچائی جاتی ہے۔

اس 6900 فٹ کی بلندی پر واقعہ کاغان گاؤں میں بھی ایک ڈاک بنگلہ دریا کے کنارے بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شفاخانہ اور پولیس سٹیشن بھی ہے۔ کاغان گاؤں اور فاران کے درمیان ٹریفک یکطرفہ ہے۔ یہ راستہ دن میں تین مرتبہ آمدورفت کے لئے کھلتا ہے۔ ہماری جیپیں تین بجے کاغان سے چلیں۔ سڑک تنگ اور دشوار گزار تھی۔ اس کے ایک کنارے پر گہرا دریا تھا اور دوسری طرف غیر ہموار چٹانیں۔ ڈرائیور کی معمولی سی غفلت تمام سواریوں کو موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ ڈرائیوروں نے سبھی سیاحوں کو دریا کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا۔ مولوی ابراہیم' خلیل صابری' اسحاق جاوید اور مجید گوہر کا برا حال تھا۔ ان کے چہرے زرد دکھائی دیتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کئے ماحول سے بے نیاز تلاوت قرآن پاک کر رہے تھے۔ ڈرائیور بڑے چوکنے تھے۔ اس پرپیچ اور خطرناک راستے پر سفر کرنا ان کا روزمرہ معمول تھا۔ اس لئے بڑی بے تکلفی اور مہارت سے جیپیں چلا رہے تھے۔ ٹھنڈی خنک ہوا اور سورج کی نکھرتی دھوپ بڑی سرور انگیز تھی۔

سات گھنٹے کے اس اعصاب شکن اور تھکا دینے والے سفر کے دوران ہم کوئی دس مرتبہ ڈرائیوروں کی مشاقی کے سبب موت کی وادی دریائے کنہار میں گرنے سے معجزانہ طور پر بچ کر تقریباً چار بجے فاران پہنچ گئے۔ سبھی کوہ پیماؤں نے رب ذوالجلال کا شکریہ ادا کیا۔ وادی کاغان کے وسط میں فاران واقع ہے۔ جائے وقوع کے اعتبار سے اگر اس کو وادی کا اہم ترین مقام کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ یہاں سیاحوں کی کثرت کے پیش نظر ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے نہایت تیزی سے کام جاری ہے۔ انسان یہاں پہنچ کر اپنے تفکرات بھلا دیتا ہے۔ قدرت نے اس جگہ کو بڑی فراخدلی سے اپنی نادر تخلیقات سے مرصع کیا ہے۔ اردگرد کے فلک بوس پہاڑ چیل' دیودار' صنوبر اور سرو کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ سبزے کے درمیان مکانات اور ڈاک بنگلوں کی رنگین چھتیں جھلکتی ہیں۔ شام کے دھندلکے میں ان مکانوں کی چمنیوں کا دھواں ہوا میں ساکت ہو کر رہ جاتا ہے اور اس

کے پس منظر میں دریا کا مسلسل شور ایک مسحور کن موسیقی کا رس کانوں میں گھولتا ہے۔ نیلگوں آسمان پر روئی کے سفید گالوں کی مانند بادل ایک عجیب سماں پیش کرتے ہیں۔ اور جب دھوپ نکلتی ہے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف چاندی کی طرح چمکنے لگتی ہے۔

بدلتے زمانے اور جدید تہذیب سے صدیوں دور اس دلفریب وادی کو جس قدر قدرت نے لاجواب حسن کی دولت سے سرفراز کیا ہے وہاں اسی قدر غربت' افلاس اور تنگدستی بھی پائی جاتی ہے۔ کاغان کے لوگوں کے لئے یہاں معمولی کھیتی باڑی اور بھیڑ بکریاں پالنے کے سوا کوئی ذریعہ روزگار نہیں۔ یہ سلسلہ بھی چند لوگوں تک ہی محدود ہے۔ عام لوگ' تہذیب' علم اور زندگی کی گوناگوں آسائشوں سے محروم بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے معصوم بچے ترقی یافتہ دنیا کی حقیقی مسرتوں' راحتوں اور لطافتوں ناآشنا ہیں۔

فاران میں ریسٹ ہاؤس کی بکنگ ہم پہلے سے نہ کرا سکے تھے۔ میر کارواں اور اسحاق جاوید کو رہائش کا بندوبست کرنے کا کام سونپ دیا گیا۔ فاران میں چونکہ ان دنوں رش نہ تھا اس لئے یہ مسئلہ جلدی حل ہو گیا اور ہمیں پاکستان سیاحتی کارپوریشن کے آرام دہ ریسٹ ہاؤس میں سولہ روپے یومیہ فی کس کے حساب سے دو کمرے مل گئے۔ کھانے کے چودہ روپے یومیہ الگ تھے۔ خلیل صابری' مجید گوہر اور مولوی ابراہیم تو کمروں میں جاتے ہی چارپائیوں پر چت لیٹ گئے۔ مجید گنجا اپنا سر دھو کر سر میں بال اگانے والا تیل لگانے لگا۔ البتہ دوسرے سیاح ہاتھ منہ دھو کر اس رنگین اور پرفضا وادی کی سیر کو نکل گئے۔ اور سورج غروب ہونے کے بعد لوٹے۔ مجید گوہر اور خلیل صابری دونوں کو ہلکی ہلکی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ نواز نے اپنے جادو کے تھیلے میں سے اے پی سی اور اسپرین کی گولیاں انہیں کھلا دیں۔ دو گھنٹے بعد ان کی طبیعت قدرے بحال ہو گئی۔ مولوی ابراہیم خاصا گھبرایا ہوا تھا' کیونکہ اسے یہ فکر دامنگیر تھا کہ واپسی اسی راستے سے ہو گی۔ میر کارواں البتہ ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا کیونکہ اسے کاغان گاؤں سے چلتے وقت ایک فوجی سپاہی نے میجر قدیر کا پتہ بتا دیا تھا جو کہ فاران سے صرف دس میل آگے بٹاکنڈی میں مقیم تھا۔

رات ساڑھے آٹھ بجے کھانا چن دیا گیا۔ تمام بھوکے شیر' بھڑیئے اور گیدڑ حملہ آور ہو گئے اور منٹوں میں سب کچھ چٹ کر گئے۔ مزید کھانا منگوایا گیا۔ وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے صاف ہو گیا۔ میر کارواں' مجید گنجا اور مولوی ابراہیم تینوں ابھی بھوکے تھے۔ مزید کھانا لانے کی

فرمائش کی گئی تو ریسٹ ہاؤس کے بیروں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ چودہ روپے یومیہ میں اس سے زیادہ کھانا نہیں دیا جا سکتا۔ اسماعیل قمر غصے سے تلملا اٹھا اور منیجر کو بلا کر شکایت کی۔ منیجر نے بھی محض معذرت کرنے پر اکتفا کیا۔ میر کارواں نے ایکسٹرا پیمنٹ کر کے کھانا منگوانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ دوسرے مکینوں کا حصہ منیجر ان تین بھیڑیوں کو دینے پر راضی نہ ہوا۔ مجبوراً" ان تین بندو قچیوں کو آملیٹ اور ڈبل روٹی سے ہی پیٹ بھرنا پڑا۔ میر کارواں احتجاج کے طور پر ریسٹ ہاؤس چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر دوستوں نے اسے سمجھایا کہ ان ڈھول جیسی توندوں کا پر کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں اس لئے کہیں اور جانا بے کار ہو گا۔

کھانے کے بعد میر کارواں نے مشیروں کا اجلاس طلب کیا جس میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے سفیروں (ڈرائیوروں) نے بھی شرکت کی۔ اسحاق جاوید نے اگلی صبح دس بجے جھیل سیف الملوک چلنے کی تجویز پیش کر دی جس کی تمام مشیروں نے پرزور تائید کی۔ مگر سفیروں نے بتایا کہ سڑک ایک بہت بڑی چٹان (لینڈ سلائیڈ) گرنے سے ایک جگہ پر ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اس لئے وہاں جیپوں کا پہنچنا ممکن نہیں۔ لہٰذا وہاں تک پیدل ہی جانا پڑے گا۔ یہ مژدہ جان لیوا سن کر تمام دوستوں کے اوسان خطا ہونے لگے کیونکہ پورے پانچ میل پیدل چل کر فاران سے 2300 فٹ کی بلندی پر جھیل سیف الملوک تک پہنچنا بڑا ہی جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہمارے سیاحوں نے یہی بہتر خیال کیا کہ کل جیپوں پر بٹاکنڈی جا کر میجر قدیر سے مل لیا جائے اور اس سے مدد لے کر جھیل سیف الملوک کی زیارت کی جائے۔ یہ فیصلہ طے پا جانے کے بعد قوالی کا پروگرام بنا۔ میر کارواں نے مولوی ابراہیم کی مدد سے الاپ لگانے شروع کئے۔ قوالی کے بول تھے۔

دو دو نان پاؤ پا حلوہ
جو کھلائے پائے جلوہ
دو دو نان پاؤ پا حلوہ

اسحاق جاوید کہنے لگا کہ سارے فاران کا اناج پیٹ میں اتارنے کے بعد بھی یہ شخص بھوکا ہے۔ خلیل صابری نے فقرہ چست کیا کہ اس سے آپ کا کیا بنے گا۔ اس کی بجائے یہ

کہو:

سو سو نان نو من حلوہ
جو کھلائے پائے جلوہ

مجید گنجے نے اگلا شعر اگل دیا۔

گوشت لانا دو ٹن کلوہ
کہیں ہو نہ جائے بلوہ
سو سو نان نو من حلوہ

پھر مجید گوہر نے طبع آزمائی کی۔

سن اے جانشین نلوہ
آ گیا ہے گھی بھی سلوا
سو سو نان نو من حلوہ

اس سے سبھی دوست محظوظ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد میر کارواں مجید گوہر' مولوی ابراہیم اور اسحاق جاوید بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ اسماعیل قمر مینڈھا بن کر مختلف آوازیں نکالنے لگا۔ مجید گوہر پڑوسی گجر کی گائے باہر نکال رہا تھا جو بلا اجازت اس کے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ مولوی ابراہیم اپنے بڑے لڑکے کو دوکان پر جانے کی تلقین کرنے لگا۔ اسحاق جاوید اپنے تمام کپڑے اتار کر چارپائی کے نیچے فرش پر لیٹ گیا۔ ہم سفر کے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ان لوگوں کو بھنگ کھلا دی گئی تھی۔ مگر بھنگ کب' کیسے اور کس نے کھلائی؟ یہ بات ابھی تک صیغہ راز میں تھی۔ نواز نے تھیلے سے ایک ڈبیہ نکال کر اس میں تھوڑا سا سفوف ان بھنگ زدہ حضرات کو کھلا دیا۔ آدھ گھنٹے بعد نشہ کم ہونے پر وہ لوگ سو گئے۔ مجید گنجے' محمد نواز' افضل بٹ اور خلیل صابری نے ان مستانوں کو مستی کا پورا پورا سرور بہم پہنچانے کی غرض سے پلنگوں سے اٹھا کر قالین پر لٹا دیا اور ان کی جیبیں بھی خالی کر دیں پھر کافی رات گزرنے کے بعد باقی سیاح بھی ہنستے ہنستے سو گئے۔

علی الصبح جب دوست نیند سے بیدار ہوئے تو اسماعیل قمر' مجید گوہر' اسحاق جاوید اور

مولوی ابراہیم کے موڈ سخت خراب تھے' اسحاق جاوید مسلسل مجید گنجے کو گھور رہا تھا جو اپنے جوتے پالش کرنے میں مگن تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایسی قبیح حرکت اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مجید گوہر کو اتنا شکوہ تھا کہ اسے قبل از وقت کیوں متنبہ نہیں کیا گیا۔ مولوی ابراہیم اس بے ہودہ مذاق پر سخت نالاں تھا۔ طیش میں اس کا نچلا ہونٹ کچھ زیادہ ہی نیچے لٹک گیا تھا۔ اسماعیل قمر کو اس پر اعتراض تھا کہ اس غیر شریفانہ جسارت کے لئے صرف ان چہار درویشوں کا ہی انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا اور دوسرے سیاحوں کو کس خوشی میں معاف کیا گیا۔ بہرحال تھوڑی سی گرما گرمی کے بعد یہ معاملہ قافلے کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ مجھے جج کے فرائض تفویض کئے گئے۔ کاروائی مقدمہ خاصی دلچسپ تھی۔ مستغیثوں کا اصرار تھا کہ ملزم ایک عادی مجرم ہے اور کئی بار رنگے ہاتھوں پکڑے جانے اور پھر اعتراف جرم کر کے معافی مانگنے کے باوجود بھی بڑی ڈھٹائی سے دوستوں کے ساتھ بے ہودہ مذاق کرتا ہے اور پھر ان کی بے بسی اور بے چارگی دیکھ کر روحانی تسکین حاصل کرتا ہے۔ کل رات بھی اس نے ڈاک بنگلہ کے بیروں سے ساز باز کر کے چار کوہ پیماؤں کو دھوکے اور فریب سے بھنگ کھلا دی تھی اور جب مستغیث نشہ کی وجہ سے ترنگ میں آ گئے تو اس نے بڑی نازیبا حرکت کی اور ان کی جیبیں صاف کر ڈالیں۔ مستغیثوں نے مزید کہا کہ ملزم نے اپنی ناروا حرکتوں اور نامناسب رویہ کی وجہ سے آداب قافلہ کے خلاف تمام ساتھیوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ انہوں نے ملزم کو قرار واقعی سزا دینے کی درخواست کی۔

ملزم گنجے نے اپنے خلاف سنگین الزامات بڑے سکون اور صبر سے سننے کے بعد اقرار کیا کہ بے شک اس نے دوستوں کو بھنگ جیسی پیاری نعمت سے نوازا ہے۔ انہیں تو ممنون ہونا چاہئے تھا کیونکہ انہیں ہر قسم کی دل لگی اور تفریح مہیا کی گئی ہے۔ مجید گنجے نے اپنی صفائی میں ضابطہ قافلہ کی دفعات 2' 3' 4 کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ زندہ دلی' بے تکلفی اور مذاق کرنے اور برداشت کرنے کی بدولت ہی تو اسے قافلے میں شامل کیا گیا ہے۔ آج یہ جرم کیسے بن گیا؟ خلیل صابری اور محمد نواز نے بھی ملزم کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ملزم بے گناہ ہے اور شرکاء قافلہ کو اس کا احسان مند ہونا چاہئے کہ اس نے انہیں بھنگ جیسے پاکیزہ اور کیف آور نشہ سے روشناس کرایا ہے۔ افضل بٹ نے تو الٹا مستغیثوں کو ہی گناہگار ٹھہرایا۔ اس نے کہا کہ مستغیث کم ظرف ہیں۔ انہوں نے مذاق برداشت نہ کر کے دفعہ نمبر

4 کی خلاف ورزی کی ہے۔ چنانچہ مدلل بحث سننے کے بعد میں نے ملزم کو بھنگ کھلانے اور ایسے ناواجب مذاق کرنے کے جرم سے بری الذمہ قرار دے دیا۔ البتہ جیبوں کی تلاشی لینے کے الزام میں مجید گنجے کو دس پکے گانے سننے کی سزا دی۔ مجید گنجے نے پکے گانے سننے کی بجائے قید ہونا زیادہ سہل خیال کیا۔ اس نے اس سخت سزا میں تخفیف کے لئے بہت منت سماجت کی۔ مگر اس کی ہٹ دھرمی کے پیش نظر مزید سو شعر سننے کا بھی حکم جاری کر دیا۔ یہ سنتے ہی مجید گنجے کی تمام بشاشت کافور ہو گئی اور سر جھکا کر دو زانو بیٹھ گیا مستغیثوں نے تالیاں بجا کر میرے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم ساڑھے نو بجے میجر قدیر سے ملنے بٹاکنڈی روانہ ہوئے۔ دس میل کا یہ کٹھن سفر ہم نے پون گھنٹے میں طے کیا۔ یہ جگہ 8900 فٹ اونچی ہے۔ یہاں سے ایک پہاڑی راستہ لالہ زار کے دل فریب مقام تک بھی جاتا ہے۔ بٹاکنڈی میں قمر نے ایک دوکاندار سے ملٹری کیمپ کے متعلق دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ ڈیڑھ میل اوپر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ ہم جیپوں پر بیٹھ کر اس پتھریلے راستے کو ناپتے ہوئے وہاں پہنچے اور تھوڑی سی تگ و دو کے بعد قدیر کو ڈھونڈ لیا جو میجر کی بجائے صوبیدار میجر نکلا۔ اسماعیل قمر آگے بڑھ کر قدیر سے بغل گیر ہو گیا۔ صوبیدار میجر مخمصے کی حالت میں قمر کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ قمر نے جب اسے اپنے متعلق بتایا تو پھر اس کی یادداشت بحال ہوئی۔ تمام دوستوں نے صوبیدار میجر قدیر اور میر کارواں کی خفت اور اضطراب کو محسوس کر لیا۔ اسی اضطراب کے عالم میں میر کارواں نے دوسرے ساتھیوں کا تعارف قدیر سے کروایا۔ صوبیدار میجر نے ہمیں ایک بارک میں چارپائیوں پر بٹھا کر ایک سپاہی کو بسکٹ اور چائے لانے کو بھیج دیا۔ پھر میر کارواں اور قدیر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ چائے پینے کے دوران اسحاق جاوید نے صوبیدار میجر قدیر سے آس پاس کسی قابل دید مقام کے متعلق استفسار کیا تو اس نے لالہ زار دیکھنے کی تاکید کی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم صوبیدار میجر قدیر سے اجازت لے کر لالہ زار چلے گئے۔ ساڑھے دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع لالہ زار کو بلا شبہہ وادی کاغان کا حسین ترین مقام کہا جا سکتا ہے۔ جنت کے اس ٹکڑے کی فضا میں وہ سحر انگیزی ہے جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر جانب سبزہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ پرندوں کی نغمہ سرائی' رنگ برنگے دل کش پھول اور ان کی مسحور کن

خوشبو' پہاڑی جھرنوں کا شور' یہ سب مل کر کسی شاعرہ کی تخیلاتی دنیا کا تاثر دیتے ہیں۔ ہر چیز پر تازگی' شگفتگی اور انوکھا بانکپن ہے۔ یہاں بھی سیاحوں کی سہولت کے لئے ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے۔ اسحاق جاوید اس خوبصورت جگہ کو دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھا:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مجید گوہر قدرت کے یہ نادر کرشمے دیکھ کر اللہ اکبر' اللہ اکبر کی صدائیں لگانے لگا۔ مجید گنجا اپنے تمام سابقہ تجربات فراموش کر کے' سا نگلہ ہل کو برا بھلا کہنے لگا۔ اسماعیل قمر جو صوبیدار میجر قدیر سے ملنے کے بعد دل برداشتہ دکھائی دیتا تھا' اس جادو نگری کے طلسم ہوشربا سے گھائل نظر آتا تھا۔ خلیل صابری اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ وہ اس طرف پہلے کیوں نہ آیا۔ نواز اور افضل بٹ اپنے ملک میں ایسے روح پرور اور جاذب نظر مناظر دیکھ کر خوشی سے جھوم رہے تھے۔ مولوی ابراہیم نے تو دوستوں کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اب یہ جگہ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ ہم دوپہر کا کھانا کھانے ریسٹ ہاؤس میں گئے۔ کھانا دو گھنٹے کے بعد تیار کر کے ملتا تھا۔ اس لئے ہم لوگ آرڈر دے کر اس پراسرار وادی کی رنگینیوں میں

میر کارواں کی خود سری' خود فریبی اور خود نمائی کا تذکرہ کیا اور اسے ہٹا کر نیا امیر مقرر کرنے پر زور دیا۔ اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو قمر کے حق میں صرف دو ووٹ ڈالے گئے۔ چھ ووٹ اس کے خلاف تھے اور ایک غیر جانبدار رہا۔ عدم اعتماد کی تحریک کثرت رائے سے منظور ہو چکی تھی۔ نئے امیر کا الیکشن ہوا تو تمام ساتھیوں نے مجید گوہر کو متفقہ طور پر امیر چن لیا۔ نئے امیر نے مجید گنجے کو اپنی جگہ خزانچی مقرر کیا تو سبھی دوستوں نے بیک وقت اس کی سخت مخالفت کی۔ اسحاق جاوید نے انکشاف کیا کہ وہ تین برس محکمہ چنگی میں بطور محرر کام کر چکا ہے اس لئے رقم کے معاملے میں اس پر اعتماد کرنا سراسر حماقت ہو گی۔ خلیل صابری کہنے لگا کہ وہ اس امر کا عینی شاہد ہے کہ مجید گنجا مسجد اور عید میلاد النبی کے نام پر چندہ اکٹھا کر کے ہڑپ کر جاتا رہا ہے اس پر بھروسہ کرنا کامن فنڈ سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے۔ اسماعیل قمر نے کہا کہ وہ اپنے غریب محلے داروں کی پوری رقم خورد برد کر گیا تھا۔ اب اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ نواز نے بتایا کہ مجید گنجا کئی لوگوں کی امانتیں بغیر ڈکار لئے ہضم کر گیا ہے۔ مولوی ابراہیم نے پنجابی کی ایک ضرب المثل سنا دی---- "مکھن دا راکھا بلا"____ مجید گنجے کے متعلق دوستوں کے اتنے مایوس کن خیالات سن کر امیر نے مجید گنجے سے دو ہزار روپے کی بنک گارنٹی طلب کر لی اور کہا کہ جب تک وہ بنک گارنٹی نہیں دے

242

243

اور مولوی ابراہیم نے ہمارا مزید ساتھ دینے کی بجائے واپسی کے قصد کا مصمم ارادہ ظاہر کر دیا۔ افضل بٹ کے پاؤں سوجنے لگے۔ ہماری منت سماجت کے باوجود بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مجید گنجے نے جب انہیں گائیڈ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ جھیل سیف الملوک مشہور و معروف کوہ قاف کے دامن میں واقع ہے اور اس میں پریاں غسل کرتی ہیں تو مولوی ابراہیم کی رال ٹپکنے لگی۔ خلیل صابری نے آنکھیں جھپکنی شروع کر دیں۔ مجید گوہر کی رگ عشق پھڑکنے لگی اور افضل بٹ کے پاؤں کی سوجن غائب ہو گئی۔ یہ چاروں کوہ پیما ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم ایک بار پھر اس ناقابل تسخیر چڑھائی کو عبور کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ تھوڑا سا آگے گئے تو چاندی کی طرح چمکتا ہوا بہت بڑا گلیشئر (برف کا تودہ) نظر آیا۔ ہم اس کے قریب پہنچے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ اوپر' بہت اوپر' جہاں تک ہماری نگاہیں دیکھ سکتی تھیں' برف کا ایک منجمد دریا ہمارے سامنے

مجید گنجے کے پاس پہنچے۔ وہ موٹے کپڑوں کی وجہ سے معجزانہ طور پر بال بال بچ گیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد کوہ پیما اور زیادہ محتاط ہو گئے۔ اور وہ رسہ تھام کر آہستہ آہستہ گلیشئر کو پار کر گئے۔ نصف گھنٹہ کی مزید اعصاب شکن چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم لوگ جھیل سیف الملوک کے کنارے کھڑے قدرت کی رعنائیوں کا یہ عظیم شاہکار اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس جگہ کا بے مثل حسن اور لاجواب دل کشی دیکھ کر ہر آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

جھیل سیف الملوک 10,200 کی بلندی پر واقع ہے اور دنیا کی بلند ترین جھیلوں میں سے ایک ہے۔ اس کا نیلگوں شفاف اور ساکت پانی آئینے کی مانند اردگرد کی برف پوش پہاڑوں کا عکس پیش کرتا ہے۔ سارا دن جتنی بار آسمان رنگ بدلتا ہے جھیل کا پانی بھی رنگ تبدیل کرتا ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر طرف ایک بے کراں سکوت' سناٹا اور خاموشی طاری رہتی ہے۔ صرف کبھی کبھار دور سے گائے' بھیڑ یا بکری کی

نے خوبرو شہزادے کو برسوں اس جادو نگری میں میں اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنائے رکھا۔ اسی شہزادے کے نام پر اس جھیل کا نام سیف الملوک مشہور ہے۔

ایک گھنٹہ کشتی میں سیر کرنے کے بعد ہم لوگ دوبارہ کنارے پر اتر گئے۔ برف پوش پہاڑ، گنگناتے چشمے، چیڑ اور صنوبر کے سرسبز و شاداب جنگل اس وادی کا انمول خزانہ ہیں۔ صاف و شفاف جھیلیں، پہاڑوں کے دامن برگ و بار سے لدے ہوئے درخت تیز و تند دریا اور انواع و اقسام کے گلہائے رنگا رنگ سب قدرت ایزدی کی گواہی دیتے ہیں۔ شہری ہنگامہ خیز زندگی میں کھوئے ہوئے روحانی سکون کے لئے اس وادی جنت نشان کا اچھوتا حسن، صحت مند فضا اور فرحت بخش ماحول جادو کا اثر رکھتا ہے۔

دن ڈھلے ہم لوگ اس پراسرار جھیل کو الوداع کہہ کر فاران کی سمت چل پڑے۔

○

پاپی پیٹ کی خاطر

ایک صاحب کسی شخص کے ہاں کھانا کھانے گئے۔ میزبان کے ملازم نے ان کا جثہ دیکھ کر ان کے آگے بیس روٹیاں اور دو ڈونگے سالن کے رکھے۔ مہمان نے بڑے رعب سے ملازم کو حکم دیا---- "کیا تم نے مجھے گدھا سمجھ رکھا ہے؟ اٹھا لو اوپر سے ایک روٹی" ____ ملازم نے حکم کی تعمیل کی۔ جب مہمان پوری انیس روٹیاں پیٹ میں اتار چکا تو ملازم سے کہنے لگا کہ اب ایک چوتھائی روٹی اور دینا۔ وہ چوتھائی کھا کر کہنے لگا---- "اس چوتھائی روٹی کا بہت لطف آیا ہے۔ ذرا دو چار روٹیوں کی چوتھائیاں کر کے لے آؤ" ____ اور پھر وہ بھی ہڑپ کر گیا۔

گوجرانوالہ نامی گرامی پہلوانوں کی وجہ سے ہی مشہور نہیں بلکہ خوش خوراکی کے سلسلے میں بھی کافی نام پیدا کر چکا ہے۔ یہاں کے بسیار خور دنیا میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ رستم اور سہراب کو بعض تاریخ دانوں نے ناحق بدنام کر رکھا ہے۔ ان دونوں جتنی خوراک تو ہمارے پہلوانوں کے بچے کھا جاتے ہیں۔ ابھی چند روز قبل کا واقعہ ہے۔ ایک آدمی نے اپنے لئے "جوارش جالینوس" تیار کرائی جو ان کی ایک ماہ کی خوراک تھی۔ وہ پوری جوارش ان کے آٹھ سالہ پوتے اور چھ سالہ پوتی نے ایک دن میں صاف کر دی۔ وہ آدمی انہیں حکیم اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا مگر انہوں نے بچوں کو مکمل تندرست ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

پچھلے دنوں ایک لڑکا کسی دوسرے لڑکے سے شرط لگا بیٹھا کہ وہ سیون اپ کی بوتلوں کا ایک کریٹ پی جائے گا۔ طے یہ پایا کہ دو درجن بوتلیں ایک ہی وقت میں یکے بعد دیگرے پینی ہیں۔ اگر وہ اتنی بوتلیں پی جائے تو اسے سو روپے انعام دیا جائے گا اور فریق مخالف بوتلوں کی قیمت بھی ادا کرے گا اور ناکامی کی صورت میں بوتلوں کی قیمت کے علاوہ سو روپے فریق ثانی کو دینے ہوں گے۔ چنانچہ پہلا لڑکا تھوڑی دیر کے لئے بازار چلا گیا۔ واپس آ کر پورا کریٹ یعنی دو درجن بوتلیں پی کر شرط کے سو روپے جیت گیا۔ وہاں کھڑے ایک آدمی

نے اس سے پوچھا کہ تم باہر کیا لینے گئے تھے؟ اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔۔۔۔
"میں نے پہلے اتنی بوتلیں کبھی نہیں پی تھیں' اس لئے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں ایسا کر سکوں گا۔ چنانچہ باہر بازار میں جا کر ایک کریٹ بوتلیں پی کر آیا ہوں۔"

ایک دن موسم برسات میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں ایک پرانے دوست سے ملنے گیا۔ اس کے پاس ایک پہلوان بیٹھا تھا۔ وہ دونوں "فائن ڈے" منانے کے سلسلے میں گوشت منگوا کر خود پکانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میرا دوست پہلوان سے پوچھنے لگا کہ کتنا گوشت منگوانا چاہئے۔ اس نے جواب دیا کہ دس کلو کافی ہے۔ پہلے نے پوچھا' کہیں کم نہ ہو۔ دوسرا کہنے لگا کہ ہم دونوں کے لئے کافی ہے' البتہ کوئی مہمان آ گیا تو واقعی تھوڑا ہو گا۔

سمیت اسے جلیبیاں کھانی ہوں گی۔ اس نے جواب دیا' اطمینان رکھیں ضرور کھاؤں گا' اور وہ تمام جلیبیاں نچوڑ کر ان کا براہ کھا گیا۔ پھر تمام شیرا جو بالٹی میں جمع تھا' بالٹی کو منہ لگا کر آنکھیں بند کر کے پی گیا اور شرط کے سو روپے جیت لئے۔

ایک ان پڑھ پہلوان کے ساتھ ایک آدمی نے شرط لگائی کہ وہ ایک ہزار بیٹھکیں ایک ہی وقت میں بغیر سانس لئے نکال دے تو وہ اسے پانچ کلو دودھ اور پانچ کلو لنگڑا آم کھلا دے گا۔ پہلوان نے بیٹھکیں نکالنی شروع کر دیں۔ جب ایک سو ستر بیٹھکیں ہو گئیں تو حریف نے ایک سو چھیاسٹھ گنیں۔ پہلوان نے اگلی بیٹھک نکال کر ایک سو اکہتر کہا اور دوسری طرف سے ایک سو بہتر کی آواز سنائی دی۔ یہ سن کر پہلوان غصے میں آ گیا اور دھمکی دے کر

وہ کھانا تو آٹھ سو کا کھائیں گے"۔۔۔۔

وہ امیر آدمی تھے۔ انہوں نے بہت لمبا چوڑا انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب یہ ٹڈی دل وہاں پہنچا تو انہیں پہلے پانی پلایا گیا۔ میرے ایک عزیز دوست جو گوجرانوالہ میں تین سال جج رہ چکے ہیں' ان سورماؤں کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ ان کا پیٹ کون بھر سکتا ہے؟ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے اور راستے میں آنے والی ہر شے کا صفایا کرتے چلے گئے۔ اس تباہ کن قافلے کا ایک حصہ اس جانب مڑ گیا جس طرف دیگیں پڑی تھیں۔ یہ خود ہی دیگوں سے کھانا نکال کر اپنی مدد آپ کا ولولہ انگیز مظاہرہ کرنے لگے۔ گھر والے اور

خوری میں استاد یا گرو مانا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اکیلا دس کلو مچھلی (تلی ہوئی) بڑے آرام کے ساتھ کھا لیتا ہے۔ تمام خوش خوراک اس کی رائے کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو لیکچر بھی دیتا ہے۔ اس کے چند اقوال زریں مندرجہ ذیل ہیں:

کسی بھی پر تکلف دعوت پر جانے سے دس گھنٹے قبل پیٹ خالی رکھیں۔

جب کھانے کے لئے بلایا جائے تو دوڑ کر پنڈال میں پہلے پہنچنے کی کوشش کریں۔

جس راستہ سے کھانا آ رہا ہو اس راستہ کے مقام آغاز پر کھڑے ہوں یعنی گھات

اصرار کے باوجود بھی ضیاء اللہ ثما انہیں تکے کھلانے پر رضامند نہ ہوا تو وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔۔۔۔ "تم نے ان لوگوں کو کھانا کیوں نہیں کھلایا؟"

"تم نہیں جانتے"۔۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔۔ "دو روز قبل یہ دونوں اڑھائی سو کے تکے کھا گئے تھے۔"

ایک شیخ صاحب کے گھر پر تین چار پہلوان شام کے بعد کسی کام سے گئے۔ شیخ صاحب نے ازراہ مروت پوچھا۔۔۔۔ "بھئی' کھانے کا وقت ہے۔ بلا تکلف بتائیں کھانا کھائیں گے؟"

۔۔۔۔ انہوں نے بیک زبان جواب دیا۔۔۔۔ "ضرور کھائیں گے"۔۔۔۔ شیخ کے اوسان خطا ہونے لگے تو انہوں نے فوراً" اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔۔۔۔ "یار مذاق نہ کرو سچ بتاؤ چائے پیو گے؟"۔۔۔۔ انہوں نے پھر کورس میں جواب دیا۔۔۔۔ "نہیں شیخ جی! پہلے کھانا کھائیں گے بعد میں چائے پی لیں گے"۔۔۔۔ شیخ صاحب نے کہا۔۔۔۔ "تمہاری دل لگی کی عادت نہیں گئی۔ کہو پانی پیو گے؟"۔۔۔۔ اس دفعہ پہلوان بلند آواز سے بولے۔۔۔۔ "شیخ جی! کھانا منگواؤ کھانا۔ ہم ٹلنے والے نہیں"۔۔۔۔ شیخ صاحب کہنے لگے۔۔۔۔ "اچھا تمہاری مرضی۔ میں پہلے ہی جانتا تھا تم مذاق سے باز نہیں آؤ گے"۔۔۔۔ اور وہ خاموش ہو گئے۔

خوش خوراکوں کو اکثر بن بلائے دعوتوں میں شرکت کرتے دیکھا گیا ہے۔ اس کے لئے صاحب خانہ سے تعارف یا جان پہچان ضروری نہیں۔ اگر کسی ایک بسیار خور کو صاحب خانہ غلطی سے بلا لے تو دوسرے اناج دشمن کو دعوت میں شمولیت کا جواز مل جاتا ہے اور میزبان غریب کی شامت آ جاتی ہے۔ مجھے بھی ایک دفعہ ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اس طرح کہ حاجی محمد اسلم بٹ صاحب گوجرانوالہ کارپوریشن کے میئر منتخب ہوئے تو میں نے ان کے اعزاز میں دعوت دی۔ کوئی تین سو کے قریب لوگ مدعو تھے۔ میں نے میئر صاحب کو کچھ خالی کارڈ بھیج دیئے تاکہ وہ اپنے خاص دوستوں کو مدعو کر سکیں۔ حاجی محمد اسلم بٹ صاحب نے مروت میں آ کر چند بلا خوروں کو بھی اس دعوت میں مدعو کر لیا۔ دعوت والے روز میرے بڑے بھائی صاحب نے مجھ سے پوچھا' کیا کچھ پکوا رہے ہو اور فی کس کتنا پکوا رہے ہو؟ میں نے انہیں بتایا کہ آدھا مرغ اور آدھا کلو گوشت فی کس کے حساب سے پکوا

منگوا لو۔ میں نے کہا کہ کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی مگر وہ نہ مانے اور ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مزید سامان منگوا لیا۔

شام کو مہمان آنے شروع ہوئے تو میں حیران ہوا کہ کچھ لوگ "جان نہ پہچان میں تیرا مہمان" کے مصداق بڑی بے تکلفی سے چلے آ رہے ہیں اور عجب شان دلربائی کے ساتھ کرسیوں پر جلوہ افروز ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کھانا چن کر مہمانوں کو بلایا گیا تو وہ لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ پہلوانوں نے جس طرح اپنی پلیٹیں اوور لوڈ کیں وہ میری سمجھ سے بالا کمال تھا۔ تجربے کے بغیر کوئی شخص ایک پلیٹ میں اتنا کچھ نہیں ڈال سکتا۔ پھر جس عجلت اور پھرتی سے انہوں نے بھری ہوئی پلیٹیں اپنی توندوں میں اتاریں وہ مسمریزم کا کرتب تھا۔ اس کے بعد آئس کریم پر جو گھمسان کا رن پڑا وہ دیکھنے والوں کے لئے بھی باعث ندامت تھا۔ لیکن میں نے خدائے ذوالجلال کا شکر ادا کیا کہ میں نے اپنے حساب سے کھانا نہیں پکوایا تھا۔ بھائی جان کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو ندامت کے ساتھ خفت بھی اٹھانا پڑتی۔

جی ٹی بس سروس میں ایک کلینر رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ اپنے دور کا بسیار خوری کا چیمپئن تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ کسی نے کبھی اسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھلایا۔ ایک دن چند ڈرائیور اور کلینر اسے ایک شادی پر لے گئے اور اسے دیگوں کے پاس بٹھا دیا۔ اس نے کھانا شروع کیا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ اس کے ہاتھ اور منہ مسلسل چلتے رہے اور کھانا دیگوں سے سیدھا اس کی توند میں منتقل ہوتا رہا۔ اس روز پہلی دفعہ لگتا تھا کہ رحمت علی کا پیٹ بھر گیا ہے۔ وہ بڑی ترنگ اور خماری کی کیفیت میں اٹھا اور پھر سب کے سامنے منہ کے بل گر پڑا۔ اس نے اپنی آخری خواہش پوری ہونے کی خوشی میں جان دے دی۔ یار دوستوں نے اس عظیم قربانی کے عوض اسے "شہید خوراک" کا خطاب عنایت کیا۔

ہم پانچ چھ دوست ایک دعوت ولیمہ میں شریک ہوئے۔ ہجوم بہت تھا۔ خوش قسمتی سے کھانے کے لئے ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ مل گئی۔ ہمارے علاوہ وہاں دو اجنبی لڑکے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ ہمیں اطمینان تھا کہ کوئی دیو نما پہلوان ہمارے کمرے میں موجود نہیں' اس لئے سکون کے ساتھ کھانا کھا لیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرے میں کھانا پہنچنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دو لڑکے جو دروازے میں کھڑے تھے' اندر آ

اس کمرے میں آیا وہ ان دونوں نے سمیٹ لیا۔ ڈونگوں اور پراتوں میں جو سالن آتا' اس میں سے تمام بوٹیاں وہ اپنے ہاتھوں سے نکال کر اپنی پلیٹوں میں رکھ لیتے۔ اس کمرے میں جو باقی پانچ آدمی تھے' ان تک سوائے شوربے کے اور کچھ نہ پہنچا۔

بیرا سویٹ ڈش یعنی کسٹرڈ کی ایک پرات لے آیا۔ ان دونوں نے نئی پلیٹیں لے کر پرات اپنی پلیٹوں میں انڈیلنی اور غائب کرنی شروع کر دی۔ اس دوران ہم خوش ہوئے کہ سالن کی ایک اور پرات آ گئی ہے اور اب ہم اطمینان سے کھائیں گے مگر ان دونوں نو

چاول سخت گرم تھے۔ کتا بری طرح جھلسنے لگا۔ اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ دیگ میں کتا گر گیا ہے۔ اہل خانہ پر غشی طاری ہونے لگی۔ غریب آدمی تھا۔ اس کو ضائع کر کے دوسری دیگ پکانے کی بیچارے میں سکت نہ تھی۔ آخر لوگوں نے امام مسجد سے فتویٰ لینے کی صلاح دی۔ مولوی صاحب آئے۔ اہل خانہ نے روتے ہوئے تمام ماجرا بیان کیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ کتا گاؤں کا ہے یا باہر کا؟ دو آدمیوں نے شناخت کر کے کہا کہ کتا گاؤں کا ہی ہے۔ مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ پہلے دیگ سے کتے کو نکالو۔ پھر اوپر سے تھوڑے تھوڑے حلوا اتار کر پھینک دو۔ [illegible] مگر استعمال

کرتا جا رہا تھا کہ رب العزت میری لاج اب تمہارے ہاتھ ہے- مقابلے کے وقت دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں اور میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں- میں نے ابھی دو پیس ٹانگوں کے ہی کھائے تھے کہ وہ ہرکولیس کا بچہ میرا حریف دو مرغ ٹکانے لگا چکا تھا- فریق ثانی کی یہ دیدہ دلیری اور پھرتی دیکھ کر احساس شکست نے میرے دل و دماغ پر غلبہ پانا شروع کر دیا- میں نے مرغ کی دو ہی ٹانگیں کھائی تھیں کہ میں برغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا- اب میں دل ہی دل میں مجید گنجے کو کوس رہا تھا جس نے نہ جانے کون سے جرم کا مجھ سے بدلہ لیا تھا- اتنی دیر میں وہ کریلا پہلوان تیسرا مرغ بھی چٹ کر چکا تھا- اب میری حالت غیر ہونے لگی- میں ایک اور پیس آگے بڑھ کر اٹھانے لگا تو دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور میری آنکھ کھل گئی- میں چارپائی کے نیچے پڑا تھا- میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا- میری بیگم پاس کھڑی مجھے غصے سے گھور رہی تھی- میں نے جب ایک بھیانک خواب دیکھنے اور چارپائی سے نیچے گرنے کے بارے میں بتایا تو وہ سخت سرزنش کرنے لگی---- "تمہیں ہزار بار منع کیا ہے کہ سونے سے قبل جاسوسی اور خوفناک کہانیاں پڑھنا چھوڑ دو مگر تم باز نہیں آتے-"

○

لنگوٹیا

چالیس برس قبل ایک مزاحیہ نظم (پیروڈی) بڑی مشہور ہوئی تھی:

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
نتھو کے باغ سے وہ نارنگیاں چرانا
گھر سے سکول جانا' رستے سے بھاگ جانا
ابا سے روز پٹنا' امی سے مار کھانا
جغرافیہ ہمارا دشمن تھا اک پرانا
آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ

بچپن کی حسین اور رنگین یادیں انسان کا سرمایہ حیات ہوتی ہیں- ایسے یار دوست' ہم جماعت اور ساتھی جن کے ساتھ زندگی کا بہترین وقت گزرا ہو' ان کی شیریں یادیں زندہ جاوید داستانوں کی طرح دلوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں-

ثناء اللہ اس کے بعد تخریب کاری پر اتر آئے۔ ثناء اللہ جن دنوں سکول سے نکالا گیا تھا ان دنوں اس نے شیخ فضل دین کی ٹک شاپ کو ہی اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ وہاں ہی سے وہ احکامات جاری کرتا تھا۔

ثناء اللہ کو ایک ہم جماعت نیاز احمد سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ نیاز احمد اچھا لڑکا تھا۔ وہ ثناء اللہ سے اکثر جھینپتا پھرتا تھا۔ ثناء اللہ اس کو بہت زچ کرتا تھا۔ اس پر فقرے کستا رہتا۔ کبھی اس کے اجلے کپڑوں پر سیاہی پھینک دیتا۔ کبھی اس کی کتابیں چھین لیتا جو ہم بعد میں واپس کراتے۔ ہم نے کئی بار ثناء اللہ سے کہا کہ وہ نیاز احمد کو تنگ نہ کیا کرے۔ وہ وعدہ بھی کر لیتا مگر جب نیاز احمد کا اس سے سامنا ہوتا تو وہ سب کچھ بھول کر کوئی نہ کوئی فقرہ اس پر چست کر دیتا جس سے بدمزگی پیدا ہو جاتی۔ ایک دن ہم نے ثناء اللہ سے دو ٹوک بات کی کہ آخر دوستوں کا بھی حق ہے۔ اگر ہمارے لئے نہیں تو خدا واسطے ہی نیاز کو پریشان کرنا چھوڑ دو۔ اس کے بعد ثناء اللہ نے کبھی اس کی غیر حاضری میں بھی کوئی بات اس کے خلاف نہیں کی اور یہ دشمنی دوستی میں بدل گئی۔

1945ء میں ہم لوگوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ خالصہ کالج میں فسٹ ائیر میں داخل ہو گئے۔ وہ ہمارا کالج میں پہلا دن تھا۔ ہم پانچ دوست اکٹھے کالج کے گیٹ سے داخل ہوئے۔ دور ہمیں چار پانچ طلباء کھڑے نظر آئے۔ وہ سینئر لڑکے تھے اور راستہ روکے کھڑے تھے۔ ان کے بالکل قریب دو فرسٹ ائیر کے طلباء ان کے حکم پر بیٹھکیں نکال رہے تھے اور سینئر طلباء ان کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ یہ فرسٹ ائیر کے طلباء کو فول بنانے کی رسم پوری کی جا رہی تھی۔ ثناء اللہ کی چھٹی حس پوری طرح کام کر رہی تھی۔ اس نے وہاں کالج کی اندرونی سڑک پر رک کر ہمارے ساتھ کانفرنس کی اور چند لمحوں بعد پیش آنے والے

کر رہے تھے۔ ہمارے جسم کسرتی تھے۔ ہم آج کل کے نازک لڑکوں کی طرح صبح نو بجے اٹھنے والے اور چائے' کافی پینے والے نہ تھے۔ ہم نے اپنے حریفوں کی وہ مرمت کی کہ وہ شاید آج تک نہ بھول سکے ہوں۔ ان کی یہ درگت بنتے دیکھ کر وہ دونوں فرسٹ ائیر کے طالب علم بدحواسی کے عالم میں اپنی کتابیں وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے جو ہمارے وہاں آنے سے قبل ان کا نشانہ ستم بنے ہوئے تھے۔

ہم ہاتھ جھاڑ کر وہاں سے فارغ ہوئے تو ثناء اللہ نے ہمیں مشورہ دیا کہ اب فوراً" پرنسپل کے پاس جا کر پیش ہو جائیں کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ہمارے حریفوں کو زیادہ چوٹیں لگی تھیں' کہیں وہ پہلے شکایت نہ کر دیں۔ چنانچہ ہم پانچوں دوستوں نے اپنے اپنے کپڑے پھاڑے۔ ان کو زمین پر لیٹ کر گندا کیا۔ پھر ہتھیلیوں کو مٹی سے آلودہ کر کے قمیضوں کو مختلف جگہوں سے پکڑ کر مروڑا اور اپنا حلیہ بگاڑ کر کالج کے پرنسپل باوا ہرکشن سنگھ کے سامنے پیش ہو گئے۔ وہاں ثناء اللہ نے ایسی کمال کی اداکاری دکھائی کہ ہم لوگ عش عش کر اٹھے۔ ثناء اللہ نے پرنسپل سے اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ شکایت کرنی شروع کی ہی تھی کہ وہ غش کھا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ باوا ہرکشن سنگھ بڑے سلجھے ہوئے اور نرم دل انسان تھے۔ گھبرا گئے اور ہمارے ساتھ ثناء اللہ کو ہوش میں لانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب ثناء اللہ ہوش میں آنے کے بعد اٹھ بیٹھا اور اپنی آنکھوں کو ڈرامائی انداز میں گھماتے ہوئے کچھ کہنے لگا تو باوا جی نے اسے لیٹ جانے اور خاموش رہنے کی تلقین کی۔

اتنے میں گرم دودھ آ گیا اور ثناء اللہ کو وہ خود اپنے ہاتھ سے دودھ پلانے لگے۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ہوا۔ میں نے انہیں مختصراً" بتایا کہ کالج کے چند سینئر لڑکوں

چہرے سوجے ہوئے' کپڑے پھٹے ہوئے اور کیچڑ سے پوری طرح اٹے ہوئے تھے۔ ان میں دو طالب علم لنگڑا کر چل رہے تھے۔

جب وہ دفتر میں آ کر میز کے پاس کھڑے ہوئے تو پرنسپل صاحب نے شدید غصے اور نفرت آمیز لہجہ میں ان سے پوچھا۔۔۔۔ "ان لڑکوں کے ساتھ تمہاری غنڈہ گردی کی کیا وجہ تھی؟ ذلیل' کمینو! کیا تمہارے ماں باپ نے تمہیں یہی تعلیم دے رکھی ہے؟"۔۔۔۔ ان میں سے ایک سکھ کہنے لگا' باوا جی انہوں نے تو الٹا ہمیں مارا ہے اور ہمارا یہ حلیہ بنایا ہے۔ دوسرا سکھ بولا' ہم نے ان کو مذاق ضرور کیا تھا مگر انہوں نے تو پہلے ہی اچانک حملہ کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ہمیں انہوں نے ٹکریں' تھپڑ' مکے اور لاتیں مار مار کر ہمارا بھرکس نکال دیا ہے۔ دونوں مسلمان لڑکوں نے البتہ اپنا قصور تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ بے شک ہم نے پہلے چھیڑا تھا مگر یہ ورزش کرنے والے لڑکے تھے۔ انہوں نے ہماری خوب مرمت کی ہے۔ ہمارے بزرگوں کی بھی توبہ' جو ہم آئندہ کسی لڑکے سے مذاق کریں۔ پھر باوا جی نے ان کو پچاس پچاس روپے جرمانہ کیا اور ایک مہینہ کے لئے سبھی لڑکوں کو کالج سے Rustigate (نکال) کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد "گربہ کشتن روز اول" کے مصداق ثناء اللہ کا تہکا پورے کالج میں قائم ہو گیا اور کالج کے لڑکے ہمیں بھی احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کا رویہ ہمارے ساتھ دوستانہ ہو گیا۔ انہی دنوں کالج میں انگریزی پڑھانے کے لئے نئے لیکچرار آ گئے۔ ان کا نام غالباً سردار پریم سنگھ تھا۔ وہ بڑے سادہ اور شریف آدمی تھے۔ طالب علموں نے انہیں مذاق اور شرارتوں کا ہدف بنایا۔ جب ان کا پیریڈ شروع ہونے لگتا تو دس بارہ لڑکوں کا ایک ٹولہ ثناء اللہ کی زیر سرکردگی پیشوائی کے لئے ان کو سٹاف روم سے نکال لاتا۔ پھولوں کے ہار پہناتا اور پھر برآمدوں میں سے گزرتے وقت "سردار پریم سنگھ زندہ باد" کے نعرے بلند آواز میں لگاتا ہوا کلاس روم میں پہنچا دیتا۔ سردار پریم سنگھ کی کلاس میں ہمیشہ بہت رش رہتا۔ جو لڑکے فرسٹ ایئر میں نہ تھے وہ بھی ان کی کلاس ضرور اٹینڈ کرتے۔ لڑکے انہیں انگریزی پڑھانے کی بجائے لطیفے سنانے پر مجبور کرتے۔ جب وہ ایک آدھ لطیفہ لڑکوں کی ضد کے آگے جھکنے کے بعد سناتے تو لڑکے انہیں سکھوں کے لطیفے سنانے پر مجبور کرتے۔ بعض

لڑکے تو ان سے گانے بھی سنتے اور گانے کے دوران تالیاں بجاتے۔ پورے پندرہ روز بعد پرنسپل نے ان سے استعفیٰ لے لیا۔ اس طرح لڑکوں کی یہ تفریح جاتی رہی۔

ایک دن ثناء اللہ پرنسپل کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ اس کا موڈ قدرے خراب تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ فورتھ ائیر کے ایک ہندو لڑکے کو میں نے نہر میں دھکا دے دیا تھا۔ اس نے پرنسپل سے شکایت کر کے مجھے دس روپے جرمانہ کروا دیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اسے نہر میں کیوں گرایا تھا تو وہ کہنے لگا کہ اسی نے شکایت کر کے سردار پریم سنگھ کو کالج سے نکلوایا تھا۔ کالج میں چھٹی کے بعد جب ہم گھر جانے لگے تو ایک جگہ لڑکوں کا ہجوم دیکھ کر ہم رک گئے۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسی ہندو لڑکے کو جس نے پرنسپل سے سردار پریم سنگھ کی شکایت کی تھی' ثناء اللہ نے مرغا بنایا ہوا تھا اور خود اس کی کمر پر سوار تھا۔ وہ ہندو لڑکا بار بار گرتا اور بلند آواز میں روتے ہوئے معافی مانگتا تھا مگر ثناء اللہ اسے معاف کرنے کے موڈ میں ہرگز نہ تھا۔ ہم نے اسے بڑی مشکل سے ثناء اللہ سے چھڑایا۔ اس لڑکے کو جرمانے کی رقم مبلغ دس روپے ادا کرنے اور آئندہ کے لئے شکایت کرنے سے باز رہنے کا وعدہ لے کر چھوڑا گیا۔

چند روز بعد میں کلاس روم میں بیٹھا تھا۔ ثناء اللہ نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر آیا تو وہ مجھے کالج کی کینٹین میں لے گیا۔ وہ قدرے پریشان دکھائی دیتا تھا۔ ٹھیکیدار رام لبھایا سے کہنے لگا۔۔۔۔ "پیڑوں کی لسی دو گلاس بنا دو"۔۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا' کیا تم نے صرف لسی پلانے کے واسطے ہی مجھے بلایا ہے؟ وہ کہنے لگا۔۔۔۔ "نہیں یار! بات دراصل یہ ہے کہ کالج کمیٹی کا چیئرمین سردار اجیت سنگھ آج پرنسپل سے شکایت کرنے آ رہا ہے۔ کل گلاب سنگھ سوڈی اور میں نے اس کے باغ سے مالٹے چرائے تھے۔ مالی نے ہمیں پکڑ لیا تھا۔ ہم نے اس کی خوب پٹائی کی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ باوا جی (پرنسپل) پہلے ہی میرے بہت سخت خلاف ہیں۔ مجھے کالج سے نکال باہر کریں گے۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ کوئی صورت نکالو کہ سردار اجیت سنگھ میری شکایت پرنسپل سے نہ کرنے پائے"۔۔۔۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے سوچنے دو۔

ثناء اللہ کی قسمت اچھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پرنسپل صاحب کا چپڑاسی ادھر آ گیا اور

بتانے لگا کہ پرنسپل صاحب کی سالی مر گئی ہے۔ وہ وہاں چلے گئے ہیں۔ ثناء اللہ نے سنا تو کہنے لگا' خدا بھلا کرے مرنے والی کا۔ ہمیں الجھن سلجھانے کے لئے تھوڑا وقت دے گئی ہے۔ چنانچہ سوچ و بچار کے بعد ہم چند اور دوستوں کو ساتھ لے کر سردار اجیت سنگھ کے گھر چلے گئے۔ ثناء اللہ کو ہمارے ساتھ دیکھ کر وہ بہت برہم ہوئے۔ پھر بھی ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اور آنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے ثناء اللہ کو اس کی غلطی کی معافی دینے کی سفارش کی۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ معافی تو اسے مالی سے مانگنی چاہئے جس کے ساتھ اس نے زیادتی کی ہے۔ ہم نے کہا' آپ معاف کر دیں تو ہم مالی کو بھی راضی کر لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی طرف سے تو معافی ہو گئی۔ پھر ثناء اللہ کو اچھا انسان بننے کی نصیحت کرنے لگے۔ مالی کو بھی انہوں نے وہیں بلا لیا۔ ثناء اللہ نے اس سے بھی معذرت کر لی اور

ڈسٹران کے اوپر گرے گا۔ اس طرح وہ کئی بار اپنے کپڑے اور ٹوپی خراب کروا چکے تھے۔ گلٹو صاحب کلاس میں آنے کے بعد سب سے پہلے حاضری لیتے۔ ایک ایک رول نمبر جب وہ پکارتے تو کئی کئی لڑکے "یس سر" کہتے مگر وہ کسی بات کا نوٹس نہ لیتے۔ رجسٹر پر سبھی لڑکے ہمیشہ حاضر رہتے۔ پھر جونہی گلٹو صاحب پڑھانا شروع کرتے' لڑکے اپنی اپنی کارروائی کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ کوئی بلیڈ پر انگلی اس طرح چلاتا کہ عجیب قسم کا ساز بجنے لگتا۔ کوئی منہ سے سیٹی بجانے لگتا۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے لڑکے اگلی سیٹوں والے لڑکے کو بیر' چنے اور کنکر نشانہ بنا بنا کر مارنے لگتے۔ جب گلٹو صاحب کتاب یا بلیک بورڈ سے نظریں اٹھاتے تو کاغذ کے بنے ہوئے کم از کم پندرہ بیس جہاز کلاس روم میں اڑ رہے ہوتے۔ کئی بیر' چنے' کنکر اور جہاز گلٹو صاحب کے سر' کمر اور چہرے سے بھی ٹکراتے اور وہ لڑکوں کو انسان کا بچہ بننے کی تلقین کرتے یا پھر پرنسپل صاحب سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتے مگر

صاحب نے انجانے میں اجازت دے دی اور ثناء اللہ بڑی خاموشی سے مسکراتے ہوئے سب سے آخری قطار میں ایک سیٹ پر جا پہنچا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکوں نے اسے بتا دیا کہ پروفیسر گلٹو نے اس کے آنے کی اطلاع دینے کا حکم دے رکھا ہے۔

جب حاضری مکمل ہوئی تو ثناء اللہ نے اٹھ کر پروفیسر سے اپنی حاضری لگانے کی درخواست کی۔ گلٹو صاحب نے جب رول نمبر26 دیکھا تو فوراً" بول پڑے۔ تم اندر کیسے آ گئے؟ تمہیں میری کلاس میں بیٹھنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ ثناء اللہ نے کہا' میں آپ سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ پھر آپ نے مجھے Poetry (شاعری) کی کلاس سے نکالا تھا۔ یہ Prose (نثر) کا پیریڈ ہے اس لئے مجھے یہاں بیٹھنے کا پورا پورا حق ہے اور آپ مجھے باہر نہیں نکال سکتے۔ گلٹو صاحب بڑے غصہ کی حالت میں اوپر آ گئے اور ثناء اللہ کا بازو پکڑ کر کلاس سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ ثناء اللہ ورزشی جسم کا مالک تھا۔ ان سے بھلا کیا ہلتا۔ پھر دوسرے لڑکوں کو اسے نکالنے میں مدد دینے کا حکم دینے لگے۔ لڑکے خاموش تماشائی بنے رہے۔ آخر میں نے ثناء اللہ کی منت کی اور کہا کہ پرسوں بھی تم نے زیادتی کی تھی۔ بہتر ہے باہر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ باہر چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد ثناء اللہ نے پھر کلاس روم میں داخل ہو کر ہاتھ کھڑا کر کے اندر آنے کی اجازت چاہی اور پروفیسر گلٹو صاحب نے پھر اجازت دے دی۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ثناء اللہ پھر آ گیا ہے۔ اتنے میں ثناء اللہ نے ایک کاغذ پروفیسر گلٹو کے سامنے میز پر رکھا جس پر تحریر تھا۔۔۔۔ "مسٹر ثناء اللہ کو کلاس میں بیٹھنے کی اجازت ہے"۔۔۔۔ نیچے پرنسپل صاحب کے دستخط تھے۔ پروفیسر رقعہ پڑھ کر سٹپٹا اٹھے اور ثناء اللہ سے کہنے لگے۔۔۔۔ "پرنسپل صاحب کے دستخط جعلی ہیں' اور پھر وہ میرے مشورہ کے بغیر تمہیں کلاس میں آنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ گیٹ آؤٹ۔ میں کہتا ہوں۔ باہر نکل جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا"۔۔۔۔ اس پر ثناء اللہ ہنستے ہوئے باہر چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی پیریڈ بھی ختم ہو گیا۔

اگلے روز پروفیسر گلٹو پڑھانے آئے تو لڑکوں نے شی شی کی آواز منہ سے نکالنا شروع کر دی۔ پھر کنکر بازی ہوئی اور ساتھ ہی کاغذی ہوائی جہاز چلنے لگے۔ کوئی ادھر سے پکارتا۔ "

گل ٹو"۔۔۔۔ "گلٹو۔" دوسری طرف سے آواز آتی' "گل ٹو۔" "گل ٹو۔" کوئی لڑکا اپنا ناک دبا کر کہتا۔ "گل ٹو گل ٹو۔" اس طرح پورے کلاس روم میں "گل ٹو گل ٹو" کا شور سنائی دینے لگا۔ آخر پروفیسر نے عاجز آ کر کہا۔۔۔۔ "اس سے بہتر ہے کہ جب میں آپ کی طرف پیٹھ کروں تو سبھی مل کر مجھے ایسا دھکا دیں کہ میں منہ کے بل گروں اور جانبر نہ ہو سکوں"۔۔۔۔ پھر وہ زار و قطار رونے لگے۔ لڑکوں نے پروفیسر گلٹو سے معافی مانگی اور آئندہ ایسی نازیبا حرکت سے باز رہنے کا یقین دلایا مگر پروفیسر گلٹو بڑا ہی افسردہ چہرہ لئے کلاس چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ چند لڑکے پیچھے گئے مگر وہ ٹائیلٹ میں داخل ہو چکے تھے۔

ابھی وہ ٹائیلٹ میں ہی تھے کہ باہر سے ثناء اللہ نے کنڈی چڑھا دی۔ وہ بڑی دیر تک اندر سے دروازہ کھٹکھٹاتے رہے مگر کوئی بھی دروازہ کھولنے نہ آیا۔ کئی گھنٹے گزرنے کے بعد ایک لڑکے نے جو ادھر سے گزر رہا تھا' ٹائیلٹ کا دروازہ کھٹکتے سنا تو دروازہ کھول دیا۔ پروفیسر گلٹو کو اندر سے نکلتے دیکھ کر ڈر گیا۔ پروفیسر نے اس سے پوچھا' یہ دروازہ کس نے بند کیا تھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ اتفاق سے ادھر سے گزرا اور دروازہ کھٹکتے سنا تو کھول دیا۔

پروفیسر گلٹو وہاں سے سیدھا پرنسپل کے کمرے میں گئے۔ چپڑاسی چیت رام نے انہیں بتایا کہ پرنسپل صاحب دو گھنٹے ہوئے گھر چلے گئے ہیں۔ گلٹو صاحب پرنسپل کے گھر چلے گئے اور اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ پرنسپل نے وجہ پوچھی تو وہ رونے لگے۔ باوا جی نے گلٹو صاحب کی دلجوئی کی اور انہیں حوصلہ دلایا مگر وہ کالج تو کیا' پڑھانے سے بھی توبہ کر چکے تھے۔ انہوں نے پرنسپل صاحب کو اپنی داستان الم سنائی اور بتایا کہ وہ مکمل طور پر دل برداشتہ ہو چکے ہیں' اور اب مزید ان لڑکوں کے ساتھ ان کا گزارا ممکن نہیں۔ باوا جی کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ وہ شرارتی اور قصور وار لڑکوں کو قرار واقعی سزا دیں گے' اپنی ملازمت جاری رکھنے پر رضامند نہ ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی کوئی خبر نہ سنی۔ گلٹو صاحب کے جانے کے بعد ایک خلا سا پیدا ہو گیا اور لڑکے اداس اداس رہنے لگے۔

ان دنوں ہماری دل لگی اور شرارتیں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ اتوار کی ہفتہ وار چھٹی یا کوئی تہوار کی چھٹی آتی تو گھر میں دل نہ لگتا۔ ہم لوگ دعا کرتے کہ چھٹی نہ ہو۔ چھٹی

گزارنے کے بعد اگلے روز جب کالج جاتے تو ایسے لگتا جیسے بڑی دیر بعد وہاں آئے ہوں۔ کالج کے در و دیوار بڑے پیارے لگتے۔ اپنے ہم جماعتوں کو دیکھ کر خوشی سے دل جھومنے لگتا۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا سن کر ہی دل گھبرانے لگتا جیسے ہمیں جلا وطن کیا جا رہا ہو۔ چھٹیاں ہمیں قید تنہائی کی سزا معلوم ہوتی تھیں۔ البتہ سائنس اور حساب کی کلاسوں میں جانے سے دل گھبراتا تھا۔ وہ آزمائش کا وقت ہوتا جو گزرے نہ گزرتا۔ سہ ماہی اور نو ماہی امتحانوں میں سائنس اور حساب کے پرچے اکثر' لڑکے ممتحن سے نظر بچا کر خالی ہی رکھ آتے اور جو کچھ لکھا ہوتا وہیں پھاڑ کر پھینک آتے یا بطور تبرک ساتھ باہر لے آتے۔ بعد میں جب نتیجہ نکلتا تو لڑکے شور کرتے کہ ان کے پرچے کہاں گئے۔ اس واویلا کا اتنا اثر ضرور ہوتا کہ دوسرے پرچوں کی اوسط دیکھ کر اس متنازعہ پرچے کے نمبر بھی لگا دیئے جاتے۔

ہمارے کالج میں ایک مرتبہ فینسی ڈریس شو ہوا۔ شو کا اہتمام ثناء اللہ کے سپرد تھا۔ لڑکوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ کوئی بھکاری بنا اور کوئی شاعر' کسی نے ملنگ کا روپ دھارا اور کسی نے جوگی کا۔ ایک بنیا بنا تو دوسرا دیہاتی۔ بندر نچانے والا بھی آیا۔ طوطے سے قسمت کا حال معلوم کرنے والا بھی۔ اس طرح بڑے بڑے اعلیٰ اور عمدہ بہروپ میں لڑکے آئے مگر حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اس شو کے دوران ہمارے پیارے اور دلارے سابق استاد پروفیسر گلٹو صاحب بھی کہیں سے اچانک ادھر آ نکلے اور خاموشی سے پہلی قطار میں پرنسپل باوا جی اور وائس پرنسپل سردار شیر سنگھ کے درمیان جا بیٹھے۔ اس وقت سٹیج پر لڑکے ایک مزاحیہ قوالی گا رہے تھے۔ گلٹو صاحب کو دیکھ کر قوالی میں جوش پیدا ہو گیا اور وہ گانے لگے۔

میں تیرے قربان گلٹو
کالج کی ہے شان گلٹو
تو اپنا مہمان گلٹو
حاضر ہے یہ جان گلٹو

ہائے رے گلٹو' وائے رے گلٹو

پیارے راج دلارے گلٹو
بوڑھے مگر کنوارے گلٹو
سب کی آنکھ کے تارے گلٹو

ادھر گلٹو ادھر گلٹو
دائیں گلٹو بائیں گلٹو
آگے گلٹو پیچھے گلٹو
اوپر گلٹو نیچے گلٹو

ہائے رے گلٹو واہ رے گلٹو
جیوے گلٹو آ گئے گلٹو

سارے ہال میں لڑکے کورس کی صورت میں "پیارے گلٹو' ہائے رے گلٹو" گانے لگے اور سارا ہال ان صداؤں سے گونج اٹھا۔ پرنسپل اور وائس پرنسپل پریشان اور مضطرب دکھائی دینے لگے مگر لڑکوں کے اس موڈ کو بدلنا ممکن نہ تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ گلٹو صاحب وہاں سے اٹھ کر سٹیج پر تشریف لے گئے اور قوالوں کے ساتھ مل کر الاپ لگانے اور جھوم جھوم کر یہ گانے لگے:

دیکھو لڑکو آیا گلٹو
آپ کا اپنا تایا گلٹو
تم نے لاکھ ستایا گلٹو
پھر بھی بھول نہ پایا گلٹو

اس پر تو پورا ہال بھی اٹھ کھڑا ہوا اور سب بڑے والہانہ انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا کر تالیاں بجاتے ناچتے اور گاتے رہے۔ بعض سینہ کوبی بھی کرتے رہے۔ بہت بعد میں پتہ چلا کہ ثناء اللہ پروفیسر گلٹو کا روپ دھار کر آیا تھا۔ اس انکشاف پر ہال میں کئی منٹ تک مسلسل تالیاں بجا کر سامعین نے داد تحسین پیش کی۔ تینوں ججوں نے متفقہ طور پر ثناء اللہ کو

اول انعام کا مستحق قرار دیا۔ اس طرح یہ تقریب بڑی ہٹ رہی۔

نو ماہی امتحان کا نتیجہ نکلا۔ ثناء اللہ اپنی بغل میں انگریزی کا پرچہ دبائے کالج میں سارا دن پھرتا رہا۔ میں نے اسے کہا کہ ذرا پرچہ تو دکھاؤ' کتنے نمبر لئے ہیں' ثناء اللہ نے پرچہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے کھولا اور حیران رہ گیا۔ زیرو نمبر تھے۔ جی ہاں صفر۔ میں نے ثناء اللہ کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ کیا؟ تو وہ بڑا سنجیدہ ہو کر مجھے کہنے لگا۔۔۔۔ "پروفیسر بھائیہ نے کہا تھا نمبروں کی کوئی بات نہیں' ویسے تمہاری انگلش بہت ہائی ہے۔"

ممتاز علی ثناء اللہ کا بہت گہرا دوست ہوا کرتا تھا۔ وہ شاید نو مسلم تھا۔ اس میں ہندوؤں کی بہت سی عادات موجود تھیں۔ مثلاً وہ گوشت وغیرہ نہیں کھاتا تھا۔ گوبھی' آلو' دہی بڑے اور ماش کی دال اس کی مرغوب غذائیں تھیں۔ وہ بے حد ڈرپوک تھا۔ ثناء اللہ کی تمام تخریبی سکیموں کا محرک وہی ہوا کرتا تھا مگر مہم جوئی میں شرکت سے ہمیشہ اجتناب کرتا تھا۔ اسے بارہ مہینے زکام کی شکایت رہتی تھی۔ ایک یا دو رومال اس کی ناک کی صفائی کے لئے ناکافی ہوتے تھے' اس لئے وہ آدھی شلوار' کسی بچے کا پورا پاجامہ یا اپنی بہن وغیرہ کا دوپٹہ اپنی پتلون کی جیب میں تہہ کر کے رکھتا اور سارا دن اس سے ناک صاف کرتا رہتا تھا۔ پتلون کی جیب اگر پھولی ہوتی تو وہ چلتے وقت ہاتھ والی کتابوں سے اس طرح جیب کو چھپا کر رکھتا کہ دوسرے لوگ کم ہی نوٹ کر پاتے۔ اس کا پیٹ بے حد کمزور تھا۔ عورتوں کی طرح کوئی راز کی بات اگر اسے معلوم ہو جاتی تو اس پر کھانا پینا حرام ہو جاتا۔ جب تک راز پندرہ بیس دوستوں یا اپنے اہل خانہ کو نہ بتا لیتا وہ چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا۔ پروفیسر گلنو کو ٹائیلٹ میں بند کرنے کے راز سے پردہ اسی نے اٹھایا تھا۔ اگر گلنو کالج نہ چھوڑتے تو ثناء اللہ کو ہمیشہ کے لئے کالج سے جواب ملنا یقینی تھا۔ کلاس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ثناء اللہ اسے کوئی دلچسپ لطیفہ سنا دیتا اور وہ غریب ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے۔ پھر کلاس میں لیکچر کے

اسے روسٹ مرغ' قورمہ اور نہ جانے کیا کیا کھلا دیا۔ سبزی خور کو اتنی چیزیں کھلا تو دیں مگر انہیں ہضم کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ رات کو ثناء اللہ اور ممتاز علی شادی والے گھر کے پڑوس میں ایک گھر کے ڈائینگ روم میں سوئے۔ آدھی رات کو ممتاز علی کے پیٹ میں گڑبڑ ہوئی تو وہ اٹھ کر باہر گلی میں رفع حاجت کے لئے نکل گیا اور گلی میں کھڑے ایک تانگے کے نیچے بیٹھ گیا۔ پاس ہی کہیں تانگے والا سویا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے اس کے تانگے کے قابلے کوئی اتار لے جاتا تھا۔ وہ چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے قریب ہی لیٹا تھا۔ اس نے ہلکی سی آہٹ سنی تو پکار اٹھا۔۔۔۔ "کون ہے میرے تانگے کے قابلے کھولنے والا؟"۔۔۔۔ تانگے والے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ممتاز علی پاجامے کا ازار بند ہاتھ میں پکڑے واپس بھاگا۔ اندر جا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا لی اور ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ تانگے والے نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اس سے ثناء اللہ اور تمام اہل خانہ جاگ اٹھے اور تانگے والے سے دروازہ کھٹکھٹانے کی وجہ پوچھنے لگے تو اس نے جواب دیا کہ ایک چور اندر آ گیا ہے۔ ثناء اللہ کی نظر اپنے یار ممتاز علی پر پڑی جو ایک کونے میں کھڑا ہاتھ میں ازار بند تھامے کانپ رہا تھا۔ جب لوگوں کو اصل معاملہ کا پتہ چلا تو سبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

ثناء اللہ نے ایک روز ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلایا ہم لوگ وہاں گئے۔ محفل خوب جمی۔ سبھی دوستوں نے بڑے بڑے عمدہ اور دلچسپ لطیفے سنائے۔ ہمارا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ پھر ممتاز علی نے وہاں پڑی ہوئی ایک کریم کی شیشی اٹھائی اور اپنے ہاتھوں پر لگا کر کہنے لگا' کمال ہے یار' میری دونوں ہتھیلیاں نوجوان لڑکیوں جیسی نرم اور ملائم ہو گئی ہیں۔ سبھی دوستوں نے باری باری ممتاز علی کے ہاتھوں کو چھوا اور بڑے ہی رشک آمیز انداز میں اسے دیکھنے لگے۔ میں نے شرارتاً کہہ دیا کہ اس شیشی میں جلد پر لگانے والی کریم نہیں

سبھی دوست ہاتھ دھونے غسل خانے کی طرف بھاگے اور میں ان کا مذاق اڑانے لگا۔

اکنامکس کی کلاس لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر برجے پال سنگھ پڑھا رہے تھے اور تمام لڑکے بڑی توجہ سے لیکچر سننے میں محو تھے۔ پروفیسر صاحب نے کہا---- "اس وقت جو SUBJECT MATTER (نفس مضمون) میرے ہاتھ میں ہے وہ بے انتہا اہمیت کا حامل ہے"____ اتفاق کی بات جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے اس وقت ان کا ہاتھ اپنی ناک پر تھا۔ ثناء اللہ اٹھ کر کہنے لگا---- "سردار جی! آپ کی ناک میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ یہ بے پناہ اہمیت کی حامل ہے؟"____ یہ سن کر سردار جی برہم ہوئے اور ثناء اللہ کو خاموشی سے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

انہی دنوں ایکسائز ڈیوٹی لگنے کی وجہ سے چینی مہنگی ہو گئی اور بازار سے غائب ہو کر بلیک میں فروخت ہونے لگی۔ کینٹین کے ٹھیکیداروں نے دودھ' دہی' لسی' برفی اور دیگر اقسام کی مٹھائیوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔ ثناء اللہ نے رام لبھایا ٹھیکیدار کو دھمکی دی کہ اس نے اشیاء کے نرخ بڑھائے تو اس کا جلوس نکال دیا جائے گا۔ رام لبھایا کہاں باز آنے والا تھا۔ اس کی بنیوں والی فطرت بدل نہیں سکتی تھی۔ اس نے مہنگی چینی خریدنے کا بہانہ بنا کر قیمتیں بڑھا دیں۔

ثناء اللہ ایک روز مریل سی ایک گدھی کہیں سے لے آیا اور رام لبھایا کو اس پر زبردستی بٹھا کر جلوس کی صورت میں کالج کی بیرونی سڑک پر گھمانے لگا۔ ثناء اللہ اور دوسرے لڑکے کورس میں بولتے تھے۔ ثناء اللہ ہاتھ میں گھنٹی لئے ترنم سے بولتا۔

ثناء اللہ	کھنڈ کا دیوتا	لڑکے کہتے	سویا پڑا ہے
ثناء اللہ	لبھائے کا باپو	لڑکے کہتے	سویا پڑا ہے
ثناء اللہ	کھوئے کی برفی	لڑکے کہتے	نہیں ملے گی
ثناء اللہ	پھیکی لسی	لڑکے کہتے	پینی پڑے گی
ثناء اللہ	پیڑا جلیبی	لڑکے کہتے	نہیں بنے گی
ثناء اللہ	کھنڈ کا دیوتا	لڑکے کہتے	سویا پڑا ہے
ثناء اللہ	لبھائے کا باپو	لڑکے کہتے	سویا پڑا ہے

رام لبھایا گدھی پر بیٹھا کبھی ہاتھ جوڑتا' کبھی کانوں کو ہاتھ لگاتا اور گدھی سے نیچے اترنے کی کوشش کرتا تو ثناء اللہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی گھنٹی اس کے سر یا کمر پر مارتا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد پورے کالج کا آہستہ آہستہ راؤنڈ لگا کر اس کی گلو خلاصی ہوئی۔ اس کے بعد رام لبھایا کے سامنے ثناء اللہ کا نام لینا ایسے ہی تھا جیسے موت کا بلاوا آ گیا ہو۔ وہ رام رام کہتا ہوا اپنے کانوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر نیچے کر لیتا۔

سردار گردیال سنگھ ہمارے کالج کا ہیڈ کلرک تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت بیشک لڑکے دل لگی اور تفریح کرتے تھے مگر نہ تو وہ بسیں اغوا کرتے تھے اور نہ ہی پرنسپل' پروفیسر حضرات اور کالج کے عملہ کو دھمکیاں دیتے تھے۔ کالج میں کسی قسم کی سٹرائیک وغیرہ ہو سکتی ہے' یہ طالب علموں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ امتحانوں میں نقل مارنے کا رواج بالکل نہ تھا۔ کوئی لڑکا شاذ و نادر ہی ایسی حرکت کرتا تھا۔ وہ بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ لڑکوں کو امتحانوں میں فیل ہونے' فیسیں دیر سے دینے اور کلاسوں سے غیر حاضر رہنے پر جرمانے ہوتے جو باقاعدہ وصول ہوتے تھے۔ یونین کے ممبران یا عہدیداران ایسے حالات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ثناء اللہ کو کالج انتظامیہ نے تحریری نوٹس دیا کہ اس کے ذمے جرمانے کے مبلغ 150/- روپے واجب الادا ہیں (وہ ڈیڑھ سو آج کل کے تین ہزار روپے کے برابر ہوتے ہیں) اگر اس نے یہ رقم سات یوم کے اندر اندر جمع خزانہ کالج نہ کروائی تو اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جائے گا۔ جرمانے کی یہ کثیر رقم مختلف نوعیت کے قصور کرنے پر عائد کی گئی تھی۔

ثناء اللہ نے ایک درخواست لکھی کہ اس کی نانی فوت ہو گئی تھی اس لئے وہ کئی روز کالج نہیں آ سکا' لہٰذا مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس کے تمام جرمانے معاف کئے جائیں۔ پرنسپل نے درخواست پر لکھ دیا:

THE FINES ARE REMITTED.

____ "جرمانے معاف کئے گئے۔" یہ تحریر سردار گردیال سنگھ کو دکھا کر دوسرے جرمانے بھی معاف کروا لئے جن میں امتحانوں میں فیل ہونے' ایک سکھ لڑکے کے کیس (سر کے بال) جلانے' کالج کے کمپاؤنڈ میں جوا کھیلنے' ہندو لڑکے کو نہر میں دھکا دینے' تین ماہ کی

فیس ادا نہ کرنے' رام لبھایا کو گدھی پر بٹھا کر بے عزت کرنے اور اس طرح کے دوسرے تمام جرمانے بھی شامل تھے۔ وہ سادہ لوگ تھے اور اعتبار کرتے تھے۔

ایک دن ثناء اللہ میرے ساتھ لاہور سے گوجرانوالہ بذریعہ ریل انٹر کلاس میں بیٹھ کر آ رہا تھا۔ ان دنوں ٹرینوں میں اتنا رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ عموماً انٹر کلاس ہی میں سفر کیا کرتے تھے۔ خدا جانے ثناء اللہ کو کیا سوجھی کہ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور مجمع بازوں کے انداز میں مسافروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا---- "سنو بھائی جان' قدر دان' میں چندہ مانگنے والا نہیں ہوں نہ خیرات مانگنے والا۔ دانتوں کا منجن بیچنے آیا ہوں نہ مولی کا نمک۔ کوئی دوا فروخت کروں گا نہ ہاکی یا کرکٹ میچ کی ٹکٹیں۔ مجمع باز ہوں نہ نو سرباز۔ فنکار ہوں نہ بیکار۔ فلمی ایکٹر ہوں نہ کوئی ڈائریکٹر۔ ریلوے کا اہلکار ہوں نہ سماج کا ٹھیکیدار۔ میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں اور آپ کی خدمت اور بھلائی کرنا میرا جزو ایمان ہے۔ ہاں تو میرے عزیز دوستو! میں آپ کے ایک ازلی دشمن' آپ کے صحت کے قاتل' آپ کی قابل رشک جوانی کو تباہ کرنے والے مار آستین اور آپ کی حسین و جمیل زندگی کو مٹانے والے موذی سانپ کی نشاندہی کرنے آیا ہوں جسے آپ نفرت کی بجائے محبت سے نوازتے ہیں۔ جسے آپ

کیپٹن سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ سلگا کر بڑے آرام سے کش لگانے لگا۔

یہ دیکھ کر تمام مسافر جنہوں نے اپنے سگریٹ باہر پھینکے تھے اور تمباکو نوشی سے توبہ کی تھی سخت حیرت میں ثناء اللہ سے پوچھنے لگے۔ یہ کیا؟ اوروں کو نصیحت---- اور خود میاں فضیحت!..... ثناء اللہ بڑی لاپرواہی اور بے اعتنائی سے سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہنے لگا---- "سگریٹ چھوڑنے کی قسم آپ نے کھائی ہے میں نے تو نہیں۔ میں نے آپ کی بھلائی کی بات کی تھی۔"

ان دنوں ہم سیکنڈ ایئر میں تھے۔ وہ انگریزی راج کے آخری دن تھے' ایک دن اخباروں میں خبر چھپی کہ لاہور سول سیکرٹریٹ میں گورنر کے دفتر پر جہاں برطانیہ کا پرچم یونین جیک لہرایا کرتا تھا' وہاں پر ایک مسلمان دوشیزہ نے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا دیا ہے۔ اس خبر کا بہت چرچا ہوا۔ مسلمان نوجوانوں کے خون جوش مارنے لگے اور تحریک آزادی زور پکڑ گئی۔ لڑکے جوق در جوق مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں داخل ہونے لگے۔ ثناء اللہ اور ہم نے بھی اپنے پاک وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ثناء اللہ کہیں سے

ثناء اللہ کو چھت پر جا کر گرفتار کر لیا اور نیچے اتار کر اسے اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔

وہاں ہم لوگ نعرہ بازی کرتے رہے---- "بٹ کے رہے گا ہندوستان..... لے کے رہیں گے پاکستان" ____ "پاکستان زندہ باد" ____ ادھر ہندو اور سکھ طلباء مل کر "جے ہند" کے نعرے لگا رہے تھے۔ کالج کی فضا خاصی مکدر ہو گئی اور ہندو مسلم فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کالج کے پرنسپل نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے لڑکوں کو سمجھا بجھا کر گھر بھیج دیا۔ اگلے روز ثناء اللہ کی ضمانت نہ ہو سکی اور اسے تھانے سے نکال کر جیل لے جانے لگے تو مسلمان لڑکوں اور شہریوں نے ثناء اللہ کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا۔ لوگ دیوانہ وار ثناء اللہ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ تیسرے روز اس کی ضمانت ہو گئی۔ چوتھے روز کالج انتظامیہ نے اسے ہمیشہ کے لئے کالج سے نکال دیا۔ ثناء اللہ کالج جانا چاہتا تھا لیکن ہم نے اسے منع کر دیا کیونکہ وہاں اس کی جان کو خطرہ تھا۔ ثناء اللہ نے اپنی تعلیم وہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر کے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد پاکستان بن گیا مگر ثناء اللہ سے کئی برس تک ملاقات نہ ہو سکی۔

ایک دن' برسوں بعد' ثناء اللہ کے بڑے بھائی ملے۔ میں نے ثناء اللہ کے بارے میں پوچھا تو وہ بتانے لگے کہ پچھلے پندرہ سال سے انگلستان کے شہر مانچسٹر میں قیام پذیر ہے۔

1965ء میں عیدالفطر کے روز میں دوستوں کے ساتھ مہمان خانے میں بیٹھا تھا۔ چھوٹے بھائی نے مجھے اطلاع دی کہ باہر کوئی ثناء اللہ صاحب ملنے آئے ہیں۔ میں نے اندر بلایا تو ایک گنجے سر والا' بہت موٹا اور بھدا شخص میرے سامنے آیا۔ میری حیرت کی حد نہ رہی۔ یہ میرے بچپن کا لنگوٹیا یار ثناء اللہ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا' کہاں گئی تمہاری جوانی؟ تمہارا بانکپن اور تمہاری سمارٹ نیس؟---- وہ مسکرایا اور کہنے لگا' یار! نظر لگ گئی ہے۔ دو سال ہوئے برمنگھم میں اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس میں اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ پورا ایک سال ہسپتال میں رہا۔ اب گذشتہ ایک سال سے ٹھیک تھا مگر وہ صحت دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔ ثناء اللہ نے میرے ساتھ پورا دن گزارا اور ہم ماضی کی حسین اور میٹھی یادوں میں کھو گئے۔ ثناء اللہ مجھ سے دوسرے دوستوں کی بھی پوچھتا رہا جو تلاش روزگار کے چکر میں بکھر چکے تھے۔ ثناء اللہ نے مجھے جاتے ہوئے بتایا کہ وہ انگلینڈ ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا

ہے اور اب یہاں ہی کوئی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

کوئی دو سال بعد کسی کام سے مجھے جنرل بس سٹینڈ پر جانا پڑا۔ وہاں میرا استقبال کرنے کے لئے ثناء اللہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا اور مجھے بتانے لگا کہ اس نے ٹرانسپورٹ کا کام شروع کر رکھا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے دفتر میں جو اسی احاطے میں تھا' لے گیا۔ بہت دیر تک گپ شپ چلتی رہی۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ میں نے اجازت چاہی مگر ثناء اللہ نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ایک ملازم کو چار مرغ روسٹ' پچاس تکے اور بیس سیخ کباب' کھیر اور پھل وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ میں نے اس سے پوچھا' کیا کوئی اور لوگ بھی آ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا' نہیں یار! اتنی مدت بعد ملے ہو۔ یہ سب کچھ تمہارے لئے ہی ہے۔

میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس مدت کے دوران جب ہم جدا رہے' میں نے فاقہ نہیں کیا۔ کھاتا پیتا رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا' گھبراؤ نہیں۔ کوئی چیز بچ کر نہیں جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ ثناء اللہ کو میں نے کھاتے دیکھا تو اس کے موٹاپے کے تمام اسرار و رموز میری سمجھ میں آ گئے۔ اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ ایک اجنبی میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ کل رات ثناء اللہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے رحلت فرما گئے ہیں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

شار چار بجے جنازہ پڑھنے سے قبل میں نے ثناء اللہ مرحوم کا آخری دیدار کیا تو اس کا مسکراتا چہرہ مجھے یہ پیغام دے رہا تھا کہ خاطر جمع رکھو' میں اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی معافی مانگ کر مالک دو جہاں کو راضی کر لوں گا اور اس دفعہ بھی جرمانہ معاف کروا لوں گا۔

○

الو باٹا

میں نے پہلی مرتبہ اسے 1945ء میں فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک موچی کے پاس کھڑے کسی بات پر تکرار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتہ چلا کہ ان حضرت نے جوتے مرمت کروائے تھے۔ موچی نے اجرت دو آنے طلب کی تھی اور وہ مبلغ ایک سو روپے کا نوٹ موچی کو دکھا کر بقایا چینج مانگ رہے تھے۔

جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت دو تین روپے میں بہترین جوتا ملتا تھا اور اس وقت کے سو روپے آج کے پانچ ہزار روپے کے برابر تھے۔

غریب موچی تو سو روپے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' بیچارہ چینج کہاں سے لاتا۔ پھر غالباً کسی راہگیر نے جھگڑا چکانے کی خاطر دو آنے اپنی گرہ سے موچی کو ادا کر کے ان صاحب کی مشکل آسان کی۔ ان کے جانے کے بعد کسی گھر کے بھیدی نے انکشاف کیا کہ نہ جانے سو کا یہ جعلی نوٹ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا ہے۔ یہ تو ہر جگہ دو چار آنے کی چیز خرید کر نوٹ دکھاتے ہیں اور دوکاندار کی مجبوری کا مذاق اڑاتے ہوئے اس سے ادھار سودا لے کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ خدا جانے کب تک چلتا کہ کسی خدا خوف جیب کترے نے ان کی جیب سے نوٹ اڑا لیا۔

ستمبر 1946ء میں اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ پہلے چند نو آموز شعرا نے اپنا کلام پڑھا' پھر سٹیج سے اعلان ہوا--- "اب تشریف لاتے ہیں' نوجوان نسل کے مایہ ناز سخن ور' شاعر جذبات' ماہر ترنم' جناب اے منان ساقی صاحب"____ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہی جعلی نوٹ رکھنے

والے حضرت ترکی ٹوپی پہنے سٹیج پر تشریف لائے اور آتے ہی فرمانے لگے--- "حاضرین کرام! اپنی بالکل تازہ غزل پیش کرتا ہوں۔"

"ارشاد ارشاد" کا شور اٹھا۔ پھر ساقی صاحب نے بڑے ہی دلاویز ترنم کے ساتھ اپنی غزل سنانی شروع کی۔ ہر مصرع پر سامعین اس قدر دل کھول کر داد دے رہے تھے کہ داد دینے والوں کو داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ پھر مکرر مکرر کی بلند صدائیں ہال میں گونجنے لگیں اور منان ساقی صاحب جھومتے ہوئے اپنے محبوب سامعین کی ضیافت طبع کی خاطر اپنی غزل کے مختلف مصرعوں کو بار بار پڑھتے اور محفل مشاعرہ کو لوٹتے رہے۔ ایک بات میرے لئے بڑے اچنبھے کی تھی کہ منان ساقی صاحب نے اپنی غزل سنانے سے قبل سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ان کی بالکل تازہ غزل ہے لیکن مجھے یہ غزل جانی پہچانی اور مانوس سی لگتی تھی۔ منان ساقی صاحب نے غزل کا مقطع سنایا تو مجھے یاد آ گیا۔ چند روز قبل ایک نجی محفل میں گجرات کے ایک معروف شاعر جناب انور اقبال صاحب نے یہی غزل سنائی تھی اور خوب داد حاصل کی تھی۔

محفل مشاعرہ کے اختتام پر میں منان صاحب سے ملا اور انہیں الگ لے جا کر بڑی راز داری سے استفسار کیا کہ جو غزل انہوں نے ابھی ابھی سنائی ہے' کیا ان کی اپنی تخلیق کردہ ہے؟

"بالکل اپنی ہے"____ انہوں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"قبلہ! یہ غزل تو گجرات کے جناب انور اقبال صاحب کی ہے"____ میں نے انہیں بتایا--- "اور اس سے قبل میں ان سے سن بھی چکا ہوں۔"

منان ساقی صاحب نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے فرمایا--- "انور اقبال صاحب نے یہ غزل مجھے دے دی ہے۔"

یہ جواب سن کر میں بوکھلا اٹھا اور پوچھا--- "آپ کو کیسے دے دی؟"

"انہوں نے میرے لئے ہی لکھی تھی"____ انہوں نے بیساختہ کہا--- "اور مقطع

میں مجھے اپنا تخلص بھی استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔"

تقسیم ہند سے قبل گوجرانوالہ میں ایک نو رتن تھیٹریکل کمپنی بنی تھی جس کے فنکار ہر رات ایک بالا خانے میں ریہرسل کرتے تھے۔ انہوں نے ایک ڈرامہ "لیلیٰ مجنوں" اور ساتھ ورائٹی شو ریجنٹ سینما کے سٹیج پر پیش کیا جو بری طرح فلاپ ہوئے تھے۔ میں ایک رات اسی ڈرامہ کی ریہرسل دیکھنے ایک دوست کے ہمراہ گیا۔ وہاں پورے میک اپ میں مجنوں کے والد صاحب سردار عامری اپنے لخت جگر قیس کی حالت زار پر آسمان کی طرف چہرہ کر کے ڈائیلاگ بول رہے تھے اور ڈائریکٹر بار بار اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سر کو جھٹک رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو منان ساقی صاحب عرب سردار عامری کے بہروپ میں میرے سامنے کھڑے عجیب بھونڈے طریقے سے مکالمے ادا کر رہے تھے۔ تصنع اور بناوٹ صاف عیاں تھی۔ آخر دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد ڈائریکٹر نے انتہائی مایوسی کے عالم میں منان ساقی کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔

پاکستان بننے کے بعد میں بسلسلہ تعلیم لاہور چلا گیا۔ وکالت کا امتحان پاس کر کے وہاں پریکٹس شروع کر دی۔ اس دوران اگرچہ گاہے گاہے گوجرانوالہ آتا رہا مگر منان ساقی کی نہ تو صورت ہی دیکھنے کو ملی نہ ہی کہیں آواز ہی سن پایا۔ اس طرح میں انہیں مکمل طور پر فراموش کر بیٹھا۔ 1956ء کے وسط میں مجھے لاہور چھوڑ کر گوجرانوالہ آنا پڑا۔ میرے ایک دیرینہ دوست نے ان دنوں یہاں ایک میوزک اکیڈیمی قائم کر رکھی تھی۔ ایک شام وہاں موسیقی کا رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیا گیا اور مجھے اس تقریب میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی دعوت دی۔

وہاں گیا تو میرا استقبال کرنے والوں میں منان ساقی صاحب پیش پیش تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور میری طویل غیر حاضری کا گلہ کرنے لگے۔ ان کا رویہ بڑا ہی پرخلوص اور دوستانہ تھا جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر محفل موسیقی کا آغاز ہوا۔ پہلے چند نو آموز گانے والے سمع خراشی کرتے رہے۔ پھر کچھ سینئر گانے والوں نے محفل کو زعفران زار

بنانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جناب منان صاحب کہنہ مشق گائیک کی حیثیت سے سٹیج پر تشریف لائے۔ انہوں نے چند پرانی انڈین فلموں کے مشہور گانے سنائے۔ وہ ام کلثوم بلبل عرب کے انداز میں جھوم جھوم کر گا رہے تھے۔ میرے علاوہ تمام سامعین تالیاں بجا بجا کر یا میوزک کی آواز منہ سے نکال کر داد دے رہے تھے۔ یہ باور کرنا بے حد مشکل تھا کہ سامعین منان صاحب کو الو بنا رہے ہیں یا منان صاحب سامعین کو مگر یہ بات یقینی تھی کہ اس وقت محفل میں ہر شخص پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ صرف ایک بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ سامعین میں منان ساقی صاحب بے حد مقبول ہیں اور وہ ان کے دلوں کے تار چھیڑ کر داد وصول کر رہے تھے---- یہ محفل رات گئے ختم ہو گئی۔

اگلے روز منان صاحب صبح سویرے ہی میرے دفتر میں تشریف لے آئے اور مجھ سے گذشتہ محفل شب میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کی داد وصول کی۔ وہ بہت دیر تک خود ستائی میں مصروف رہے اور میں "اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں" کے مصداق یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ کوئی دو گھنٹے بعد انہیں مجھ پر رحم آ گیا اور جلد ہی ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

اس کے بعد تو منان صاحب نے میرے دفتر میں حاضری دینا اپنا روزمرہ کا معمول بنا لیا۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے بلا ناغہ میرے دفتر میں گزارتے۔ کبھی اپنا کلام جو دراصل مال مسروقہ ہوتا تھا' ترنم سے سناتے۔ کبھی تاریخی فلموں مثلاً "پکار" "ہمایوں" "بیرم خان" "سکندر اعظم" اور "پرتھوی ولبھ" کے مکالمے سنانے لگتے۔ کبھی امتیاز علی تاج صاحب کے مشہور ڈرامہ "انارکلی" کے ڈائیلاگ بڑی رقت سے بولتے۔ اس طرح فلمی گانوں' گیتوں اور غزلوں سے ہماری تواضع فرماتے اور فرض کر لیتے کہ میں محفوظ ہو رہا ہوں۔

کچھ بھی تھا' منان صاحب بڑی دلچسپ شخصیت تھے۔ جتنی دیر میرے ساتھ رہتے' تفریح مہیا کرتے۔ وہ مجھے اکثر اپنے دولت کدہ پر آنے کی دعوت دیتے مگر میں بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتا کیونکہ شعراء کے گھر جانا میں حفاظت خود اختیاری کے اصول کے تحت مناسب

نہیں سمجھتا۔ اگر خدانخواستہ آدمی ایسے حالات میں کسی شاعر کے گھر پھنس جائے تو شاعر اپنا کلام سنائے بغیر مہمان کو جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

کہتے ہیں' ایک شاعر کے گھر سے ایک شخص سخت بدحواسی کی حالت میں نکلا اور گلی میں بھاگنے لگا۔ اس کے فوراً" بعد شاعر بھی گھر سے برآمد ہوا اور "پکڑو پکڑو" کی صدائیں لگاتا اس کے پیچھے دوڑا۔ لوگوں نے سمجھا چور ہے اور چوری کر کے بھاگ رہا ہے۔ انہوں نے تھوڑی دور تک تعاقب کر کے چور کو پکڑ لیا۔ اتنے میں شاعر بھی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس نے کیا چوری کیا ہے؟

"چوری نہیں کی"___ شاعر نے جواب دیا---- "بلکہ سینہ زوری کی ہے۔ اس نے اپنی غزل مجھے سنائی تھی اور داد بھی وصول کر لی تھی۔ جب میری باری آئی تو یہ بھاگ اٹھا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے!"

اے منان ساقی صاحب اکثر ذکر کرتے تھے کہ انہوں نے برصغیر کے ایک نامور موسیقار سے پورے پندرہ برس ستار سیکھی ہے اور وہ ستار بجانے کے ماہر ہیں۔ اس کے علاوہ طبلہ اور گھڑا بجانے کا بھی برسوں ریاض کیا ہے۔ ستار منان صاحب کا من پسند اور مرغوب ساز ہے۔ وہ مجھے کئی مرتبہ میوزک اکیڈیمی میں آنے اور ستار بجانے کے فن کی مہارت دکھانے کے لئے دعوت دیتے تھے لیکن مجھے اتفاق سے کوئی نہ کوئی مجبوری وہاں جانے سے روکتی رہی۔

ایک دن منان ساقی صاحب نے مجھے خوشخبری سنائی کہ آج رات میوزک اکیڈیمی میں پورے آرکسٹرا کے ساتھ ایک گانا ریکارڈ ہونا ہے اور انہوں نے ہی اس گانے کی دھن تیار کی ہے۔ مجھے نہ صرف وہاں چلنے کی دعوت دی بلکہ انہوں نے بتایا کہ وہ مجھے خود لینے آئیں گے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور شام منان صاحب کے ہمراہ اکیڈیمی پہنچ گیا۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ آج میں ستار بجانے کے انوکھے فن کا بھرپور مظاہرہ کروں گا۔

اکیڈیمی میں اس شام بڑی گہما گہمی تھی۔ بہت سے سازندے اکٹھے کئے گئے تھے۔ گٹار'

وائلن' سارنگی' ستار' مرکس' ہارمونیم' گھڑا' گھنگھرو' بانسری' بیجو اور ماؤتھ آرگن وغیرہ سبھی ساز وہاں تھے۔ منان ساقی صاحب ستار سنبھالے پیچھے بیٹھے تھے۔ ریہرسل شروع ہوئی۔ گیت کے بول اٹھے۔

مستانی میں پیار کی دل ہے حضور کا
دیوانی دیدار کی' تو ہیرا کوہ نور کا

فل آرکسٹرا کے ساتھ پہلی دفعہ ریہرسل ہوئی۔ پھر دوسری ریہرسل کو ریکارڈ کر لیا گیا۔ جب ریکارڈ چیک کیا گیا تو پتہ چلا کہ مختلف ساز اوور لیپ کر گئے ہیں (یعنی گڈمڈ ہو گئے ہیں) چنانچہ سازندوں کی جگہوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ منان صاحب کو مائیک کے قریب لایا گیا۔ بینجو اور بانسری والے اور نزدیک بلائے گئے۔ مرکس' ماؤتھ آرگن اور گھڑا پیچھے بھیج دیئے گئے اور ریہرسل دوبارہ شروع ہوئی۔ سازینہ اب بھی درست نہ تھا۔ پھر پیکنگ کے دوران نقص مل گیا۔ منان ساقی صاحب باقی سازندوں کے ساتھ چلنا تو درکنار' انہیں بے تال کر رہے تھے۔ ممبران اکیڈیمی زیادہ تر ناتجربہ کار تھے۔ وہ مجھ سے مشورہ کرنے لگے۔ میں بھی اناڑی تھا۔ پھر بھی اتنا تو جانتا تھا کہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ چونکہ ستار بالکل مائیک پر چڑھی ہوئی تھی اس لئے میں نے ستار کو پیچھے لے جانے کا مشورہ دیا چنانچہ منان صاحب کو دور ایک کونے میں بھیج دیا گیا۔ ریہرسل ایک بار پھر شروع ہوئی تو میں نے جرات کر کے کہہ دیا کہ بہتر ہو گا ستار بند کروا دیں اور باقی آرکسٹرا کے ساتھ ریکارڈنگ مکمل کر لیں۔ لہٰذا ستار کے بغیر ریکارڈنگ کی گئی اور چیک کرنے کے بعد "او۔کے" قرار دے دی گئی۔

پیک اپ کے بعد منان صاحب مجھے طنزاً" کہنے لگے کہ ستار انہوں نے اس دفعہ بھی بجائی تھی۔ یہ باتیں سن کر ہارمونیم بجانے والے صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ستار کہاں ہے؟ میں نے ستار (جو منان ساقی صاحب بجا رہے تھے) کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تان پورہ ہے' ستار تو نہیں۔ منان صاحب کی قلعی کھل چکی تھی اور وہ بغیر نظریں ملائے

اکیڈیمی میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے آئے۔

ایک دن میرا پرانا لنگوٹیا مجید گنجا مجھے ملنے آیا۔ میں نے اسے منان ساقی صاحب کا ستار والا واقعہ سنایا اور بتایا کہ منان صاحب ناراض ہو گئے ہیں اور ادھر آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ تم کسی طرح انہیں منا کر لے آؤ۔ مجید گنجا کہنے لگا کہ پریشان نہ ہوں۔ وہ ناراض ہونے والی جنس نہیں۔ کہیں بیمار نہ ہو۔ تاہم اس نے وعدہ کیا کہ وہ منان صاحب کو کل شام تک زندہ یا مردہ پیش کر دے گا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں منان ساقی صاحب لنگڑاتے ہوئے ایک بازو پر پٹی باندھے میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ میں اور مجید گنجا اٹھ کھڑے ہوئے اور حیرت و پریشانی کے ملے جلے عالم میں پوچھنے لگے' یہ کیا؟ خیر تو ہے؟ اتنی دیر میں منان ساقی صاحب کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ کہنے لگے۔۔۔ "آپ کی بلا سے' کوئی مرے یا جیے"۔۔۔ ہم نے کہا آج ہمارا ارادہ آپ کا پتہ کرنے کا تھا۔ آخر اتنے روز کہاں غائب رہے۔ منان صاحب نے بتایا کہ سات روز ہوئے میں سڑک کے کنارے جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل والا مجھ سے آ ٹکرایا اور میں شدید دھچکا کھا کر ایک کھلے گٹر میں جا گرا اور بہت چوٹیں آئیں۔ وہ تو بھلا ہو راہگیروں کا جنہوں نے مجھے پہچان کر میرے گھر پہنچایا۔ آج چارپائی سے اٹھ کر سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔

اس روز منان صاحب نے چند ہلکی پھلکی باتیں ہی کرنے پر اکتفا کیا اور موسیقی اور ادب کے میدان میں اپنی وسیع معلومات اور مطالعے کا تذکرہ فرماتے رہے۔ اس دوران مجید گنجے نے دو چار عمدہ گیت سنانے کی فرمائش کر دی۔ وہ منت سماجت کے ساتھ ساتھ مکہ بازی بھی کرتا رہا۔ میں نے اسے منان صاحب کی حالت کے پیش نظر منع کیا مگر منان صاحب تو پوری طرح شیشے میں اتر آئے تھے۔ وہ بلا چون و چرا گانے لگے۔ مجید گنجا بے سرے انداز میں میز بجانے لگا۔ منان صاحب کو گرمی دلانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ جوش میں آ کر گاتے ہوئے اپنے تندرست ہاتھ سے میز کو بطور طبلہ استعمال کرنے لگے اور زخمی حالت میں

بھی دس بارہ غزلیں اور گیت سنا ڈالے۔

چند روز بعد منان صاحب ٹھیک ہو گئے۔ وہ میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ میرے پاس اس وقت خلیل صابری' اسماعیل قمر اور خواجہ الیاس بیٹھے تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ خلیل صابری اور قمر بیک زبان بول اٹھے۔۔۔ "منان صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہم تو پہلے ہی ان کے مداحین میں سے ہیں"۔۔۔ منان صاحب پھولے نہ سمائے۔ دایاں ہاتھ اوپر لے جا کر شاعروں کے انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دی اور سلام یعنی شکریہ ادا کیا۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں' پھر خواجہ الیاس نے کوئی چیز سنانے کی فرمائش کر دی۔ دوسرے لوگ شاید اسی موقع کے متلاشی تھے فوراً" ضرور ضرور کہہ کر تائید کرنے لگے۔ منان صاحب غالباً خود بھی اسی لمحہ کے منتظر تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے کاغذوں کا بنڈل نکالا۔ ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر کھولنے لگے اور کہا۔۔۔ "اپنی ایک تازہ غزل جو آج ہی مکمل کی ہے پیش کرتا ہوں۔"

غزل لاجواب تھی۔ وہ مسلمہ طور پر ہردلعزیز شاعر کی حیثیت سے اپنا نام اور مقام پیدا کر چکے تھے۔

میری یہ پرانی عادت ہے کہ رات سونے سے قبل کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ ضرور پڑھتا ہوں اور دو چار صفحات پڑھنے کے بعد سو جاتا ہوں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن میں جب پلنگ پر لیٹا تو میرے ہاتھ اسی ماہ کا رسالہ "زیب النساء" لگ گیا۔ کھولا تو ایک صفحہ میرے سامنے آ گیا جس پر ایک معروف شاعر کی غزل چھپی تھی۔ غزل پڑھتے ہی مجھ پر صدمے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ غزل کے اشعار بچھو بن کر ڈسنے لگے اور میرا سر چکرانے لگا۔ میں اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ اف میرے پروردگار' وہی غزل چھپی ہوئی میرے سامنے تھی جو منان ساقی صاحب مجھے ایک ہفتے سے بارہا سنا کر داد تحسین حاصل کر چکے تھے۔ یہ غزل لاہور کے ایک مشہور شاعر کے نام سے چھپی تھی۔ منان صاحب نے صرف مقطع میں

خالق غزل کا نام حذف کر کے اپنا نام لکھ لیا تھا۔ باقی غزل ہو بہو اور لفظ بہ لفظ نقل کر لی تھی جو اس وقت میرا منہ چڑا رہی تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ منان صاحب نے اس قدر واہیات جسارت کیوں کی ہے۔ جب صبح کے سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے میرے پلنگ پر پڑیں تو مجھے کمرے کی ہر چیز سے "چور شاعر' جھوٹا موسیقار" کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ میں بڑے بوجھل دل کے ساتھ تیار ہو کر دفتر گیا۔

اتنے میں مجید گنجا میرے دفتر میں داخل ہوا۔ میں نے اسے خوشخبری سنائی۔ میں نے "زیب النساء" کا رسالہ اس کو پکڑاتے ہوئے کہا' صفحہ نمبر سات ملاحظہ ہو۔ مجید گنجے نے صفحہ نمبر سات کھولا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔ اس کے کان سرخ اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑی حیرانی بلکہ سراسیمگی کی کیفیت میں گویا ہوا۔۔۔۔ "یہ غزل تو منان اپنی بتا کر پیش کرتا رہا ہے مگر اس صفحہ پر کسی اور کے نام سے چھپی ہے اور یہ رسالہ بھی اسی ماہ کا ہے..... سالا ہمیں سمجھتا کیا ہے۔ اس توہین کا بدلہ ضرور لینا چاہئے"۔۔۔۔ چنانچہ مجید گنجے نے اگلے روز عیدالفطر سے ایک رات قبل منان سمیت پندرہ بیس دوستوں کو اپنے گھر اکٹھا کرنے کا پروگرام بنایا۔

مجید گنجا میرا یار بڑا ذہین اور قابل اعتماد دوست ہے۔ مختلف اقسام کی سکیمیں بنانا اور انہیں احسن طریقے سے چلانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چنانچہ میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق کوئی بیس دوستوں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ سبھی دوست حاضر ہوئے۔ منان ساقی مجھے ایک طرف لے جا کر بتانے لگا کہ گذشتہ شب مجید گنجا اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہاں اس نے انہیں بڑا پر تکلف کھانا کھلایا اور خوب خدمت تواضع کی۔ کھانے کے بعد جلیبیاں اور رس ملائی وغیرہ بھی پیش کیں۔ جب وہ رات گئے گھر واپس لوٹ رہے تھے تو انہیں چکر آنے لگے اور ان کے قدم دو دو من کے ہو گئے۔ چلنا ناممکن ہو گیا اور انہیں مجبوراً راستے میں ایک پنواڑی کی دکان کے پھٹے پر لیٹنا پڑا۔ جلد ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو

گئے۔ کسی صاحب ذوق چور نے ان کی عینک' گھڑی اور جیب صاف کر دی۔ فجر کی نماز کے وقت گشتی پولیس کے ایک سپاہی نے انہیں ٹھوکر مار کر جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے اور گھر کی جانب چلنے لگے مگر چکرا کر گر پڑے۔ انہیں مشکوک سمجھتے ہوئے سپاہی تھانے لے گیا۔ جہاں سے کوئی چار گھنٹے بعد منت خوشامد کر کے گلو خلاصی کروائی۔

منان صاحب بڑے افسردہ لہجہ میں یہ قصہ سنا کر کہنے لگے کہ انہیں سو فیصد یقین ہے کہ مجید گنجے نے انہیں خوراک میں کوئی نشہ آور چیز کھلا دی تھی..... کھانا کھانے سے پیشتر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ میں نے انہیں دلاسا دیا اور کہا کہ اس معاملے میں گنجے سے باز پرس ضرور کروں گا۔ آج تو خوشی کی رات ہے' اس لئے آپ اپنا موڈ درست رکھیں۔ میری اس یقین دہانی کے بعد وہ نارمل ہو گئے اور محفل میں آ کر اپنی نشست سنبھال لی۔

پہلے اکرم بٹ کو ایک گانا سنانے کے لئے کہا گیا۔ منان صاحب نے گھڑا اور اسحاق مغل نے ہارمونیم بجانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اکرم بٹ نے ایک مشہور فلمی گانا سنایا جو پسند کیا گیا۔ پھر مولوی ابراہیم نے دو چالیس سالہ پرانے فلمی گیت سنائے۔ اس کے بعد مجید گنجے نے ایک دوست کو درباری راگ سنانے کی فرمائش کر دی۔ منان صاحب نے فوراً ٹوکا کہ اس وقت پہاڑی کا ٹائم ہے' درباری راگ کا نہیں۔ مجید گنجے نے تو جان بوجھ کر ایسا کیا تھا کیونکہ وہ منان ساقی کی فطرت سے واقف تھا جو اپنے آپ کو مہان موسیقار اور استاد گائیک خیال کرتے تھے۔ وہ کس طرح برداشت کر لیتے کہ کوئی دوسرا فرد فن کلاسیکی موسیقی کا مظاہرہ کرے۔

منان ساقی کو توقع تھی کہ انہیں بھی کوئی چیز سنانے کے لئے کہا جائے گا مگر سبھی لوگ عمداً خاموش رہے۔ آخر منان صاحب سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے خود ہی گنگنانا شروع کر دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد کہا کہ میں آپ کو شد بھیرویں میں ایک چیز سناتا ہوں۔ انہوں نے عبدالحمید عدم کی مشہور زمانہ غزل۔۔۔۔ "ساقی شراب لا کہ طبیعت اداس ہے" سنائی۔ پھر دوسری معروف غزل۔۔۔۔ "جہاں فقیروں کو گھیر لیتی ہے ناگہاں گردش زمانہ"

____ پیش کی- پھر تو بحر کھل گیا- ایک کے بعد دوسری غزل سناتے چلے گئے اور دوست و احباب پروگرام کے مطابق "واہ واہ" "خوب" "جیو" "شاباش" اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر داد دیتے رہے-

خلیل صابری نے منان کو کوئی اپنی تازہ غزل پیش کرنے کی درخواست کر دی تو منان ساقی نے وہی غزل چھیڑ دی جو وہ پچھلے ہفتے سے سنا رہے تھے- اب حاضرین محفل نے جو والہانہ داد دی' وہ پورا محلہ اب تک یاد کرتا ہو گا- اس قدر شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر ایک دوست ان حالات میں بھی بالکل خاموش بیٹھا تھا- وہ مجید گنجے کا مہمان بشیر تمنا تھا- جب منان نے غزل ختم کی تو مجید گنجے نے بشیر تمنا سے پوچھا- "کیوں یار! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا- تم داد دینے میں بخیل کیوں ہو گئے ہو؟ کیا غزل پسند نہیں آئی؟"

____ بشیر تمنا نے کہا کہ یہ غزل تو کسی اور شاعر کی ہے- میں حیران ہوں کہ منان صاحب نے اسے اپنی غزل بنا کر پیش کیا ہے-

تمام دوستوں نے کورس میں بشیر تمنا کی تردید کی اور کہا کہ ہو سکتا ہے کہیں تمہیں دھوکہ ہو گیا ہو یا شعروں میں مشابہت ہو- منان صاحب جھوٹ تھوڑا ہی بولتے ہیں- مجید گنجے نے منان ساقی سے پوچھا- منان صاحب نے بڑے وثوق اور اعتماد سے کہا کہ یہ ان کی "اپنی لکھی ہوئی" ہے- اگر کوئی اسے جھٹلائے تو میں جو جرمانہ آپ کہیں گے' ادا کروں گا- اس پر بشیر تمنا اٹھ کھڑے ہوئے اور ثبوت پیش کرنے کے لئے آدھے گھنٹے کی مہلت مانگی- سب نے اتفاق کیا اور میں نے محفل آدھے گھنٹے کے لئے برخاست کر دی- بشیر تمنا باہر چلے گئے- اس دوران منان صاحب بڑے پرسکون بیٹھے رہے- ان کے چہرے پہ "عادی چور" کی طرح کوئی قابل ذکر ردعمل نہ تھا بلکہ دوسرے لوگوں کو یقین دلاتے رہے کہ یہ غزل انہوں نے "خود لکھی" ہے- کوئی مائی کا لال اسے سرقہ ثابت نہیں کر سکتا- ہمیں چونکہ حقیقت حال کا علم تھا اس لئے مطمئن بیٹھے تھے-

پچیس منٹ ہی گزرے تھے کہ بشیر تمنا سر جھکائے آ گئے اور محفل پانچ منٹ بعد دوبارہ

جم گئی- میں نے بشیر تمنا سے ثبوت پیش کرنے کو کہا- انہوں نے بتایا کہ وہ جس آدمی سے ثبوت لینے گئے تھے- وہ بے چارہ ٹائیفائڈ بخار میں پڑا ہے- منان صاحب کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی- پھر بشیر تمنا نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا---- "لیکن آپ خاطر جمع رکھیں- میں ثبوت لے آیا ہوں"____ اور ساتھ ہی "زیب النساء" کا اسی ماہ کا شمارہ مجھے دیتے ہوئے کہا---- "ذرا اس کا صفحہ نمبر سات ملاحظہ فرمائیں-"

میں نے صفحہ نمبر سات کھولا اور وہی غزل جو ابھی ابھی منان ساقی صاحب نے گائی تھی' حاضرین کے سامنے پیش کر دی- پھر منان صاحب کو دکھائی تو انہوں نے خفت سے لبریز انداز میں کہا---- "لیکن جھوٹ میں نے بھی نہیں بولا تھا- اس کاغذ پر میں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی تھی"____ اس پر بہ آواز بلند لعنت' پھٹکار' شرم کرو' بے غیرت' چور کہیں کے' دغا باز' اور خدا جانے کس قدر القابات سے نوازا گیا- پھر حاضرین محفل نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ استغفار کا ورد کیا-

اگلے روز عیدالفطر تھی- منان صاحب مجھے عید ملنے آئے تو شکوہ کرنے لگے کہ رات دوستوں نے ان کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے- منان صاحب نے اپنا یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ مجید گنجے سے قطع تعلق کر لیں گے کیونکہ ان کے خیال میں ساری شرارت کا محور وہی تھا-

اسی شام مجید گنجا آیا- گذشتہ رات کی کارکردگی پر وہ بے حد خوش تھا- میں نے اس سے پوچھا کہ پرسوں رات تم نے منان ساقی کو کھانا کھلایا تھا؟ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور بتانے لگا کہ اس نے منان کو کھانے میں بھنگ کھلائی تھی اور بعد میں میٹھا کھلایا تاکہ بھنگ اپنا اثر اچھی طرح سے دکھا دے-

منان صاحب نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ تمہاری ایک دو فلمی میوزک ڈائریکٹروں سے دوستی ہے- مجھے ان کے پاس لے چلو' میں فلموں میں بیک گراؤنڈ گانے دینا چاہتا ہوں- میں نے ان کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی- چند روز بعد انہیں رشید عطرے مرحوم کے پاس لے گیا- عطرے مرحوم بڑے خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے- بڑی شفقت سے پیش

آئے- میں نے منان صاحب کی طرف اشارہ کر کے انہیں بتایا کہ ہمارے یہ بزرگ گانے کا بہت شوق کرتے ہیں اور فلموں میں بیک گراؤنڈ گانے دینا چاہتے ہیں- عطرے مرحوم نے منان صاحب سے کوئی چیز سنانے کی فرمائش کی- منان نے عبدالحمید عدم کی ایک غزل سنائی اور استادی رنگ دکھانے لگے- عطرے مرحوم داد دیتے رہے- پھر ایک گیت بھی منان ساقی نے سنایا- عطرے مرحوم آنکھیں بند کر کے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے رہے- جب گانا ختم ہوا تو مرحوم میرے کان میں کہنے لگے---- "یہ الو باٹا کہاں سے پکڑ لائے ہو؟ اسے نجی محفلوں کا ایندھن ہی بننے دیں- ہمارے کام کا نہیں-"

منان صاحب کی بیگم کئی روز سے بیمار تھی- وہ منان ساقی صاحب سے کہتی رہی کہ گجرات کے حکیم سوہنے شاہ سے اسے دوا لا دیں مگر منان صاحب اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وقت نہ نکال سکے- آخر ایک روز بیگم کی حالت زیادہ خراب دیکھی تو فوراً" گجرات جانے کا قصد کر لیا- بس میں بیٹھے اور گجرات پہنچ گئے- وہاں اپنے عزیزوں کی فیکٹری کے سامنے بس رکوا کر اتر گئے اور فیکٹری کی عمارت کے اندر جانے لگے تو ایک کار فیکٹری سے باہر نکلتی نظر آئی جو ان کے قریب آ کر رک گئی- پچھلا دروازہ کھلا اور منان ساقی کو بٹھا کر کار چل دی- کار میں دو نوجوان سوار تھے- انہوں نے منان سے پوچھا---- "کب تشریف لائے؟"____ انہوں نے بتایا کہ ابھی چند سیکنڈ پہلے یہاں بس سے اترا ہوں- پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صاحب بولے---- "کیسے آئے؟"____ "تمہاری چاچی کی دوا لینے آیا ہوں"____ منان نے جواب دیا---- "وہ کئی روز سے بیمار ہے"____ پھر دوسرے صاحب بولے---- "ہمیں تھوڑا سا کام ہے- اکٹھے ہو کے ابھی جاتے ہیں اور حکیم صاحب سے جا کر دوا لے آئیں گے-"

سڑک پر چڑھ کر انہوں نے گاڑی کا رخ گوجرانوالہ کی طرف کر دیا- کار چلتی رہی اور انہوں نے منان صاحب کو باتوں میں لگائے رکھا- جب گاڑی گکھڑ کو پیچھے چھوڑ رہی تھی تو منان صاحب نے بڑی پریشانی کے عالم میں پوچھا' آپ جا کہاں رہے ہیں؟ ڈرائیور نے

بتایا- گوجرانوالہ میں ایک صاحب کو ملنا ہے- منان صاحب یہ سن کر سٹپٹا اٹھے اور بولے---- "بیڑا غرق یہ تم لوگوں نے کیا ظلم کیا ہے- میں تمہاری چاچی کو کیا جواب دوں گا؟"____ انہوں نے تسلی دی اور کہا' گھبراؤ نہیں' تم اپنے گھر دس منٹ انتظار کرو- ہم واپسی پر تمہیں ساتھ لے جائیں گے- پھر وہ منان صاحب کو گھر اتار کر واپس گجرات چلے گئے اور منان ساری رات ان کا انتظار کرتا رہا- بیگم سے گالیاں الگ کھائیں- اگلی صبح گجرات گئے اور حکیم سے دوا لے کر اپنے بھتیجوں سے ملے بغیر لوٹ آئے-

ایک شام حسب معمول کچھ دوست بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے کہ منان صاحب نے ایک عمدہ مشاعرہ کروانے کی تجویز پیش کی- بشیر تمنا کہنے لگے کہ مشاعرہ کروانا ہے تو طرحی مشاعرہ ہو- طرح مصرع اسی روز دیا جائے جس روز مشاعرہ ہونا ہے- تمام دوستوں کو ایک گھنٹے کی مہلت دی جائے- اس دوران جس قدر شعر کوئی شاعر لکھ لے گا' اس کے مطابق انعامات تقسیم کئے جائیں گے- اس طرح سبھی شاعروں کی اوقات معلوم ہو جائے گی- سب دوستوں نے اس مشورے سے اتفاق کیا- چنانچہ میں نے اعلان کر دیا کہ مشاعرہ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل ہمارے بزرگ دوست جناب ماسٹر علی بخش گنگولی طرح مصرع کا انکشاف فرمائیں گے- ایک ہفتہ بعد آئندہ جمعرات کو شام سات بجے اکٹھے ہونے کا پروگرام بنا-

منان صاحب اگلے ہی روز بعد دوپہر میرے دفتر میں آئے اور بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھنے لگے- کیا یہ ممکن ہو گا کہ طرح مصرع کا انہیں پہلے پتہ چل جائے؟ وہ چاہتے تھے کہ اول انعام ہر حالت میں حاصل کیا جائے- میں نے انہیں بتایا کہ یہ تو کوئی مشکل بات نہیں- ماسٹر علی بخش گنگولی کو جو طرح مصرع دیں گے وہ اعلان کر دیں گے مگر یہ صریحاً" بے ایمانی ہو گی- انہوں نے کہا' کیا بات کرتے ہیں' ہم کسی کو پتہ تھوڑے ہی لگنے دیں گے- پھر میری خوشامد کرنے لگے- میں ان کے اس رویے اور طریقہ واردات سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا- دراصل یہ سارا شغل اور تفریح کا ہی پروگرام تھا- میں نے منان سے کہہ دیا کہ آپ مجھے کوئی طرح مصرع بتا دیں- وہی ماسٹر علی بخش گنگولی سے اعلان کروا دوں گا-

دوسرے روز منان صاحب آئے اور اپنی جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر تین طرح مصرعے مجھے دکھائے جو میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ وہ انہوں نے خود ہی ترتیب دیئے تھے کیونکہ انتہائی لغو' بے ربط اور بے معنی تھے۔ میں نے تینوں رد کر دیئے اور اپنے ذہن پر بوجھ ڈال کر ایک طرح مصرع تجویز کیا۔ یہ منان صاحب کو بھی پسند آ گیا۔ میں نے منان صاحب کو اس طرح مصرع پر غزل مکمل کرنے کی ترغیب دی۔ منگل کے دن منان صاحب پھر ملے۔ میں نے دریافت کیا' کتنے شعر مکمل کئے ہیں؟ ان کا جواب مایوس کن تھا۔ وہ ابھی تک ایک مصرع تک نہیں لکھ پائے تھے۔ ادھر میں نے انہیں خوشخبری سنائی کہ میں نے تو اول انعام میں دیئے جانے والے کپ پر ان کا نام بھی کندہ کروا دیا ہے اور آپ ہیں کہ ابھی تک ابتدائی تیاریوں میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ منان صاحب نے بڑے خوشامدانہ لہجے میں مجھے کہا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ غزل آپ لکھ دیں۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ کسی اور کو پتہ بھی نہ چلے گا اور کپ بھی اپنے پاس رہ جائے گا۔ میں اگرچہ شاعر نہیں تھا پھر بھی حامی بھر لی اور منان سے کہا کہ وہ کل شام تک مجھ سے مکمل غزل لے جائے۔

اسی شام میں نے اپنے چند ادبی دوستوں ڈاکٹر محمد اصغر' بشیر تمنا' مجید گوہر' اسحاق مغل اور ماسٹر علی بخش گنگولی کو اکٹھا کیا اور انہیں اپنی سکیم بتا کر غزل تیار کرنے کی اپیل کی۔ چنانچہ پورے جوش و خروش کے ساتھ کوئی دو تین گھنٹے لگا کر وہ غزل تیار کر لی گئی جو منان صاحب نے مشاعرہ میں پڑھنی تھی۔ صبح سویرے وہ تاریخی غزل منان کے حوالے کر دی گئی۔

ہم نے ایک ایلومینیم کا اگالدان حاصل کیا۔ اس پر ڈھکنا اور دونوں اطراف کنڈے لگوائے۔ مولوی ابراہیم کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اس اگالدان پر جو ہم بطور کپ اول انعام منان صاحب کو دے رہے تھے۔ مندرجہ ذیل عبارت کندہ کرا دیں:

اول انعام جو ضلعی طرحی مشاعرہ منعقدہ

مورخہ 21_ مارچ 1970ء میں جناب اے منان ساقی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

منجانب:_ ادبی محفل گوجرانوالہ۔

شام کو کپ تیار ہو کر آ گیا اور ہم نے اسے باریک چمکدار رنگین کاغذ میں لپیٹ کر گوٹہ کناری سے اچھی طرح سجا کر رکھ لیا۔ وقت مقررہ پر سارے دوست پہنچ گئے۔ جناب مجید گوہر' جناب بشیر تمنا' جناب ڈاکٹر محمد اصغر' جناب محمد خلیل صابری' جناب اسحاق مغل' جناب اے منان ساقی اور جناب علامہ محمد نواز بٹ صاحب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے جو کمرہ امتحان کی طرز پر رکھی گئی تھیں۔ کاغذ اور قلمیں سامنے میزوں پر مہیا کر دی گئی تھیں۔ اتنے میں جناب ماسٹر علی بخش گنگولی کو پکارا گیا اور انہوں نے وہی طے شدہ طرح مصرع دے دیا جو تمام دوستوں نے نوٹ کر لیا۔ مجید گنجا خود بخود مصنف کے فرائض انجام دینے لگا اور دھیان رکھنے لگا کہ کوئی نقل وغیرہ نہ کرے۔ اس طرح ایک گھنٹہ بڑے صبر آزما حالات میں گزرا۔ وقت پورا ہونے پر تمام امتحانی پرچے اکٹھے کر لئے گئے اور تین ججوں کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ پھر تمام شعراء کو باری باری اپنی غزلیں جس قدر بھی وہ وقت مقررہ میں لکھ سکے تھے پیش کرنے کو کہا گیا۔ اس طرح سامعین کو جن کی تعداد ایک سو سے اوپر تھی' سنائی گئیں۔ حاضرین کی داد سے صاف پتہ چلتا تھا کہ منان صاحب کی غزل سب سے عمدہ ہے۔

پھر تین ججوں کا متفقہ فیصلہ حاضرین محفل کو سنایا گیا۔ منان صاحب کو اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ اعلان سنتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ منان صاحب کو سٹیج پر بلایا گیا۔ مہمان خصوصی نے انہیں ایک بڑا طلائی ہار پہنایا۔ پھر اپنے دست مبارک سے اگالدان نما کپ پیش کیا۔ ہر طرف سے مبارک باد' مرحبا' شاباش' جیو اور آفرین کے نعرے بلند ہونے لگے۔ منان صاحب ایک قومی ہیرو اور فاتح جرنیل کی حیثیت سے اپنے محبوب پروانوں کو جھک جھک کر سلام کرتے رہے۔

پھر مٹھائی تقسیم کی گئی اور محفل برخاست ہو گئی۔ اس رات منان صاحب کا چہرہ خوشی و انبساط سے دمک رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں اگالدان نما کپ پکڑے طلائی ہار پہنے گھر چلے گئے

اس طرح مشاعرہ کی کامیابی نے منان صاحب کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو مافوق الفطرت مخلوق سمجھنے لگے۔ غرور اور ہنکار نے بد مزاج بنا دیا۔ وہ اپنے آپ کو پہلے سے

بہت بڑا آرٹسٹ سمجھتے تھے' اب دوسرے لوگوں کو اپنے سے کہیں کمتر اور ہیچ خیال کرنے لگے۔ ایک دن میرے ہاں بھری محفل میں معمولی سی بات پر انہوں نے ہمارے ایک پرانے ساتھی احمد سعید کی بے عزتی کر دی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بے چارہ مالی طور پر کمزور تھا۔ میں نے منان ساقی سے اس بیہودگی اور گستاخی کی معافی مانگنے کو کہا تو وہ بپھر اٹھا اور بڑی رعونیت سے کہنے لگا---- "کیا میں معافی مانگوں اس کنگلے سے؟ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا"____ اس کے جواب میں میں نے کہا---- "اگر آپ نے آج شام تک احمد سعید سے غیر مشروط معافی نہ مانگی تو کل سے اس گھر کے دروازے آپ کے لئے ہمیشہ کے واسطے بند ہو جائیں گے۔"

منان بڑے غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا اور پھر اس کے بعد ہمارے راستے ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئے۔

○ ○ ○

مصنف آپ کا نام اختر 20 جنوری 1933ء کو آکسفورڈ شہر میں پیدا ہوئے۔ 1940ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ پھر والدہ نے ان کی پرورش کی۔ 1951ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور 1955ء تک لاہور انگلش کالج میں پڑھاتے رہے۔ 1955ء میں پاکستان آئے۔ یہاں انہوں نے فیڈرل لا کالج (Federal Law College) کراچی میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1956ء تک یہاں پڑھاتے رہے۔

1934-35ء میں وہ ایلیمنٹری کالج پاکستان کے ڈائریکٹر آف کالجز رہے اور 1939ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران وہ تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ 1940ء میں انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد نوجوانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر سکھانا تھا۔ 1941ء سے 1944ء تک انہوں نے کراچی میں ایک کالج میں پڑھایا۔ 1945ء میں انہوں نے کراچی میں ایک کالج قائم کیا جس کا مقصد نوجوانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر سکھانا تھا۔ 1946ء میں انہوں نے کراچی میں ایک کالج قائم کیا جس کا مقصد نوجوانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر سکھانا تھا۔ 1947ء میں انہوں نے کراچی میں ایک کالج قائم کیا جس کا مقصد نوجوانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر سکھانا تھا۔